سنگ میل کی ادبی خدمات

مقالہ برائے ایم فِل اردو

مقالہ نگار:

منور مقبول عثمانی

رول نمبر ۷۹۴۳۰۵۶

نگران مقالہ:

پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال

ڈین فیکلٹی آف آرٹس

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد۔ پاکستان

۲۰۰۸ء

سنگ میل کی ادبی خدمات

مقالہ نگار:

منور مقبول عثمانی

رول نمبر ۷۹۴۳۰۵۶

یہ مقالہ رجسٹریشن نمبر 0298۔پی بی آر۔91 کے تحت شعبہ اردو فیکلٹی آف سوشل سائنسز و ادبیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد میں ایم فل کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے جمع کرایا گیا۔

جولائی ۲۰۰۸ء

(مقالہ لکھنے کی اجازت مراسلہ نمبر F. N0. 6-1/2004-AR(AC-I بتاریخ 02.12.2004 کے تحت دی گئی تھی)

تصدیق نامہ

اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے ایم۔فِل شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے طالب علم منور مقبول عثمانی رول نمبر 7943056، رجسٹریشن نمبر 0298۔ پی بی آر۔ 91 کے تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''سنگِ میل کی ادبی خدمات'' کا مطالعہ دقتِ نظر سے کیا ہے۔ میں طالب علم کے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں اور اِس امر کی سفارش کرتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ ان کا یہ مقالہ ایم۔فِل (اُردو) کی ڈگری کی جانچ کے لئے جمع کروا دیا جائے۔

ڈاکٹر نجیب جمال

پروفیسر، شعبۂ اُردو و اقبالیات/

ڈین فیکلٹی آف آرٹس،

دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

دیباچہ

کسی اشاعتی ادارے کی ادبی خدمات اس کی ادبی مطبوعات ہیں۔(جو اس نے مصنفین سے مسودات لے کر شائع کیں یا مصنفین سے بہ فرمائش لکھوا کر طبع کیں)اچھی مطبوعات کا اندرون: جہانِ معنی اور بیرون: طباعتی حسن و سلیقے سے عبارت ہوتا ہے؛مطبوعات مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہیں اور قارئین کے شوق مطالعہ سے جواز اور مقبولیت حاصل کرتی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ اشاعتی ادارے کی کارکردگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس مثلث کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(الف) ناشر کی مطبوعات کا معیار، اندراجات اور اشاعت ادب میں حصہ، (ب) مصنفین سے ناشر کا تعلق اور رابطہ (ج) قارئین کی اہمیت کا احساس اور سہولت کا خیال۔

اشاعتی ادارے عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں: سرکاری/ نیم سرکاری، مشنری/ فلاحی/تعلیمی اور نجی کاروباری ادارے۔کسی قوم کی فکری اور تمدنی زندگی میں تینوں قسم کے ادارے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں عموماً سرکاری/ نیم سرکاری اور تعلیمی/ مذہبی/ فلاحی اشاعتی اداروں کو تو قابل ستائش اور لائق تحقیق سمجھا جاتا ہے اور ان اداروں کے آغاز و ارتقا، اشاعتی رجحانات اور توضیحی کتابیات کو بہ اہتمام مرتب و مدون کیا جاتا ہے لیکن کسی نجی اشاعتی ادارے کی علمی و ادبی مطبوعات اور اشاعتی رجحانات کے جائزے نیز توضیحی کتابیات کی تدوین کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں نجی اشاعتی اداروں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آتی ہے جنھوں نے علمی و ادبی اشاعتوں سے پورے برصغیر کو ذہنی اور تہذیبی طور پر متاثر کیا لیکن ان کے احوال و آثار کو اپنی ترتیب، حفاظت اور نمودِ نو کے لیے تحقیق و تجزیہ و تحریر کا کوئی گوشہ علمی و ادبی دنیا میں میسر نہ آ سکا۔(سید امیر حسن نورانی کی مرتبہ ''سوانح منشی نول کشور'' ایک استثنائی مثال ہے اور وہ کتاب بھی ہندوستان میں مرتب و طبع ہوئی اور مفصل ہونے کے باوجود کئی حوالوں سے ادھوری ہے۔)

اس بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی اعلیٰ اشاعتی ادارہ ختم ہوا تو اس کی قیمتی مطبوعات بتدریج نایاب ہوتی چلی گئیں اور وقت نے اس کی ارتقائی تاریخ اور اشاعتی کارگزاری پر دبیز گرد جمانے کا سلسلہ بڑی ''دریا دلی'' سے شروع کر دیا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی قدیم ادارے کی فہرست کتب تو بڑے تردد کے بعد ہاتھ آئی لیکن فہرست میں درج کتاب کے عنوان سے یہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ کتاب افسانوں کا مجموعہ ہے یا تنقیدی مضامین کا!

طرفہ تماشا یہ کسی نجی اشاعتی ادارے کی مطبوعات کی مکمل توضیحی فہرست نہ تو اس نے خود مرتب اور شائع کرائی اور نہ ہی بعد میں تحقیق کاروں نے اس جانب توجہ دی؛ فی الحال یہ تناظر قائم ہے۔

کسی اشاعتی ادارے کے مکمل ومبسوط مطبوعاتی جائزے سے ایک ہی مقام/ مقالے/ تالیف میں ڈھیروں کتابوں کے بارے میں اہم نکات اور لائق ضرورت معلومات یک جا ہو جاتی ہیں، اشاعتی رجحانات کی وضاحت ہو جاتی ہے، نیز بدلتے ادبی میلانات اور قارئین کے مطالعاتی رجحانات بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔

زیرِنظر مطالعہ ایک اسی نوعیت کی کوشش ہے جس میں پاکستان میں ادب کے مطالعہ واشاعت کے رجحانات ومسائل کے تناظر میں معروف اشاعتی ادارے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کو اس کی اردو ادبی مطبوعات کے حوالے سے موضوع بنایا گیا ہے۔

سنگ میل نے اپنا اشاعتی سفر ۱۹۶۲ء میں شروع کیا؛ پہلے آہستہ روی اور پھر تیز رفتاری سے اس کی ادبی مطبوعات سامنے آتی چلی گئیں؛ اور اب ''اردو دنیا'' میں کوئی علمی وادبی حلقہ، طبقہ اور کتب خانہ ایسا نہیں ہے جو سنگ میل کی ادبی مطبوعات سے واقف نہ ہونے کا ''دعویٰ'' کر سکے۔

سنگ میل نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں علمی، ادبی، تاریخی، دینی، قانونی، تکنیکی اور تفریحی کتب شائع کی ہیں۔لیکن زیرِنظر مطالعہ ۱۹۶۲ء تا ۲۰۰۲ء کی صرف اردو ادبی اشاعتوں کے حوالے سے ہے۔اس چالیس سالہ دور میں سنگ میل کی اشاعت اردو ادب کے لیے ترجیحات، ادارے کا آغاز وارتقا، کتاب کا صوری ومعنوی معیار اور (ان کے) موضوع ومزاج واندراج کا تعارف، مصنفین سے روابط اور قارئین سے تعلق خاطر کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے؛ نیز مطبوعات کے آئینے میں چار دہائیوں کے معاصر ادبی رجحانات اور قارئین کے مطالعاتی میلانات بھی دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں سنگ میل کی مطبوعات کے موضوع ومزاج واندراج کی وضاحت کے لیے تمام تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کتب کی توضیحی کتابیات/ وضاحتی فہرست/ تعارفی شذرہ مرتب ومدون کیا گیا ہے۔توضیحی کتابیات/ وضاحتی فہرست میں ہر کتاب کے بارے میں درج ذیل باتیں (بہ اختصار) تحریر کی گئی ہیں:

مصنف کا نام، کتاب کا عنوان (ذیلی عنوانات)، صفحات، سن اشاعت، صنف ادب، اندراجات، فکری وفنی خوبی، مقبولیت، ادبی مرتبہ، کتاب کے دیباچے/ پیش لفظ/ تقریظ/ مقدمے میں پیش کیا گیا بنیادی نکتہ۔

کتاب کی قیمت اور سائز وغیرہ توضیحی فہرست میں درج نہیں کیے گئے (ہر کتاب کے مختلف ایڈیشنوں کی قیمتوں اور سائز میں فرق ہے) کتب کی قیمتوں کی مجموعی صورتحال کا تفصیلی جائزہ باب اول میں لیا گیا ہے۔

(واضح رہے کہ کتاب کا توضیحی شذرہ ایک مکمل تبصرہ ہوتا ہے، نہ مختصر تنقیدی مضمون)

توضیحی کتابیات/ وضاحتی فہرست میں تفصیل کے بجائے اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔فقط زیرِنظر کتاب کے کوائف اور ادبی نوعیت وحیثیت کو شذرے یا ''تبصرے'' میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔کسی مصنف کی زیرِ تذکرہ تصنیف کے علاوہ دیگر علمی وادبی خدمات کا

ذکر عموماً نہیں کیا گیا ہے؛ مصنفین کے لیے ''شہرہ آفاق'' اور ''نابغہ روزگار'' ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے کیونکہ توضیحی فہرست میں فقط کتاب کے مزاج اور اندراجات کی جھلک پیش کرنے کے علاوہ کسی اور تذکرہ وتفصیل وتوصیف کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

سنگ میل پبلی کیشنز کی سیکڑوں اردو ادبی مطبوعات ہیں؛ توضیحی فہرست میں فقط ادبی طور پر تسلیم شدہ تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کتب کو ہی شامل کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ تمام کتب کی شمولیت سے فہرست طویل تر اور مقالے کی ضخامت دوگنا ہو جاتی؛ دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض ''پاپولر ادب'' کی حامل کتب کے ادب ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں تنقیدی مباحث وقت گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر موجود و برقرار ہیں؛ لہٰذا اس تنازع سے بچنے کے لیے صرف ادبی طور پر تسلیم شدہ کتب ہی قابل توضیح قرار پائی ہیں (اور پاپولر فکشن، طنز و مزاح اور شاعری کی کتابیں شامل فہرست نہیں ہیں)

توضیحی فہرست میں درج ذیل شعبوں سے متعلق کتب بھی شامل نہیں ہیں:

اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی صحافت، فلسفے اور نفسیات سے متعلق کتب، اخباری کالموں کے مجموعے، بچوں کا ادب، نصابی کتب، ادبی شخصیات کے انٹرویوز کے مجموعے، لغات، دیگر تکنیکی کتب۔

(اور اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ زیر نظر مطالعے کو اردو کی خالص تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی مطبوعات کے جائزے اور اسی حوالے سے سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری تک محدود رکھنا مقصود تھا۔)

توضیحی کتابیات میں کچھ کتابوں کی توضیح مختصر اور کچھ کی مفصل ہے۔ کسی بھی توضیحی فہرست میں کچھ کتابوں کو تفصیلی تعارف اور وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً بانگ درا، کلیات اقبال وغیرہ۔ کچھ کتابوں کے مقبول عام ہونے کے باوجود ان کے اندراجات کا ذکر قدرے تفصیلی کرنا پڑتا ہے۔ (خصوصاً فکشن اور کثیر الموضوعی (مختلف مضامین پر مشتمل) تنقیدی کتب کے باب میں) ہمارے یہاں تحقیق و تنقید کے شعبے میں یک موضوعی کتب کم اور کثیر الموضوعی زیادہ شائع ہوتی ہیں اور ان کتابوں کے سرورق (اور اندرون سرورق) پر درج ایک لفظی (یا دولفظی) عنوان سے واضح نہیں ہوتا کہ کتاب کا اندرونی جہان کتنے موضوعاتی اور معنویاتی امکانات کا حامل ہے؛ لہٰذا توضیحی کتابیات میں کثیر الموضوعی کتب کے تمام موضوعات اور اندراجات کو تفصیل سے پیش کیا گیا۔ توضیحی کتابیات میں کسی کتاب کے کل صفحات درج کرتے ہوئے کتاب کی اختتامی عبارت والے صفحے کو آخری تسلیم کیا گیا ہے۔ (بعض اوقات عبارت کے حامل آخری صفحے کے بعد بھی خالی یا اشتہارات وغیرہ کے صفحے ہوتے ہیں، ظاہر ہے انہیں اصل کتاب کی ضخامت کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا۔)

توضیحی فہرستوں پر مشتمل ابواب کے آخر میں حوالہ جات درج نہیں کیے گئے ہیں اور یہ توضیحی کتابیات کے رواج کے مطابق ہے۔ چند مثالیں: ۱۔ گوپی چند نارنگ اور مظفر حنفی کی مرتب کردہ ''وضاحتی کتابیات'' جلد اول ۱۹۷۶، جلد دوم ۱۹۷۷، ۱۹۷۸، ناشر: ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۲۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کی ''دکنی اور دکنیات'' (وضاحتی کتابیات) ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۳۔ محمد اشرف کمال کی ''انجمن ترقی

اردو، کراچی کی مطبوعات، توضیحی کتابیات'' ناشر انجمن ترقی اردو کراچی، (موخر الذکر ایم۔فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے مقالے کا کتابی روپ ہے)۔ دراصل توضیحی کتابیات میں زیرِ نظر کتاب کا ہر طرح سے مکمل ''حوالہ'' مع تعارف و تجزیہ موجود ہوتا ہے لہٰذا باب کے آخر میں دوبارہ انہی کتابوں کے حوالوں کو ''حوالہ جات'' کے عنوان سے یک جا کرنا ضخامت کو بے سبب بڑھانے کا عمل ہے۔ (اس سلسلے میں زیرِ نظر مقالے کے پہلے نگران جناب ڈاکٹر نثار احمد قریشی مرحوم اور دوسرے نگران جناب ڈاکٹر نجیب جمال کی رائے بھی یہی تھی)۔

توضیحی کتابیات کا دوسرا عمومی رواج یہ ہے کہ وضاحتی فہرست کو مصنف یا تصنیف کے حوالے سے بہ اعتبار حروف تہجی مرتب کیا جاتا ہے (عموماً مصنف کے حوالے سے) اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی مصنف کی کتب ایک ہی جگہ پر (یک جا صورت میں) زیر بحث آ جاتی ہیں۔ سو زیرِ نظر مقالے میں بھی مصنف کے حوالے سے بہ اعتبار حروف تہجی، توضیحی فہرستوں کے ابواب مدوّن کیے گئے ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ ہر نجی اشاعتی ادارہ اپنی مالی منفعت کے لیے طباعت کتب کی راہ اختیار کرتا ہے لہٰذا ایسے ادارے کی اشاعتی کارکردگی اور مطبوعات کا معیار دیکھتے ہوئے اس کی مالی مجبوریوں اور تجارتی ترجیحات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ قابل جائزہ بات یہ ہونی چاہیے کہ تجارتی ادارے نے اپنی مالی منفعت کے ساتھ ساتھ علم و ادب اور مصنف و قاری کے لیے کیا ''خدمت'' انجام دی؟ تجارتی اخلاقیات کو کس حد تک قائم رکھا؟ اس کی مطبوعات نے تہذیبی زندگی کو کس طور متاثر کیا؟ اور آئندہ کی اشاعتی و ادبی تاریخ اِسے ''کامیاب کاروباری ادارہ'' قرار دینے کے علاوہ ترویج علم اور اشاعت ادب میں بھی حصہ دار سمجھے گی یا نہیں؟۔

اس معیار کو مدنظر رکھ کر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور کی اردو ادب کے حوالے سے اشاعتی کارکردگی اور ادبی مطبوعات کے معیار و مواد کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ مطالعہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے: پہلا باب پاکستان میں اردو ادب کے مطالعہ و اشاعت کے رجحانات و مسائل کے تجزیے پر مشتمل ہے، دوسرے باب میں سنگ میل پبلی کیشنز کے قیام و ارتقا اور اشاعت اردو ادب کے چالیس سالوں کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے، تیسرے باب میں سنگ میل کی تحقیقی و تنقیدی مطبوعات اور چوتھے باب میں تخلیقی مطبوعات کی توضیحی کتابیات پیش کی گئی ہے، پانچواں باب حاصل مطالعہ کے لیے مختص ہے۔

کسی نجی اشاعتی ادارے کی ادبی خدمات کو موضوع تحقیق بنانے کی یہ اولین کوشش ہے؛ ''اولین کوشش'' پہلے سے موجود نمونہ، مثال یا راستہ نہ ہونے کے باعث اپنے سفر کے لیے راستہ بھی خود تخلیق کرتی ہے، لہٰذا ''اولین کوشش'' کی مشکلات، مسائل اور تقصیریں زیادہ ہوتی ہیں۔

اظہارِ تشکر:

سب سے پہلے میں اپنے مشفق استاد جناب ڈاکٹر نثار احمد قریشی مرحوم ومغفور (سابق صدر شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) کے لیے تشکر کا اظہار اور مغفرت کی دعا کرنا چاہوں گا، انہوں نے نہ صرف ایم فل کے کورسز میں میری رہنمائی فرمائی بلکہ ایم فل کے مقالے کے لیے موضوع بھی تجویز کیا اور اس کی نگرانی پر بھی آمادہ ہو گئے؛ ان کی نگرانی میں تحقیقی مراحل طے ہو رہے تھے کہ اچانک ان کے انتقال پر ملال کی خبر آ گئی، یہ خبر ان کے تمام احباب اور شاگردوں کے لیے ایک ذاتی نوعیت کا صدمہ قرار پائی۔ وہ اپنی مہلک بیماری کا مقابلہ اپنی ہمت اور خوش مزاجی سے کر رہے تھے لیکن اس بیماری نے ان کے ان اوصاف کی بھی قدر نہ کی اور انہیں ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین ثم آمین)

ڈاکٹر نثار احمد قریشی (مرحوم) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا اثاثہ تھے، اپنے طالب علموں اور ریسرچ سکالرز سے شفقت فرماتے تھے، خطوط کے جواب جلد دیتے تھے، طلبہ کے مسائل حل کرنے میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے، اوپن یونیورسٹی کے فاصلاتی نظام تعلیم میں ان اوصاف کی ضرورت اور قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔

میں اپنے انتہائی قابل احترام استاد ڈاکٹر نجیب جمال (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور) کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنی شفقت اور رہنمائی سے نوازا، ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی وفات کے بعد میرے مقالے کی نگرانی قبول فرمائی اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں ہر ممکن مدد اور رہنمائی فراہم کی۔

میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے بانی اور مالک جناب نیاز احمد اور ان کے صاحبزادے افضال احمد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے ادارے کے حوالے سے اہم معلومات سے نوازا؛ مختلف اطلاعات کے حصول کے لیے میرے سوالات کے جواب انتہائی تحمل اور خوش اسلوبی سے دیئے اور کسی ملاقات میں بھی ان کے تپاک اور خوش مزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان ملاقاتوں میں میں نے محسوس کیا کہ علمی و ادبی کتب، سنگ میل کی مطبوعات اور اپنے مستقل مصنفین کے لیے ان کی محبت حیران کن حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ وہ سنگ میل کے ماضی و حال سے مطمئن اور مستقبل کے بارے میں پر عزم ہیں۔ سنگ میل کے بارے میں تنقیدی آرا کو بہ خوشی سنتے اور بنی بر خلوص سمجھتے ہیں اور اپنے کسی ناقد/معترض کے خلوص پر شک اور اس کی رائے کو رد نہیں کرتے۔ کسی رائے/تجزیے/تنقید کو اگر اپنے نقطہ نظر سے صائب سمجھیں تو قبول بھی کر لیتے ہیں۔

میں جناب ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، جناب امجد علی شاکر اور جناب ڈاکٹر اختر پرویز کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے مشوروں سے نوازا، میں جناب پروفیسر محمد خالد، جناب پروفیسر غلام حسین ساجد، جناب پروفیسر عمران اللہ، جناب پروفیسر عمران اختر، جناب ڈاکٹر

شاہد حسن رضوی (مدیر الزبیر) اور معروف ناول نگار (اور ناشر) جناب عرفان احمد خان کا بطورِ خاص شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مشوروں کے ساتھ ساتھ اپنی تحریری آراء سے بھی نوازا، ان کی آرا کی روشنی میں مجھے مختلف نتائج اخذ کرنے میں مدد ملی۔ میں مقبول اکیڈمی لاہور کے بانی ملک مقبول احمد اور کلاسیک کے آغا امیر حسین کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بحیثیت ناشر اپنی آرا سے نوازا (کئی مصنفین اور ناشرین نے اپنی تحریری آرا دینے سے انکار کر دیا یا وعدہ فردا پر ٹالے رکھا)، میں شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالعزیز ساحر کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے شعبہ جاتی مسائل حل کرنے اور مقالے کی تسوید وتدوین کے حوالے سے نہایت صائب مشورے دیے۔ میں اپنے دوست اور معروف ادبی شخصیت جناب طارق حبیب کی عنایتوں پر ان کا شکریہ ادا کرنا لازم سمجھتا ہوں۔ شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے اسسٹنٹ جناب محبوب صاحب بھی میرے شکریے کا استحقاق رکھتے ہیں؛ انہوں نے دفتری معاملات کو سلجھانے میں میری بڑی مدد کی۔ میں اپنے دوستوں میں عبدالمجیب بخاری، صغیر احمد مغل، محمد خالد کامران، سعید احمد طاہر، ایوب ندیم، سید جعفر حسین شاہ، عرفان جمیل، پروفیسر محمد الیاس کا بے حد ممنون ہوں کہ مجھے ان کا خلوص، مشاورت اور معاونت حاصل رہی۔ (جناب محمد الیاس نے پروف ریڈنگ میں میری مدد کی اور جناب صغیر احمد مغل اور محمد خالد کامران نے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ بڑی محنت اور باریک بینی سے کر کے مجھے عطا فرمایا)

میں اپنے کمپوزر جناب جمیل ارشد کا بھی شکر گزار ہوں کہ مقالے کی تکمیل ان کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

میں اپنی والدہ، بہن بھائیوں اور اپنی اہلیہ کا شکر گزار سب سے زیادہ ہوں کہ ان کی دعائیں مجھے ہر دم حاصل رہیں۔ (ہر محقق کی طرح) میں اپنی اہلیہ کا احسان مند رہوں گا کہ ان کے تعاون، ایثار اور برداشت کے بغیر یہ کام مکمل نہ ہو پاتا۔ اللہ ان کی برداشت کو قائم رکھے!

منور عثمانی

فہرست ابواب

صفحہ نمبر

تفصیلی فہرست ابواب

صفحہ نمبر

پہلا باب

پاکستان میں ادب کے مطالعہ واشاعت کے رجحانات ومسائل

کتاب، انسان کے فکری، مادی اور روحانی سفر کا حاصل اور مزید ارتقا کا محرک ومنبع ہے۔ کتاب: انسان کے داخل وخارج کی شناسا، عکاس، دوست، رہنما، رازدان اور ترجمان بھی ہے۔ اس فانی دنیا میں صرف کتاب ہی (کسی حد تک) انسان کی بقا کی ضامن ہے۔

کتاب، انسانی تہذیب کے لیے نئے راستوں کی خالق، پرانی روایتوں کی عالم، حقائق کی مظہر اور امکانات کا مصدر ہے اور انسان کی تخلیقی، فکری، علمی، اور باطنی قوت وصلاحیت کا سب سے بھرپور اظہار ہے۔ گویا کتاب احسن تقویم کی احسن ترین تخلیق ہے۔

کتاب کے خارجی روپ اور داخلی وجود نے انسانی ارتقا کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا ہے۔ اس نے اپنا ظاہری ملبوس پہلے مٹی، لکڑی، پتے اور چمڑے سے لیا اور اب اسے ''کاغذی پیرہن'' ہی راس ہے۔

کتاب کا داخلی وجود انسانی ادراک اور احساس سے توانائی حاصل کرتا رہا، بعدازاں کائناتی کشف کے دھماکے نے اسے توانائی کے دیگر مرکزوں سے بھی آشنا اور ہمکنار کردیا۔ انسان نے اپنے باطن کے براعظم میں صوفیانہ سلیقے سے سائنسی طریقے تک جس بھی انداز ورفتار سے پیش رفت کی، کتاب کا بطن اور متن اسی انداز ورفتار سے وسیع، گہرا، روشن اور فیض رساں ہوتا چلا گیا۔

> ''کتاب کیا ہے، نسل انسانی کا حافظہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں یا سیکڑوں سال پہلے کسی شخص یا قوم نے کس طرح سوچا اور کیا محسوس کیا تھا''۔(۱)

علامہ اقبال نے فخر انسانی اور تخلیقی سرشاری کے احساس سے ''چراغ آفریدم'' کا نعرہ بلند کیا تھا۔ کتاب انسان کا سب سے منور، متبرک، محبوب اور مخالف ہواؤں سے محفوظ چراغ ہے۔ اس کی روشنی ایک دائرے، خطے یا نسل تک محدود نہیں رہتی، یہ کئی زمانوں، زمینوں اور جہانوں پر محیط ہے۔

> ''کتاب انسانی زندگی کی ایک بنیادی قدر ہے..... مطالعہ انسانی شعور اور سماجی بیداری کے عمل میں بنیادی کردار کا حامل ہے..... (بقول) معتزلہ عالم ثماثہ: ''قلم جن آثار کو جنم دیتا ہے زمانہ انہیں مٹانے کی استعداد نہیں رکھتا''۔(۲)

کتاب ہر موضوعِ علم اور نقشِ ادب کو کشادہ قلبی سے اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے اور اسے ذمہ داری اور دیانت داری سے اپنے عصر اور مستقبل کے قاری تک پہنچاتی ہے۔

علمی وادبی کتاب کا مطالعہ بذات خود تخلیقی عمل اور ایک گہری فکری سرگرمی ہے۔ مطالعے سے کتاب کے باطن میں موجود صدیوں کی انسانی ذہانت، بصیرت اور تجربات قاری تک بقدر ذوق وظرف پہنچنے لگتے ہیں۔ خصوصاً ادبی مطالعہ، فکری اور روحانی تبدیلی کا شاخسانہ بنتا ہے۔ صاحب مطالعہ وہ نہیں رہتا جو وہ قبل از مطالعہ تھا۔

مطالعہ ادب سے صرف قاری کو ہی ادراک اور جمالیاتی مسرت حاصل نہیں ہوتی، خود کتاب کے متن کو بھی قاری کی تخلیقی ذہانت میسر آتی ہے؛ متن، قرأت کے عمل سے گزر کر مزید روشن ہو جاتا ہے۔ مطالعاتی عمل قاری کے تخیل کو مہمیز لگاتا ہے اور اس کی ذات میں موجود تخلیقی قوت کو اپنی جولانی دکھانے کی تحریک دیتا ہے؛ اسی قوت کے ذریعے قاری متن کے پنہاں زاویوں اور نادریافت حصوں تک پہنچتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جدید ادبی تنقید میں قاری کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی ہے اور ''قاری اساس تنقید'' (Reader Response Criticism) کے عنوان سے باقاعدہ ایک مکتب فکر کا چرچا ہوا ہے (جو قاری کو بنیاد اور مرکز مان کر تخلیقی عمل کی پیش رفت کا جائزہ لیتا ہے) ڈاکٹر وزیر آغا اس حوالے سے کہتے ہیں:

> ''قاری اساس تنقید کا ایک یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اس نے ''قاری'' کی حیثیت کا اثبات کیا ہے اور وہ بھی اس کی تخلیقی حیثیت کا جبکہ اس سے قبل قاری کی حیثیت محض ایک خوشہ چیں کی تھی''۔(۳)

ادب، انسانی احساس، ادراک اور تہذیب کے مجموعی امتزاج سے ایک خوش کن، دلاویز اور پرتاثیر روپ میں جلوہ گر ہونے والا فنِ لطیف ہے۔

تاریخ، فلسفے، سماجیات اور طبیعات کے مطالعے سے انسان موجود اور ممکنات سے واقف ہوتا ہے۔ مطالعہ ادب سے ناموجود اور ممکنات سے ماورا کی دنیا تک قاری کی پہنچ ہو جاتی ہے۔

ادب کے مطالعے سے ہمیں جمالیاتی حظ، نئے احساساتی تناظر اور پھیلتے فکری آفاق میسر آتے ہیں، نیز ادب ہمیں زندگی، فکر، فطرت اور تہذیب کے مختلف مظاہر سے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ وہ سب اپنے وجود کا حصہ محسوس ہونے لگتے ہیں۔

ادب، انسان کے باطن کا عکس بھی ہے اور باطنی امکانات کا اشاریہ بھی، نیز ادب باطن کو اجالتا ہے اور مہذب و مطہر احساسات کی تشکیل میں معاونت کرتا ہے۔

ادب کا پڑھنا اس لیے ضروری ہے کہ ادب ہمیں پڑھتا ہے اور نہایت دل جمعی، گہرائی اور بصیرت سے ہماری داخلی اور تہذیبی دنیاؤں کے موجود اور ناموجود منطقوں کو روشنی میں لاتا ہے اور مادی و روحانی ارتقاء کو نئے امکانی راستوں پر گامزن کرنے میں نہایت خاموشی و خوشدلی سے ہماری مدد کرتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں ادب کے مطالعے کے حوالے سے تین سطحیں ابھرتی ہیں۔

الف: باشعور و باذوق قارئین: اعلیٰ ادب اپنی داخلی طلب کے باعث بہ خوشی اور بہ رضا و رغبت پڑھتے ہیں۔

ب: اعلیٰ ادبی ذوق و شعور سے محروم قارئین: وقت گزاری اور تفریح طبع کے لیے معمولی اور سطحی ''ادب'' اپنے مطالعے کے لیے چنتے ہیں۔

ج: ادب مخالف قارئین، ادب اور ادیب کا رد کرنے یا کسی نصابی، تعلیمی یا تفریحی ضرورت کے لیے مطالعہ ادب کے ''خطاوار'' ہوتے ہیں۔

ان مطالعاتی گروہوں میں سرفہرست ''باذوق و باشعور قارئین'' سے ادب کا تشخص، ارتقا اور بقا جڑے ہوئے ہیں۔ ہر اچھا ادیب وشاعر، وقتِ تخلیق، لاشعوری طور پر ایسے ہی قارئین کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ صاحب ذوق قارئین کی ادبی تربیت میں ان کا ماحول، تعلیم، خداداد فراست اور مطالعے کی کثرت اہم کردار ادا کرتے ہیں؛ ایسے قارئین باقاعدہ نقادِ ادب نہ ہوتے ہوئے بھی نہایت سنجیدہ اور گہرے تنقیدی شعور کا مظاہرہ کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ادبی دنیا کو ان قارئین میں سے اچھے تخلیق کار اور صاحب مطالعہ نقاد بھی میسر آجاتے ہیں۔

ہمارے یہاں باذوق قارئین کو عموماً تین طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

الف: خارجی ماحول کی جانب سے قارئین کے ذوق کو زنگ، مطالعے پر قدغن اور فکر پر پہرے لگانے کی خفی یا جلی کوشش۔

ب: ادب سے تخلیقی تازگی کم یا ختم ہونے کی کیفیت۔

ج: کتاب کے حصول میں رکاوٹ (کتاب کی نایابی یا قوت خرید سے زیادہ قیمت کی صورت میں)

باذوق قارئین ان مسائل سے اپنی توفیق اور استطاعت کے مطابق نمٹتے ہیں؛ بعض اوقات یہ المیہ بھی جنم لیتا ہے کہ ایسے قیمتی قارئین کی تعداد میں کمی واقع ہونے لگتی ہے ایسی صورت میں اہل ادب و دانش کا فرض ہے کہ وہ باذوق قارئین کو اپنی توجہ خاص سے نوازیں کیونکہ ان کی قرأت کے دم سے ہی تخلیقی دنیا پُر رونق رہتی ہے۔

ہمارے ناقدین ادب نے تخلیقی رویوں اور فنی زاویوں کے حوالے سے تو بہت کچھ لکھا لیکن ادب کے قارئین کو موضوع بنانے سے گریز ہی کیا۔ قیام پاکستان کی پہلی دہائی (۴۷ء سے ۵۷ء) میں صرف ایک مثال ''محمد حسن عسکری'' کی ہے جنھوں نے ادب کے قارئین کو اہمیت دی اور تخلیقی عمل میں ان کی شمولیت اور افادیت کا اعتراف کیا۔ حسن عسکری ادب کے مطالعے کو بذات خود ایک تخلیقی عمل قرار دیتے ہیں۔(۴) عسکری قارئین کی اس قلیل تعداد کی تحسین کرتے ہیں جو ادب کو اپنی سنجیدہ سوچ اور غور و فکر کا مستحق سمجھتی ہے(۵) قارئین ادب کے ذوق وشعور پر حسن عسکری کا اعتماد ان جملوں سے ظاہر ہے:

> ''اب تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ ادب کا مستقبل ادیبوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔
> چنانچہ ادیبوں کے بارے میں تو کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی بس ایک طبقہ پڑھنے والوں کا رہ گیا ہے جو اس ادبی انحطاط کو روک سکتا ہے۔ اردو ادب کو زندہ رکھنے کا فرض اگر کوئی انجام دے سکتا ہے تو یہ لوگ ...... اگر ادبی فضا کو بدلنا ہے تو تنقید کا رُخ ادیبوں کی طرف نہیں بلکہ پڑھنے

والوں کی طرف ہونا چاہیئے''۔(۶)

حسن عسکری اس شکوے کا واشگاف اظہار کرتے ہیں کہ ''ادیب صرف ادیبوں کے لیے لکھنے لگے اور پڑھنے والوں کو بھول گئے''۔ (۷) اردو ادب کی تاریخ میں عسکری واحد شخص ہیں جنہوں نے ادب کے قارئین کو باقاعدہ حلقہ، جماعت بنانے کی دعوت دی اور قارئین کے باہمی اشتراک و تعاون کو ادب اور ادیبوں کے لیے نیک شگون قرار دیا۔(۸)

ہمارے یہاں ادب کے باذوق اور تربیت یافتہ قارئین کی مطالعاتی ترجیح عموماً شاعری اور افسانوی ادب رہے ہیں۔ شاعری خصوصاً غزل ہماری سماجی، فکری، ذوقی روایت کا اہم حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ تحریری اور سماعی دونوں خصوصیات رکھنے والی صنف سخن ہے۔(سچ تو یہ ہے کہ ماضی میں غزلیں پڑھی کم اور سنی زیادہ جاتی تھیں۔) مشاعرے کا ادارہ زندہ رہنے کا اہم سبب ہمارا ذوق سماعت بھی ہے لیکن ذوق مطالعہ بھی ہر دور میں برقرار رہا ہے جس کا ثبوت شعری کتب کی مسلسل اشاعتیں ہیں۔(مشاعرے میں داد یا بے داد کا انحصار غزل کے اشعار کی ادائیگی پر رہا ہے اور ''مصرعہ اُٹھانا'' مشاعرے کی روایت اور آداب کا اہم حصہ ہے سو مشاعرے کی اس فضا نے غزل کی قرأت اور شعری لہجے کی عوامی ترویج میں بھی کردار ادا کیا ہے۔)

قیام پاکستان کے بعد غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی آہستہ روی سے قرأت کا حصہ بننے لگی، خصوصاً ایسی نظموں نے قارئین کی خاص توجہ حاصل کی جو رومانی، انقلابی، سیاسی یا مذہبی فکر و احساس اور خطیبانہ لب و لہجے کی حامل تھیں۔ نظم کے اعلیٰ شہ پاروں کو اپنی مطالعاتی پذیرائی کے لیے خاصا انتظار کرنا پڑا (البتہ کچھ استثنائی مثالیں بھی ہیں کہ نظم تخلیق اور شائع ہوتے ہی قارئین کے ادبی حافظے کا حصہ بن گئی۔)

افسانوی ادب (افسانہ و ناول و داستان) میں داستانوں کا مطالعہ صرف طالب علم اپنی نصابی اور نقاد اپنی تصنیفی ضرورت کے لیے کرتے رہے۔ قارئین کی بے حد قلیل تعداد اپنے کلاسیکی مزاج کے باعث ان داستانوں سے حظ اٹھاتی رہی۔

افسانہ، قیام پاکستان کے فوراً بعد مقبولیت میں دیگر نثری اصناف سے بڑھ گیا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خلق خدا پر ہجرت اور فسادات کے باعث جو گزری، افسانہ نگار نے اسے نہایت چابک دستی، فنی مہارت اور تکریم انسانیت کے گہرے احساس کے ساتھ پیش کر دیا۔ اردو افسانہ سقوط ڈھاکہ تک کم و بیش مختلف نشیب و فراز کے باوجود قارئین میں مقبول رہا۔ گو مشرقی پاکستان کے سانحے سے قبل ہی افسانہ مختلف سیاسی و سماجی عوامل اور ادبی و تنقیدی رجحانات و محرکات کے باعث براہ راست کہانی کہنے کی ادا چھوڑ کر علامتی اسلوب کی جانب بڑھا تو اس کے روایتی قاری پہلے حیران اور پھر صدمے کا شکار ہوئے کیونکہ اس اسلوب سے حظ اٹھانے کی انہیں کوئی تربیت تو درکنار، پیشگی اطلاع بھی نہیں دی گئی تھی۔ اس زمانے میں اردو افسانے کے قارئین نے ان افسانہ نگاروں کو غنیمت سمجھا جو براہ راست کہانی کہنے یا سنانے کی وضع پر قائم تھے۔ بعد ازاں خالص علامتی و تجریدی افسانے اور کہانی، علامت اور تجرید کا امتزاج رکھنے والے افسانے بھی قارئین کا ایک مختصر حلقہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اعلیٰ ناول: اردو میں کم لکھا گیا لیکن زیادہ پڑھا گیا۔ پہلے بھرپور تخلیقی ناول ''امراؤ جان ادا'' سے ''راجہ گدھ'' تک اچھے ناولوں کو قارئین کی خصوصی توجہ حاصل رہی۔ بعض ناولوں کو مقبولیت نصابات میں شمولیت، رسائل میں قسط وار اشاعت اور ٹیلی ویژن پر ڈرامائی تشکیل کے باعث بھی حاصل ہوئی۔

> ''اس کی نمایاں مثال اردو کا مشہور ترین ناول ''خدا کی بستی'' (مصنف شوکت صدیقی) ہے۔ یہ ناول پہلی بار ۱۹۵۹ء میں چھپا۔ ۱۹۶۹ء تک بہت کم لوگ اس سے متعارف ہو سکے لیکن جب اسے ٹیلی کاسٹ کیا گیا تو ہر شخص کی زباں پر اسی کا ذکر تھا۔ آج یہ عالم ہے کہ ہر شخص اُسے گفتگو کا موضوع بنائے ہوئے ہے۔ معمولی سے معمولی لائبریری میں سے بھی اسے حاصل کیا جا سکتا ہے''۔ (۹)

پاکستان اپنے قیام کے پچاس سالوں کا سنگ میل عبور کر کے سیاسی، سماجی اور معاشی حوالے سے اس سطح پر آ گیا ہے کہ غریب اور متوسط طبقے کے باذوق قارئین کے لیے ناول خریدنے کے واسطے رقم اور پڑھنے کے لیے وقت نکالنا مشکل تر ہو گیا ہے۔

عام قارئین (جن کا ذکر بعد میں آئے گا) کی طرح سنجیدہ اور باذوق قارئین بھی اعلیٰ ادبی کتب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ تاریخی اور جاسوسی ناولوں کے کسی نہ کسی حد تک ''مبتلا'' ضرور رہے ہیں۔ جاسوسی ناولوں کی مقبولیت دنیا بھر میں مسلم ہے، ہمارے یہاں مغرب کے زیر اثر ایسے ناولوں اور قصوں کا رواج ضرور ہوا لیکن بقول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ: ''ہمارے ہاں جاسوسی ادب لکھا تو بہت گیا اور ترجمہ بھی ہوا لیکن کسی اعلیٰ معیار تک رسائی حاصل نہ کر سکا''۔ (۱۰)

تاریخی ناول: ابتداء ہی سے وسیع حلقۂ قرأت کے حامل رہے ہیں لیکن ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد تاریخی ناولوں کو ایک دینی، ملی اور قومی جذبے سے بھی پڑھا جانے لگا۔ یہ بات ناولوں کے ساتھ ساتھ دینی اور رزمیہ شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔ مثلاً ۱۹۶۷ء کی مطالعاتی اور طباعتی کیفیت ایک معروف ناشر کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے: ''ستمبر ۶۵ء کی جنگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کے شہریوں کو حقیقتاً اسلامی اور رزمیہ تصانیف کی اشد ضرورت ہے۔'' (۱۱)

گو ۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے تخلیق ہونے والا ادب قارئین میں ضرور مقبول رہا لیکن اس معیار اور نوعیت کا ادب سامنے نہ آ سکا جو ۴۷ء کے حوالے سے وجود میں آیا تھا۔ ۶۵ء کے حوالے سے شائع ہونے والی تحریروں میں قارئین نے فکری و احساسی سطح پر ایک تشنگی محسوس کی۔

دیگر تخلیقی نثری اصناف میں مطالعاتی مقبولیت کے حوالے سے سفرنامہ سب سے آگے رہا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے اور قیام پاکستان کی پہلی دہائی تک سفرنامے کی صنف بہت محدود قارئین کی حامل رہی ہے۔ لیکن پاکستان کی دوسری اور تیسری دہائی میں بتدریج اس صنف کو لکھاری اور قاری ملتے چلے گئے ہیں اور آج سفرنامہ اردو ادب کی ایک توانا، مقبول عام اور کاروباری حوالے سے

(مصنف اور ناشر دونوں کے لیے) نفع بخش صنف ادب ہے۔

سفر نامے کی نسبت طنز و مزاح کے حامل ادب کا معاملہ قدرے مختلف اور مطالعاتی مقبولیت کے حوالے سے نشیب و فراز کا شکار رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے طنزیہ و مزاحیہ شاعری اور نثر دونوں کو قارئین کے وسیع حلقے میسر تھے، قیام پاکستان کے فوراً بعد بدترین سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے باعث قارئین سنجیدہ شاعری اور افسانے تک محدود رہے؛ ظاہر ہے اس وقت ان میں ذات و کائنات کی ناہمواری سے حظ اٹھانے کی سکت ہی کہاں تھی؟ خاصے عرصے بعد قارئین پہلے طنز اور بعدازاں مزاح کی جانب راغب ہوئے اور یہ ایک فطری پیش رفت تھی، ان کے روحانی تشنج کو پہلے طنز راس آئی، پھر وہ قدرے متوازن ہو کر خالص مزاح کو پڑھنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اس عرصے میں اخبارات کے فکاہیہ کالموں، کامیڈی فلموں اور ڈراموں نے اعلیٰ مزاحیہ ادب سے قارئین کو دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن اس عہد میں یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی البتہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں صحافتی اور فلمی جدوجہد کو کامرانی ملی اور اردو کا مزاحیہ ادب: حالات حاضرہ اور شو بزنس کی ''گلیمر'' دنیا کا اسیر ہو کر رہ گیا، اس طرح ایک بار پھر طنز و مزاح کی ایک بڑی مقدار نے اپنے باذوق قارئین کا اعتبار کھو دیا۔

خود نوشت سوانح، آپ بیتی اور خاکے بھی آہستہ روی سے مطالعے کی میز پر اپنی جگہ بنانے لگے۔ 'یادوں کی بارات'، 'جہانِ دانش' اور 'شہاب نامہ' مقبول عام کتابیں ثابت ہوئیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ ادب کے ''جز وقتی'' قارئین نے بھی خوب کیا۔

ڈراما دیکھنے کی صنف ہے، اس صنف ادب کو بہت کم ناشرین و قارئین حاصل ہوئے۔ استثنائی مثال: امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' کی ہے جو ایک تسلسل سے شائع ہوتا رہا اور ہر طبقے کے قارئین میں مقبول رہا۔ گذشتہ پچیس سالوں میں ڈرامے کی طباعت و قرأت کے حوالے سے ایک پیش رفت ہوئی؛ پاکستان ٹیلی ویژن کا اردو ڈراما معیار و مقدار میں خاصا آگے بڑھا تو اسے دیکھنے کے بعد پڑھنے کی طلب بھی پیدا ہوئی اور یوں ڈرامے کی صنف کو بھی ناشرین اور قارئین حاصل ہونے لگے۔

پاکستان کے کچھ ادبی رسائل نے انگریزی کے خالص ایسے (Essay) کی طرز پر اردو میں ایک نئی صنف نثر انشائیہ کو فروغ دینے کی کوشش کی تو اسے شروع میں قارئین کی نہایت محدود تعداد ہی حاصل ہوئی، بعدازاں فروغِ انشائیہ کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس تعداد میں مناسب اضافہ ہوا۔

تحقیقی و تنقیدی کتب کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ انہیں صرف اہل نقد و نظر اور ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کوشاں طلبہ ہی پڑھتے ہیں لیکن یہ خیال زیادہ صائب نہیں ہے۔ باذوق قارئین بھی کسی ادبی رجحان، شخصیت، تنازع، تحریک، ادبی تاریخ یا تخلیقی معیارات کی گہری تفہیم کے لیے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ (تحقیقی و تنقیدی کتب کی ایک بڑی تعداد میں اشاعت و فروخت اور ''قومی کتاب مرکز'' کے عادتِ مطالعہ کے حوالے سے ہونے والے ملک گیر سروے سے بھی یہی حقیقت آشکار ہوتی ہے، اس کا مزید

ذکر آگے آئے گا۔)

ادب کے سنجیدہ، باذوق اور تنقیدی شعور کے حامل قارئین کے ساتھ ساتھ ایک کثیر تعداد ہمیشہ ایسے قارئین کی بھی رہی ہے جو وقت گزاری اور رومانی احساسات کی تشفی کی خاطر یا پھر جنسی چٹخارے کی تلاش میں ادبی کتابوں اور رسالوں کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ جب ان کی طلب بڑھتی ہے تو رسد کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔(ادیب وشاعر اور ناشر مل کر سطحی ذہن وذوق کی تشفی کے لیے سرگرداں ہو جاتے ہیں۔)

عام قارئین کی اکثریت میں رومانی اور جاسوسی ناولوں کے ساتھ ساتھ تاریخی ناول بھی خوب مقبول رہے ہیں خصوصاً تاریخی اسلامی ناول مرد وزن میں بڑے دل پسند ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی معاشرتی وجہ یہ ہے کہ ایسے ناول غیر معیاری اور بعض اوقات قابل اعتراض مواد کے باوجود گھر میں سب کے سامنے پڑھے جاسکتے تھے۔ ان ناولوں کی مقبولیت کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ انہیں پڑھتے ہوئے تفریح طبع کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی جاں گزیں رہتا ہے کہ کوئی غلط کام، فضول مطالعہ، محض ذہنی عیاشی، اور معاشرتی و مذہبی اخلاقیات سے مختلف کام نہیں ہو رہا بلکہ تاریخ اسلام کو پڑھا جا رہا ہے اور خوابیدہ ایمان اور ملی احساس کو بیدار، تازہ اور پرجوش کرنے کے لیے ایک صالح کوشش سرزد ہو رہی ہے۔ عموماً اس نوعیت کے قارئین معمولی شعر وافسانہ سے عمر بھر دل بہلانے میں مصروف رہتے ہیں البتہ ان میں سے کچھ اپنے ذہن وذوق کو ارتقاء دیتے ہیں اور اعلیٰ، سنجیدہ اور خالص ادب کی جانب رجوع کرنے لگتے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں عادات مطالعہ کے جائزے کے لیے قومی کتاب مرکز پاکستان کے زیر اہتمام اور مولانا صلاح الدین احمد کی زیر نگرانی ہونے والے ملک گیر سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ گو ہمارے یہاں مقبول ترین کتب: تاریخی، رومانی، جذباتی ناول ہی ہیں، البتہ اردو کی اہم کتب مثلاً امراؤ جان ادا، کلام غالب، کلام اقبال، انارکلی، آگ کا دریا، ڈپٹی نذیر احمد کے قصے اور منٹو کے افسانے بھی عام وخاص کے مطالعے میں آتے رہے ہیں۔(۱۲)(اس سے درج بالا موقف کو تقویت ملتی ہے کہ ہر دور میں تعلیم، ذوق اور ادبی تربیت کم ہونے کے باوجود ادبی کتب کی جانب عام قارئین کی ایک محدود تعداد رجوع کرتی رہی ہے۔)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب کے عام قارئین کی اکثریت مطبوعات کے بجائے مجلّوں، رسالوں اور ڈائجسٹوں کی جانب راغب ہونے لگی، خصوصاً ڈائجسٹ کے نام سے ایسے کثیر الاشاعت رسالے مقبول ہو گئے جس میں عام قارئین کے لیے رومانی، روحانی، جاسوسی حتیٰ کہ نیم جنسی کہانیاں بھی بڑی فراوانی سے شائع ہونے لگیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ڈائجسٹوں نے ''عوامی بلکہ عامیانہ سطح کے قارئین کی زیادہ سے زیادہ تشفی'' کا اصول اپنایا اور ادبی پرچوں سے افسانوی ادب کے قارئین کو چھین لیا۔(۱۳)

مطالعہ ادب کے حوالے سے تیسرا گروہ ایسے جز وقتی قارئین کا ہے جو مزاجاً شعر وادب کے مخالف ہیں، اس کے باوجود اپنے ''اصولوں'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کبھی تفریح محض کی خاطر اور کبھی شعر وادب کے کسی حصے کا رد کرنے کے لیے زحمت مطالعہ سے

گزرتے ہیں۔عموماً ایسے قارئین: ترویج مطالعہ کے بجائے تحدید مطالعہ اور فروغ ادب کے بجائے انسداد ادب کا باعث بنتے ہیں۔اہل فکر اور ناقدین ادب کو اس نوعیت کے ادب مخالف، جز وقتی قارئین کو اپنے تجزیاتی مطالعے کا ضرور حصہ بنانا چاہیے تھا تا کہ ان کے رویوں کی نفسیاتی وجوہات سائنسی انداز میں سامنے آسکتیں۔

قیام پاکستان کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود دیگر ترقی یافتہ قوموں کی نسبت ہمارے یہاں مطالعہ ادب کے فروغ اور قارئین ادب کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہونے کے کئی اسباب ہیں،جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱) خواندگی اور فروغ تعلیم کے معاملات حکومتی وسماجی ترجیحات میں سرفہرست نہیں رہے۔

بقول حنیف رامے:

> ''ہمارے یہاں تعلیم کو صرف یعنی Consumption کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے اور سرمایہ کاری یعنی Investment کی مد میں شامل نہیں سمجھا جاتا..... تعلیم صرف کے ساتھ ساتھ اسی طرح کی سرمایہ کاری ہے جیسے نہروں کی کھدائی یا ڈیموں کی تعمیر''۔(۱۴)

حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارا سماجی رویہ بھی خواندگی اور تعلیم کے فروغ میں رکاوٹ رہا ہے۔معاشرے کی نظر میں چند مذہبی و معاشرتی فرائض کی ادائیگی اور حصول زر کے لیے کوششیں تو بہت اہم رہی ہیں لیکن لفظ''اقرا'' کی تفہیم اور اس میں موجود حکم کی تعمیل سے کنارہ کشی کا رویہ غالب رہا ہے۔فکر واقدار کی فرسودگی: علمی کھوج اور ادبی مطالعے کے لیے خوش دلی اور کشادہ نظری کا مظاہرہ کرنے سے قطعاً قاصر رہتی ہے۔قیام پاکستان سے قبل (موجودہ پاکستانی خطے میں) گو خواندگی اور اعلیٰ تعلیم کی شرح بہت کم تھی لیکن چند شہروں،اداروں اور گھرانوں میں محدود پیمانے پر علمی اور ادبی کتب کا مطالعہ خاصے ذوق وشوق سے کیا جاتا تھا۔فارسی،اردو اور انگریزی ادب کے مطالعے نے نہایت گہرے تہذیبی اثرات مرتب کیے اور تخلیقی طور پر زرخیز خطے کو قوت نمو سے ہمکنار کرنے کی سنجیدہ اور بابرکت کوشش کی۔قیام پاکستان کے بعد پہلی دو دہائیوں میں یہ محدود ومخصوص مطالعاتی ماحول بتدریج ختم ہوتا چلا گیا۔

۲) خواندہ افراد،مزید تعلیم اور مطالعے کے لیے تربیت،وسائل اور محرکات سے محروم رہے۔

کسی غریب اور مسائل میں گھرے ملک میں خواندہ افراد (ایسے لوگ: جو پڑھ لکھ سکیں) بہرکیف قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں،ان میں ذوق علم اور شوق مطالعہ پیدا کر کے انہیں تعلیم کی ثانوی یا اعلیٰ ثانوی سطح تک (کم از کم) پہنچایا جاسکتا ہے؛ لیکن اس سلسلے میں ہمارا حکومتی نظام اور معاشرتی بندوبست کچھ زیادہ مددگار نہیں رہا۔اس صورتحال کا نتیجہ بقول سید حیدر رضا رضوی ایک خواندہ لیکن''غیر مطالعاتی طبقے'' کا ظہور ہے:

> ''ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ خواندگی بڑھنے کی رفتار ۲۵٪ سے بھی کم ہے اور بے شمار

ایسے لوگ ہیں جو پڑھنا جانتے ضرور ہیں لیکن چاہتے نہیں۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔ایک تو یہ
ہے کہ ہمارا بیشتر ابلاغ خصوصاً دیہاتوں میں صرف زبانی ہوتا ہے، اور لکھے جانے کی روایات
بہت کم ملتی ہیں۔ پڑھانے کا طریق کار، امتحانات کا نظام اور دوسری کئی باتیں لوگوں کو بجائے
مطالعے کی جانب راغب کرنے کے انہیں اس سے خوف دلا دیتی ہیں اور اس طرح ہمارے ہاں
ایک خواندہ۔مگر غیر مطالعاتی طبقہ جنم لیتا ہے''۔(۱۵)

۳۔ موجود تعلیمی ادارے اور نصابات شوق مطالعہ اور ذوق ادب پیدا کرنے میں بتدریج ناکام ہوتے چلے گئے ہیں۔پاکستانی طلبہ رسمی ونصابی تعلیم اور مختلف تعلیمی اسناد کے حامل تو ضرور ہوئے لیکن تاریخ، فلسفے، ادب اور فکری وعصری انکشافات ومسائل سے کلی اور بعض اوقات جزوی طور پر بھی واقف نہ ہو سکے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ (جو اس سارے نظام اور زمانے کے شاہد ہیں):

''ادبی ذوق کا وہ منبع بھی اب کچھ خشک ہو رہا ہے جسے شعبہ تعلیم کہا جاتا ہے۔کسی زمانے میں ادبی
تربیت کا آغاز کالجوں سے ہوا کرتا تھا۔کالجوں میں ادیب بھی پیدا ہوتے تھے اور ادب فہم بھی۔
بلاشبہ ادبی انجمنیں اب بھی موجود ہوں گی لیکن ان سے ادبی تربیت کا کام کچھ زیادہ نہیں لیا
جاتا''۔(۱۶)

۴۔ ملک بھر میں صاحب علم اور صاحب ذوق افراد کے لیے پبلک لائبریریاں فقط چند ہیں، جبکہ کتابیں بے حد گراں۔

چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں پبلک لائبریریوں کے قیام کے منصوبے روبہ عمل نہ آ سکے، بڑے شہروں تک محدود لائبریریوں میں نظم وضبط اور بندوبست کی کمی نے ان کی رہی سہی افادیت کو بھی ختم کر دیا۔سرکاری فنڈ سے لائبریریوں میں کتابوں کے ''ڈھیر'' ضرور لگائے گئے لیکن اسے کتب خانے کی تہذیب عطا نہیں کی گئی۔ بقول محمود الحسن (ماہر لائبریری سائنس):

''ایک مربوط اور منظّم چھوٹا کتب خانہ (کسی بھی سطح پر ہو) لاکھوں کتابوں کے غیر محفوظ اور غیر
منظّم ڈھیر سے بدرجہا بہتر ہے..... کتب خانے کی افادیت اور معیار کو جانچنے کے لیے اس کی
خدمات کے معیار کو ناپا جائے نہ کہ اس کی کتب کو گنا جائے''۔(۱۷)

لائبریری غیر اہم ہوئی تو اس سے وابستہ نظام اور افراد بھی غیر اہم ہو گئے، کتب خانوں سے حکومتی ومعاشرتی بے اعتنائی تو قیام پاکستان سے ہی اہل نظر کے سامنے آ گئی تھی لیکن صدر ایوب کے طویل آمرانہ دور میں یہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔حکومت کی توجہ فقط اپنے اقتدار اور معاشرے کا دھیان صرف اپنے مفادات پر مرکوز ہو تو علم، عالم، کتاب اور کتب خانے سب بے توقیر ہو جاتے ہیں۔اس بے اعتنائی اور بے توقیری سے ہونے والا نقصان دائرہ در دائرہ پھیلتا ہے۔ بقول فرخندہ لودھی (افسانہ نگار و ماہر لائبریری سائنس):

''لائبریریوں کی طرف عدم توجہی نے صرف اس سے وابستہ لوگوں کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ادیب جو کتاب لکھتا تھا، ناشر جو کتاب چھاپتا تھا اور کتب فروش جو کتاب سے روزی حاصل کرتا تھا معاشی بدحالی کا براہ راست شکار ہوئے۔ طالب علم ذہنی غذا سے محروم ہوا اور استاد کتابوں سے بے نیاز ہو کر لائبریری کے بجائے جیب ٹٹو لنے لگا۔عوام کو اس دور کے نقصانات کا اندازہ وقت کے ساتھ ساتھ ہوتا رہے گا''۔(۱۸)

قوم کو ان نقصانات کا اندازہ ضرور ہوا لیکن قیام پاکستان کو ساٹھ سال گزرنے کے باوجود تلافی کی کوئی صورت سامنے نہ آسکی۔

۵۔ ادیبوں اور شاعروں کی اپنے قارئین سے بے نیازی اور ادبی حلقوں کی باہمی آویزش و معاصرانہ چشمک نے مطالعہ ادب کے فروغ کو ضرر پہنچایا۔

تخلیق کار اپنے فکر و احساس کی گہرائیوں اور عصری صداقتوں کی پیش کش کے دعوے میں ضرور حق بجانب ہوں گے لیکن قارئین ادب کے احساس اور ذوق کی گہرائی ناپنے اور مطالعاتی عادات جاننے میں ان کی دلچسپی کچھ زیادہ نہیں رہی۔ادب کے اساتذہ، ناقدین حتیٰ کہ ناشرین نے بھی قارئین ادب کو سنجیدہ مطالعے کے لیے توجہ اور تربیت فراہم نہیں کی، حالانکہ بقول مختار صدیقی:

'' لکھنے والوں کا یہ فرض ہے کہ پڑھنے والوں کے تقاضوں کا پورا احترام کر کے اسے اپنے ادب عالیہ کے لیے تیار کریں اور لکھنے والوں سے زیادہ ناشروں کا یہ فرض ہے کہ مستقلاً اپنے اداریوں، اپنے اشتہاروں، اپنے کتابچوں اور پبلسٹی کے ہر موثر ذریعہ کو کام میں لا کر پڑھنے والوں کو بتائے کہ اسے اپنے مذاق کی تہذیب و ترقی کے لیے کیا پڑھنا ہے، اور اسے اپنے مخصوص مذاق کی تشنگی اور اس کی تسکین کیا کرنا چاہیے''۔(۱۹)

قارئین ادب کے حوالے سے ناقدین ادب نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔اس حوالے سے سید حسن عسکری کے چند مضامین اور (کسی حد تک) ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' جو ''ہڈسن کی مشہور تصنیف An introduction to the study of literature کی روشنی میں لکھی گئی ہے''۔(۲۰) استثنائی مثالیں ہیں۔حالانکہ ہر معتبر ادبی ماحول کی ذمہ داری اچھے لکھاری کے ساتھ ساتھ اچھے قاری پیدا کرنا بھی ہے۔ہمارے یہاں قاری کی ادبی تعلیم اور ذوقی تربیت عموماً تین طرح سے ہوتی ہے۔

(الف) قاری اپنی خداداد ذہانت اور خاندانی ماحول کے باعث اپنے ذوق کو اعلیٰ درجے پر پہنچاتا ہے۔

(ب) قاری کسی تعلیمی ادارے یا کسی ادبی حلقے سے باقاعدہ وابستگی اختیار کر کے ادب پارے کے مزاج، خدوخال اور محاسن سمجھنے اور ان سے حظ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

(ج) قاری سطحی، تفریحی اور معمولی ادب کی قرأت میں خاصا وقت صرف اور عمر وشعور کی کئی منزلیں طے کر کے (سطحی ادب سے) اعلیٰ ادب کی جانب راغب ہوتا ہے۔ (گویا مناسب رہنمائی نہ ہونے کے باعث اسے ایک طویل کشٹ اور وقت وصلاحیت کے ضیاع کے بعد یہ منزل سعید حاصل ہوتی ہے)

قاری کے حوالے سے ایک بحث یہ بھی ہے کہ تخلیق کار کی طرح ادبی قاری بھی خداداد صلاحیت سے متصف ہوتا ہے؟ یا محض ادبی تعلیم وتربیت سے وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے؟ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

''میرے خیال میں دونوں باتیں ہیں۔ ہر قاری Ecrivain قاری نہیں ہوسکتا گو Ecrivain قاری کے بننے اور سنورنے میں تربیت اور ماحول کا جو حصہ ہے، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی اگر دو اشخاص کو ایک سی تربیت مہیا کی جائے تو ضروری نہیں کہ دونوں Ecrivain قاری بن سکیں کیونکہ ایسا ہونے کے لیے وہی صلاحیت درکار ہے جو فطرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔'' (۲۱)

وزیر آغا کا استدلال نہایت صائب ہے اور ادبی اور ذوقی تعلیم وتربیت میں اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ادیبوں اور نقادوں کی اپنے قارئین سے بے نیازی کے ساتھ ساتھ مطالعہ ادب کے فروغ کو ادیبوں اور شاعروں کی باہمی رقابت اور نظری وشخصی آویزش نے بھی نقصان پہنچایا اور ادب وادیب کے بارے میں ان حلقوں میں منفی تاثر مستحکم کیا جو پہلے ہی شعر وادب کے لیے کشادہ دل نہیں تھے۔ اخبارات کے نام نہاد ادبی ایڈیشنوں نے ان رقابتوں اور آویزشوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے ''فروغ صحافت'' اور تفریح طبع کا سامان تو کیا لیکن انسداد مطالعہ ادب کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ تاحال یہ صورتحال برقرار ہے۔ حلقہ ادب وصحافت کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قاری اپنے پسندیدہ ادیب وشاعر کے لیے بہترین تاثر اپنے قلب وذہن میں قائم کرتا ہے؛ یہ تاثر مجروح ہونے سے اس کی پسندیدگی میں فرق آتا ہے اور عادت مطالعہ کو صدمہ پہنچتا ہے۔

۶۔ ناشرین کتب کی حصول زر کے لیے بھاگ دوڑ نے کتابوں کا علمی وادبی معیار ارزاں اور ان کی قیمتوں کو گراں کر دیا۔

ناشر، کتاب کی اشاعت اور فروخت کو اپنا کاروبار بناتا ہے، دیگر تجارتی افراد وادارہ جات کی طرح اس سے بھی بجا طور پر توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ حصول نفع کے عمل کو جائز حدود میں رکھے گا۔ بلاشبہ چند ناشرین اپنی مشکلات کے باوجود ان اصولوں پر عمل پیرا بھی رہے، لیکن وطن عزیز میں عموماً، ناشرین نے اپنی مشکلات کا خیال اور اپنے مفادات کا لحاظ ہی کیا، اور صاحب ذوق لیکن کم وسائل قارئین کے مسائل کو سمجھنے حتیٰ کہ قابل اعتنا جاننے کا رویہ بھی اختیار نہیں کیا۔

ناشرین ادب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علمی وادبی معیار سے تہی دست کتابیں بھی شائع کیں، جس کے باعث قاری کا

ذہن وذوق، معاشرے کی مثبت اقدار، صاحب معیار ادیب وشاعر کا مرتبہ ومعاش سب متاثر ہوئے۔ (اشاعتی رجحانات ومسائل پر مزید تفصیل اسی باب میں آگے آئے گی)

۷۔ الیکٹرانک میڈیا کے بتدریج تسلط نے لوگوں سے وہ فراغت ہی چھین لی جس کی بنیاد پر ایک وسیع حلقے کی عادت مطالعہ قائم تھی۔ ریڈیو نے تو فقط ذوق سماعت کو زحمت دی تھی، فلم اور ٹیلی ویژن نے نظارت کو بھی اپنے قبضہ قدرت میں لے لیا۔ بعدازاں کمپیوٹر (اور انٹرنیٹ) نے انسان کو کتاب کے ساتھ ساتھ حلقہ احباب سے بھی محروم کر دیا۔ الیکٹرانک میڈیا کی یلغار سے جو سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان سے مطالعے کی تہذیب اور کتاب کی صنعت لرزہ براندام ہوگئی۔ کتابی صنعت نے اپنے آپ کو سنبھالنے اور طباعت و اشاعت کو ازسرنو نفع بخش بنانے کے لیے سرکاری کتب خانوں پر اپنا انحصار بڑھا لیا؛ ہر کتاب کو لائبریری ایڈیشن (یعنی مجلد، مہنگا، ضخیم) بنانے کی دوڑ شروع ہوگئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ الیکٹرانک میڈیا کی گرفت سے نکلنے والا ''گم شدہ'' قاری، کتاب کی قیمت دیکھ کر دوبارہ میڈیا کی طرف پلٹ گیا، کہ جہاں اس کی ''تفریح طبع'' اور ''ذوق جمال'' کی تسکین کے لیے سب کچھ سستے داموں موجود تھا۔

الیکٹرانک میڈیا کے ہمہ جہت ترقی وتسلط سے اس بات کا احتمال بڑھ رہا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہمارے یہاں ادب کا مطالعہ فقط ادیبوں، ادب کے طالب علموں اور استادوں کا ہی شوق یا مسئلہ رہ جائے گا۔ لہٰذا علمی وادبی حلقوں اور اشاعتی طبقوں پر لازم ہے کہ وہ سنجیدہ وباذوق قارئین کی بچھی کچھی اقلیت کو مطالعہ ادب سے دور نہ ہونے دیں۔

۸۔ پاکستان میں آمرانہ نظاموں نے آزادی فکر واظہار پر ہمیشہ قدغنیں لگائیں جس سے تخلیقی ادب ہی نہیں، فروغ مطالعہ کی راہ میں بھی رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں۔

آزادی فکر واظہار، جمہوری معاشروں میں بھی بتدریج حاصل ہوئی ہے لیکن ہمارے یہاں تو فوجی آمریتوں، ہنگامی حالتوں اور شخصی وعبوری دستوروں کے نفاذ نے نظام، عوامیت اور آزادی کے تصور کو ہی سرے سے مٹانے کی کوشش کی۔ سفاکانہ سنسر شپ نے فکر، تخلیق، اشاعت اور قرأت کو بدترین ضرر پہنچایا۔ فکر اور تخلیق کے لیے آزادانہ فضا موجود ہو تو تحریریں اپنی فکری وجمالیاتی قوت سے اپنے قارئین اور مداحین تلاش کر ہی لیتی ہیں۔ اس کے برعکس صاحب فکر اور صاحب کتاب پابندیوں اور پہروں میں رہیں تو قاری سے ان کا ربط اور مکالمہ قائم نہیں ہو پاتا، سو آمریت فقط سیاست ومعیشت اور علم وفکر کو ہی صدمے سے دوچار نہیں کرتی بلکہ تجسس، طلب، ذوق اور جمالیات کو بھی نابود کر دیتی ہے۔ انجام کار: تر وتازہ ذہانتیں اور نئی بصیرتیں قومی زندگی کا حصہ نہیں بن پاتیں اور قومی زندگی، عالمی فکر و تہذیب میں کبھی بھی اور کسی بھی نوعیت کا اہم اضافہ کرنے کے قابل نہیں ہو پاتی۔

مختلف النوع وجوہات کے پھیلاؤ کے باعث، اب ہمارے یہاں مطالعہ ادب کا فروغ بجائے خود ایک کٹھن مہم کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ سیاسی ومعاشرتی تناظر کی تبدیلی کے بغیر اس مہم کا سر ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ چونکہ موجودہ حالات میں فروغ تعلیم کا مسئلہ حکومتی

ترجیحات میں سرفہرست ہونے کی توقع خیال خام ہے اس لیے رہ سہہ کے ذمہ داری اہل فکر وفن، محبان علم وادب اورارباب تعلیم وتدریس کے کندھوں پر آ پڑتی ہے؛ ان کے علاوہ ادبی اشاعت وطباعت سے وابستہ طبقوں کی بقا بھی خواندگی، تعلیم اور مطالعے کے فروغ سے جڑی ہوئی ہے لہٰذا ناشرین ادب کو بھی درج بالا حلقوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔

علمی وادبی اشاعتیں کسی بھی معاشرے کی تخلیقی وتہذیبی قوت کو بھرپور طریقے سے سامنے لاتی ہیں؛ ان ہی سے معاشرے کی سنجیدگی، بالیدگی اور پختگی ظاہر ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔

ادبی اشاعتیں معاشرے کو روشنی دیتی ہیں اور روشنی میں لاتی ہیں، مطالعے کا ذوق پیدا کرتی ہیں اور ذوق کی تہذیب کرتی ہیں۔ ادبی اشاعتوں سے ہی معاشرے کے فکری آفاق، باطنی احوال اور تہذیبی اطوار ظہور پاتے ہیں۔

بعض ناقدین، ادب کے عصری رجحانات اور مستقبل کے امکانات کے جائزے میں اشاعتی رفتار و میلانات کا تجزیہ بھی ضروری سمجھتے ہیں، مثلاً مختار صدیقی مطبوعات کو ''ادب کے ٹھوس مظہر'' قرار دیتے ہیں' ان کے نزدیک : دیگر امور کے ساتھ ساتھ ادبی جمود پر بھی بحث کرتے ہوئے ''رفتار اشاعت'' پر غور ضروری ہے، کیونکہ:

> ''ادبی مطبوعات ہی۔ چاہے ماہناموں یا دوسرے جرائد کی صورت میں ہوں، چاہے تصانیف کے قالب میں کسی ملک اور قوم کے ادب کی رفتار کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ انہیں سے اس ملک کے جدید ترین ادبی رجحانات، نت نئے میلانات، فنی اور موضوعاتی تنوع اور تجربے، نکھار اور سنوار، قابل لحاظ گردانے جاتے ہیں۔ انہی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سنجیدہ ادب، علمی تحقیق و تفحص، سائنسی تفتیش اور ادبی نقد و نظر کس موڑ پر ہیں۔ عامیانہ اور وقتی تفریح کا لٹریچر کس منزل میں ہے۔ سنجیدہ ادب اور اس قسم کے لٹریچر میں بلحاظ اشاعت اور بلحاظ ضخامت و قبولیت کیا تناسب ہے اور قارئین کا عام رجحان کیا ہے''۔(۲۲)

قارئین کا عام رجحان اور اشاعت ادب کا میلان اصل میں دونوں ایک ہیں۔ مطالعہ ادب اور اشاعت ادب کا ذکر ایک دوسرے کے بغیر ادھورا بلکہ ناقص ہے؛ مطالعہ و اشاعت کا فروغ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے، حتیٰ کہ ایک کے مسائل حل کیے بغیر دوسرے کے وسائل میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ بقول ابوالحسن:

> ''کتابی صنعت کی نشو و نما اور ذوق مطالعہ کی ترویج، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے درمیان جو ایتلافی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک کا دوسرے پر براہ راست گہرا اثر پڑتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ کتابی صنعت کی ترویج سے ذوق مطالعہ، ارتقا

کرتا ہے اور ذوق مطالعہ کے ارتقا کے ساتھ کتابی صنعت نشو ونما پاتی ہے''۔(۲۳)

کتابی صنعت میں اشاعت ادب کے شعبے کو عموماً شہرت اور اہمیت زیادہ حاصل ہوتی ہے لیکن ہمارے یہاں ہمیشہ اس شعبے کو ہی اشاعتی دنیا میں کٹھن اور سخت صبر آزما مراحل کا سامنا رہتا ہے۔اس کے باوجود ذوق ادب کی بنیاد پر ادب کی اشاعت وطباعت کو اپنا کاروبار بنانے والے کم نہیں ہیں۔ بقول مجنوں گورکھ پوری: ادب اور اشاعتی کاروبار میں کوئی بنیادی ''تخالف' یا تضاد یا تصادم'' نہیں ہے؛ بس ناشر کا صاحب ذوق ہونا ضروری ہے۔(۲۴)

قیام پاکستان سے پہلے لاہور اور ڈھاکہ کتابی دنیا کے دو بڑے مرکز تھے(۲۵) البتہ سنجیدہ ادبی مطبوعات اور جرائد کے بڑے بڑے مراکز بقول مختار صدیقی لاہور، حیدرآباد، دلی اور لکھنو تھے اور ان کی ''ترتیب بلحاظ کارکردگی بھی یہی تھی''۔(۲۶) لیکن تقسیم ہند کے بعد اس کارکردگی میں فرق آیا۔

> ''لاہور کی مطبوعات اپنے حسن طبع، ترتیب و تدوین اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے سارے برعظیم میں امتیازی حیثیت کی مالک رہی ہیں۔لیکن پاکستان کے پہلے دو برس میں ہی ہر ناشر سے سن لیا کہ اب مطبوعات کا بازار بند۔کوئی اور کام سوچتے ہیں''۔(۲۷)

لاہور کی نسبت دیگر اشاعتی مراکز کا حال اور بھی خستہ ہوگیا، حتیٰ کہ حیدرآباد(دکن) کا طباعتی مرکز تو ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔(۲۸) لاہور کا طباعتی مرکز اپنی سخت جانی کے باعث حالات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں لگا رہا لیکن ماضی کی خوش کن کیفیت میں داخل نہ ہوسکا۔انجام کار: مضبوط، مستحکم اور اپنے زمانے کے مثالی ادارے اس پرآشوب دور کی نذر ہوگئے یا خاتمے کے قریب پہنچ گئے۔مثلاً امتیاز علی تاج کا آبائی ادارہ ''دارالاشاعت'' بتدریج زوال کا شکار ہوگیا، ڈاکٹر محمد سلیم ملک بتاتے ہیں:

> ''تقسیم ہند سے پہلے سکولوں کی کئی کتابیں ''دارالاشاعت'' سے چھپتی تھیں۔پاکستان بنا، تو انہیں محکمہ تعلیم چھاپنے لگا، جس سے ''دارالاشاعت'' کی کتابیں بکنا بند ہوگئیں؛ اسی طرح ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' ہندوستان میں دور دور تک جاتے تھے۔ملک دو حصوں میں بٹا، تو بھارت کی مارکیٹ جاتی رہی اور یہ اخبار پاکستان میں محدود ہوگئے، پھر اخباروں کی اشاعت اتنی گری، کہ ''تہذیب'' خسارے میں جانے لگا، اس لیے اسے بند کرنا پڑا؛ اب ''تہذیب'' کا ذریعہ اشتہار نہ رہا تو ''دارالاشاعت'' کی دوسری کتابوں کی مانگ بھی گر گئی اور کاروبار ٹھپ ہوگیا''۔(۲۹)

البتہ لاہور کے کچھ ادارے مثلاً ''فیروز سنز'' اور ''ملک غلام علی اینڈ سنز'' اس مشکل وقت کو جھیل گئے اور بتدریج مستحکم ہوتے چلے گئے۔(لاہور کے طباعتی اداروں کا مزید ذکر باب دوم میں آئے گا)۔

اشاعتی اداروں کی ترقی اورخوشحالی ،سیاسی ومعاشی حالات کے ساتھ ساتھ قارئین کے ذوق مطالعہ اورفراغت مطالعہ سے جڑی ہوتی ہیں؛ ۴۷ء کے زمانے میں چلیے ! ذوق نہ صحیح ،فراغت، اطمینان اور آسودگی ضرور نایاب ہوگئے؛ فسادات اور اقتصادی تباہی نے قارئین کے ساتھ ساتھ ادباوشعرا کے حلقے کوبھی دل گرفتہ اورآشفتہ حال کردیا۔سوادب کی تخلیق،اشاعت اورقرأت تینوں امور میں معیار ومقدار کا فرق صاف محسوس کیا جانے لگا۔اس مطالعاتی اور طباعتی کیفیت کاعکس اورسبب احسان دانش کی خودنوشت سوانح میں کچھ اس طرح محفوظ ہوا ہے:

''عوام کے دماغوں میں الجھن اور دلوں میں غم وآلام کی آلودگی تھی اس لیے ادب کی معیاری تحریروں اورغزلوں کے معیاری اشعار بھی رواج نہ پاسکے ہاں ان کی جگہ دولت سے بہرہ مند لوگ ہرقسم کی آزادروی پراُترآئے اوردرمیانہ طبقہ تاریخی ناولوں کا دلدادہ ہوگیا اورجنہیں کچھ نہ ملا وہ جاسوسی ناولوں اورفحشیات کے مطالعے میں مصروف ہوگئے''۔(۳۰)

درج بالا حالات میں سے کچھ تو برقرار رہے، کچھ کی سنگینی، وقت کے ساتھ ساتھ کم یاختم ہوگئی۔ویسے بھی ہمارا خطہ اورمعاشرہ ایک سخت ترین آزمائش اور بدترین آویزش سے گزرا تھا،ظاہرہےاس کےفوری اور مابعداثرات کے تحلیل ہونے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ حالات کے قدرے اعتدال اورتوازن پرآتے ہی کاروبارحیات دوبارہ فعال ہوا۔

دیگرشعبوں کے ساتھ ساتھ اشاعت وطباعت کی دنیا بھی امنگوں اورحوصلوں کے ساتھ سرگرم عمل ہوئی۔فرق صرف یہ آیا کہ نصابی،تعلیمی اوردینی کتب زیادہ اورادبی کتب خاصی کم شائع ہونے لگیں؛ غالباًان حالات میں تجارتی احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا۔

حکومت کی جانب سے پبلک لائبریریوں کے لیے کتابوں کی خریداری بڑھنے اورتعلیمی اداروں کے کتب خانوں کو مالیاتی وانتظامی توجہ ملنے سے ادبی اشاعتوں میں اضافہ ہونے لگا۔حکومت نے فروغ اردو اورترویج ادب کے لیے محدودفنڈز اوراختیارات رکھنے والے اداروں کی داغ بیل ڈالی،تو اشاعت ادب میں خوش گوارتیزی آئی،خصوصاً کلاسیک کی طباعت نے ادبی حلقوں میں مسرت کی ایک لہردوڑا دی۔اس صورتحال میں نجی ناشران نے بھی ادبی کتب کی اشاعتوں میں اضافہ کردیا۔

اسی اثنا میں عوام بھی سیاسی ومعاشی صدمات اورجذباتی تشنج سے باہرآنے لگےتو ان کے فطری ذوق یانصابی وتعلیمی ضرورت یا پھر تفریحی تقاضوں نے انہیں سنجیدہ ادبی یانیم ادبی تحریروں کی جانب متوجہ کیا؛ یوں اشاعت ادب کی صورتحال مزید بہتر ہوئی۔ ناشراور قاری اشاعت ومطالعے کے لیےتازہ دم اورسرگرم ہوئےتو ادیب وشاعر... جو بدترین حالات میں بھی پرورش لوح وقلم حسب توفیق کرتے رہے تھے... عوامی توقعات سے زیادہ فعال ہوگئے۔

ادبی کتب کے تخلیقی معیار میں ہی نہیں،اشاعتی معیار ومقدار میں بھی اضافہ ہوااور پاکستانی طباعت ایک نئے دور میں داخل ہوگئی،

اس دور میں کتاب کا خارجی روپ بھی غیر اہم نہیں رہا۔ایک ناشر بشیر احمد چوہدری جو اس عمل میں خود بھی حصہ بنے، کہتے ہیں:

''سرورقوں اور گرد پوش کی تزئین کاری کا موڑ ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ شروع ہوا جب مکتبہ جدید، مکتبہ اردو اور نیا ادارہ نے گرد پوشوں میں تجریدی آرٹ کو خوبی سے پیش کرنا شروع کیا اور پھر بہت سے اداروں نے اس روش کو اپنا کر مستحکم کیا''۔(۳۱)

قیام پاکستان کی پہلی دہائی ہی میں اشاعت ادب کو ایک اہم، سنجیدہ اور کسی حد تک نفع بخش تجارتی سرگرمی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ادبی مطبوعات کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی جرائد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔علاوہ ازیں نیم ادبی اور تفریحی رسائل کی اشاعت بھی بڑھی۔گو رفتہ رفتہ ادب کی تمام اصناف کو طباعتی توجہ حاصل ہونے لگی لیکن جس صنف ادب نے ''مقدار'' کے حوالے سے اشاعتی فوقیت پائی وہ افسانوی ادب ہے۔

۴۷ء سے پہلے اور بعد کا سارا زمانہ اور اردو کی تمام طباعتی صورتحال پیش نظر رکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ مطبع منشی نول کشور سے لے کر سنگ میل پبلی کیشنز تک افسانوی ادب (داستان، ناول، افسانہ) کی اشاعت ہر طباعتی ادارے کے لیے قابل ترجیح اور نفع بخش رہی ہے؛ اور اگر کئی کئی جلدوں پر مشتمل داستانوں، طویل و مختصر ناولوں، سیکڑوں افسانوں کے ساتھ ساتھ کتب و رسائل میں چھپنے والی ہزاروں ''پاپولر'' کہانیوں کو سامنے رکھیں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا ''مطبوعہ لفظ'' اسلامی کتب کے علاوہ افسانوی کتب میں سب سے زیادہ پڑھا گیا (بعض علاقوں، حلقوں اور گھرانوں میں یہ تقدیم و تاخیر مختلف بھی ہو سکتی ہے۔)

افسانوی ادب نے تا حال اپنا اشاعتی تسلسل قائم رکھا ہے؛ بعض اصناف ادب کی اشاعت و طباعت میں نشیب و فراز دیکھنے میں آئے لیکن فکشن کی اشاعت ان دنوں میں بھی جاری رہی جب جدید تر افسانہ نگار اور قارئین کے درمیان ابلاغی بعد پیدا ہوگیا اور افسانے کے کئی قارئین دیگر اصناف ادب خصوصاً سفرنامے اور آپ بیتی کی طرف چلے گئے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ہمارے یہاں کوئی قابل ذکر فکشن طبع نہ ہو سکا، البتہ المیہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے خاصا اہم افسانوی ادب شائع ہوا۔۶۵ء کی جنگ کے بعد کی جذباتی فضا میں تاریخی ''اسلامی'' ناولوں کی مانگ خاصی بڑھ گئی اور متعدد ناشرین نے اپنی ساری توجہ ان کی طباعت پر صرف کر دی البتہ ناشرین کی قلیل تعداد (ناقدوں کی کثیر تعداد کی طرح) ایسی ضرور تھی جس نے مروجہ تاریخی ناولوں کو تاریخ بگاڑنے کی کاوش قرار دیا۔(۳۲)

اس عرصے میں خواتین کے لیے، خواتین کے لکھے ہوئے ناول بھی خوب مقبول ہوئے۔کچھ اداروں نے تو اپنی تمام طباعتی توجہ فقط ان ناولوں تک محدود کر دی۔متعدد ناشرین، ناول نگار خواتین سے اپنے مخصوص قارئین کے ذہنی و جذباتی تقاضوں کے مطابق ناول لکھواتے رہے۔ پاکستان میں خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کی اشاعت کا آغاز ''آئینہ ادب'' نے کیا؛ اس ادارے کے بارے میں درج ذیل

اقتباس سے مذکورہ اشاعتی رجحان کا جواز، مقصد، ہدف اور ناول نگار کے لیے ناشرانہ ہدایت کی ایک جھلک سامنے آ جاتی ہے:

> ''خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ ''آئینہ ادب'' کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان ناولوں کے باعث اس ادارے کو قارئین کا ایک نیا طبقہ مل گیا ہے... یہ ناول معاشرتی اور بامقصد ہوتے ہیں۔ ان ناولوں کا دائرہ ''تعلیم سے فراغت اور شادی سے قبل'' کے ماحول پر محیط ہوتا ہے۔ اور ان کے مطالعے سے لڑکیوں کو اپنی ازدواجی زندگی کے متوقع حالات کا علم ہو جاتا ہے اور یہ علم انہیں کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ چنانچہ ناشر کی طرف سے لکھنے والوں کو ناول کے ماحول (سے) بخوبی آگاہ کر دیا جاتا ہے''۔(۳۳)

خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں نے کاروباری طور پر اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ کچھ مرد ادیبوں نے بھی خواتین کے ناموں سے ناول لکھنے شروع کر دیئے مثلاً ایک ناشر عبدالسلام شیخ نے بتایا کہ عابدی جعفر نے عذرا جمال کے نام سے ناول لکھے۔(۳۴)

مغرب کے افسانوی ادب کے تراجم کی اشاعت کا سلسلہ تقسیم ہند سے پہلے کی طرح، بعد میں بھی خاصے زور و شور سے جاری رہا ہے لیکن بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اس رجحان میں کمی آئی ہے۔

پاکستان کے فقط چند اشاعتی اداروں کو یہ اعزاز بھی جاتا ہے کہ انھوں نے روش عام سے ہٹ کر افسانوی ادب شائع کرنے کا خطرہ بھی مول لیا؛ ان کے اس باہمت طباعتی رویے کے باعث ہی اردو کا علامتی، تجریدی اور تجرباتی افسانہ اور فلسفیانہ ناول منظر پر آ سکا۔

ترقی پسند اور مزاحمتی ادب کی اشاعت مزید طباعتی ہمت کی طلب گار تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ہمت کے حامل تھوڑے بہت ناشرین ہر دور میں اشاعتی و ادبی حلقے کو میسر رہے۔ گو انہیں بقول نذیر احمد چوہدری اپنی بہادری اور وابستگی کی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔(۳۵)

اس عرصے میں کلاسیکی فکشن کی اشاعت یا تو سرکاری اداروں (خصوصاً مجلس ترقی ادب) کی ذمہ داری رہی یا گنتی کے چند ناشر بہتر تدوین اور مناسب طباعت کے ساتھ انہیں سامنے لاتے رہے؛ عموماً نصابی ضروریات پوری کرنے کے لیے معمولی کاغذ اور سستی طباعت کی حامل اور اغلاط سے پر کلاسیکی کتب منظر پر چھائی رہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اس حوالے سے ایک بڑی طباعتی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ متعدد نجی ناشران نے قدیم افسانوی ادب پر مشتمل ضخیم، خوبصورت اور مہنگی کتب شائع کرنی شروع کر دیں۔ کلاسیکی افسانے ہی نہیں، ناول بھی بصورت کلیات شائع ہونے لگے، منتخب افسانوں پر مشتمل مجموعوں کی اشاعت گو ہر دور میں ہوتی رہی لیکن مذکورہ بالا دہائیوں میں ضخیم تر افسانوی انتخابات منظر عام پر آئے۔ پرانی نایاب کتب کے عکسی ایڈیشن بھی خاصی تعداد میں طبع ہوئے۔

پرانی کتب کی اشاعت نو کے اس رواج کو عمومی طور پر سراہا گیا اور نایاب کتب کی دستیابی کو خوش آئند قرار دیا گیا لیکن ان کتابوں کی قیمتوں کے حوالے سے عوامی اور ادبی حلقوں میں خاصی نکتہ چینی بھی ہوئی البتہ ناشرین نے قیمتوں کو مناسب اور کلیات، ضخیم مجموعوں، قدیم کتابوں کے عکسی ایڈیشنوں کی اشاعت کو ایک اہم ادبی خدمت قرار دیا۔ مثلاً متعدد نادر و نایاب کتابوں کے Reprints شائع کرنے والے سنگ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد کہتے ہیں: ''پرانی کتابوں کے ری پرنٹس دانش وروں اور محققین کے لیے بہت فائدہ مند ہوتے ہیں... ہمارے ادارے نے ایسی بہت سی کتابوں کے ری پرنٹ شائع کیے ہیں جو عام لوگوں کی دسترس میں نہیں تھیں''۔(۳۶)
کچھ ادبی حلقوں کی جانب سے قدیم کتابوں کی اشاعتوں میں یکا یک تیزی آ جانے کے دیگر محرکات بھی منکشف کیے گئے ہیں، مثلاً:

> ''کئی اشاعتی ادارے پرانے نام زندہ رکھنے کے لیے اُن کی کتب شائع کر رہے ہیں۔ یہ ایک قابل ستائش اقدام ہے۔ اس اچھے کام کا مخفی پہلو یہ ہے کہ رائلٹی کسی کو نہیں جاتی۔ بعض حالات میں رائلٹی ایکٹ کی آڑ میں کوئی حق دار نہیں بنتا اور کبھی رائلٹی وصول کرنے والا ہی کوئی نہیں ہوتا۔ یہ کتب اپنے ادبی مقام کے باوجود لاوارث ہوتی ہیں اور ناشر کے لیے بلا شرکت غیرے آمدنی کا ذریعہ''۔(۳۷)

قدیم و ضخیم افسانوی کتب، کلیات، انتخابات (رائلٹی ادا نہ کرنے کے باوجود) اشاعتی تاریخ کی مہنگی مطبوعات ثابت ہوئیں، قارئین کی اکثریت انہیں خریدنے سے معذور رہی، ان کے حصول کے لیے لائبریریوں سے رجوع کیا گیا تو وہاں بھی قارئین (اراکین کتب خانہ) کے لیے صورتحال کچھ زیادہ خوش آئند نہ تھی کیونکہ اکثر لائبریریاں خصوصاً تعلیمی اداروں کے کتب خانے مہنگی کتابوں کو ''ریفرنس بک'' قرار دے کر اراکین کو یہ کتب جاری کرنے اور گھر لے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔(۳۸) اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم افسانوی ادب کی کتب موجود و محفوظ ہیں لیکن قاری کی دسترس سے باہر ہیں۔

افسانوی ادب کو اپنی نمود کے لیے مطبوعات کے ساتھ ساتھ جرائد و رسائل کی وسیع دنیا بھی میسر آئی؛ بعض رسائل میں تو افسانوی ادب کی نسبت دیگر اصناف ادب کا حصہ کم یا برائے نام رہا۔ ڈائجسٹ کے نام سے شائع ہونے والے رسائل تو فکشن کی اشاعت سے ہی مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان ڈائجسٹ رسائل نے عام قارئین کو کئی دہائیوں سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے؛ ''یہ رسالے بعض اوقات تو ڈیڑھ دو لاکھ کی تعداد میں بھی چھپ جاتے ہیں... ان کی ترسیل انہی ذرائع سے ہوتی ہے جن ذرائع سے روزنامہ اخبارات قارئین تک پہنچتے ہیں''۔(۳۹) ان ڈائجسٹوں میں شائع شدہ فکشن کو عموماً ''پاپولر ادب'' کے زمرے میں ہی رکھا جاتا ہے۔ البتہ بعض ڈائجسٹ رسائل میں اردو کے معتبر افسانہ نگاروں کے طبع زاد اور مغربی افسانہ نگاروں کے تراجم بھی دیکھنے میں آتے ہیں جسے ان رسائل کی پہلی خوبی قرار دیا جا سکتا ہے، دوسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عام قارئین کی عادت مطالعہ برقرار رکھنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول رفیق سندیلوی:

''ڈائجسٹوں کو چاہے ادب کے زمرے سے کلی طور پر خارج کر دیا جائے اور اس کے خلاف جو
کچھ بھی کہا جائے، تاہم اتنا ضرور ماننا ہوگا کہ ڈائجسٹ ایک خاص وقت، ایک خاص ماحول اور
ایک خاص معاشرے کی مانگ ضرور پوری کر رہے ہیں''۔(۴۰)

اردو دنیا میں آغا حشر کا ڈراما دیکھا گیا اور امتیاز علی تاج کا ڈراما پڑھا گیا۔ آغا حشر کے ڈراموں کی طباعت عام قرأت کے لیے کم اور نصابی ضرورت کے لیے زیادہ ہوئی۔ امتیاز علی تاج کا شاہ کار ڈراما ''انارکلی'' اپنی مکمل صورت میں سٹیج نہ ہو سکا لیکن اشاعت و قرأت اور شہرت و مقبولیت کے حوالے سے کوئی اور اردو ڈراما اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

حشر و تاج کے علاوہ دیگر ڈراما نگاروں کے سٹیج، ''کتاب'' اور ریڈیو کے لیے لکھے ہوئے ڈراموں کے مجموعے شائع ہوئے لیکن ان کا حلقہ قرأت محدود رہا لہٰذا ڈراموں کی اشاعت آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ گئی۔ ڈرامے کی اشاعتی نشاۃ ثانیہ ٹیلی ویژن ایسے غیر اشاعتی ادارے کے باعث ہوئی۔

گو ۱۹۶۷ء میں ابصار عبدالعلی کے مجموعے ''شہ رگ'' سے ٹیلی ویژن ڈرامے کی باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی تھی لیکن چند سالوں تک اسے ناشرین و قارئین کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات پھیلنے اور ٹی وی ڈرامے کی مقبولیت بڑھنے سے مطبوعہ ٹیلی ڈراموں کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹیلی ڈراموں کی طباعتی ریل پیل کے باوجود ادبی حوالے سے غیر معیاری ڈراموں کی اشاعت ایک عرصے تک بہت کم رہی لیکن پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات کے معیار اور اقدار میں فرق آتے ہی سطحی ٹیلی ڈراموں کی طباعت بھی بڑھ گئی۔ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ ٹیلی ڈراموں کو قارئین تو میسر آئے لیکن کسی اور نثری و شعری صنف کے مقابلے میں ان کی تعداد خاصی کم رہی؛ البتہ ناشرین کو ٹیلی ڈراموں کے ضخیم مجموعے لائبریریوں تک پہنچانے میں آسانی رہی کیونکہ عموماً تمام ڈراما نگار ادبی حوالے سے معروف اور تمام ڈرامے بذریعہ ٹیلی ویژن مقبول ہو چکے تھے۔

افسانوی نثر کے بعد شعری کتب کی طباعت کو مقبول عام اشاعتی رجحان قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہماری تہذیب میں شاعری کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی شعر: مشاعرے اور مطبوعات دونوں وسیلوں سے اہل ذوق تک پہنچ رہا ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد شعری کتب کی اشاعت میں نمایاں کمی آئی لیکن پہلی دہائی (۴۷ء سے ۵۷ء) میں ہی صورتحال بہتر ہو گئی۔ روایتی غزلوں کے مجموعوں کے ساتھ ساتھ رومانی، قومی، انقلابی نظموں کے مجموعے بھی زیور طبع سے آراستہ ہونے لگے۔ مرثیے نے بھی ہر دور میں طباعتی توجہ حاصل کی لیکن دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں اس کے قارئین کی تعداد محدود اور مخصوص رہی۔ غزلوں کی طباعت (خواہ غزلیں روایتی لہجے میں ہوں یا جدید) تب سے آج تک مقبول اشاعتی رویہ اور محفوظ کاروباری راستہ ہے؛ جبکہ نظموں کی اشاعت میں قارئین کی بڑھتی گھٹتی طلب کے مطابق رسد قائم رکھی جاتی ہے؛ البتہ جن شعری مجموعوں میں نظموں کے ساتھ غزلیں بھی شامل ہو جاتی ہیں،

ان کا بارِ اشاعت بہ خوشی اٹھالیا جاتا ہے۔اس کے باوجود پابند نظمیں ہی نہیں، آزاد نظمیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔علاوہ ازیں اس نوعیت کے اشاعتی واقعات بھی ہمارے ادبی حافظے کا حصہ ہیں کہ ''معروف'' شاعروں کو لسانی تشکیلات کی حامل نامانوس شاعری شائع کرانے کے لیے بھی ناشر مل گئے لیکن کم معروف اور مارکیٹ کے نقطہ نظر سے غیر اہم شاعروں کو اپنی اعلیٰ شاعری شائع کرانے کے لیے بھی طویل انتظار کرنا پڑا؛ بعض اوقات تو یہ انتظار بھی بے ثمر رہا۔

پاکستان میں کلام غالب و اقبال کی طباعت کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ایک بڑے عرصے تک تو کلام اقبال صرف ایک ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ہی شائع کیا لیکن اشاعتی حقوق کی مدت ختم ہو جانے پر دیگر (سرکاری و نجی) اشاعتی اداروں نے بھی کلام اقبال کو نئی وضع قطع سے طبع کرنے کا سلسلہ شروع کیا؛ البتہ کلام غالب ہر ادبی ناشر کے اشاعتی ایجنڈے میں ہمیشہ شامل رہا ہے۔

کلاسیکی شعرا کے دواوین و کلیات کی بہترین اشاعتیں عموماً سرکاری اداروں کے زیر اہتمام ہوئیں لیکن بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں نجی ناشرین کی جانب سے کلاسیکی شعرا کے ضخیم کلیات کے نئے یا عکسی ایڈیشن شائع کرنے کا رواج زور پکڑ گیا۔اس رواج کو بھی (افسانوی کلیات و انتخابات کی طرح) خوش آئند قرار دیا گیا لیکن ان کتب کی قیمتیں ضرورت سے زیادہ رکھے جانے پر خاصی تنقید ہوئی؛ جس کا ناشرین پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو میں شعری تراجم پر (افسانوی تراجم کی نسبت) توجہ کم رہی ہے؛ اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن ان میں سے ایک: ناشرین کا شعری تراجم کو منافع بخش نہ سمجھنے کا رویہ بھی ہے۔

پاکستان میں اردو کی مزاحیہ شاعری کو شاعر بھی کم ملے اور ناشر بھی؛ البتہ کچھ عرصے سے مزاحیہ مشاعروں کے انعقاد اور مزاحیہ شعری مجموعوں کی اشاعت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

اشاعت ادب سے وابستہ طباعتی ادارے گو ایک تسلسل سے شعری مجموعے چھاپتے رہے ہیں لیکن گذشتہ پچیس سالوں سے مختلف وجوہات کی بنا پر متعدد شاعروں کو اپنے مجموعہ ہائے کلام خود شائع کرنے پڑے یا ناشر کو رقم دے کر چھپوانے پڑے؛ عموماً شاعروں کو اپنے کلام کا ناشر بننے سے نقصان ہی اٹھانا پڑا۔(۴۱)

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے عام فہم، کم معیاری اور نو بالغوں کے ذہن و ذوق کے مطابق لیکن خوبصورت طباعت کے حامل شعری مجموعے سامنے آنے لگے ہیں۔اس رواج نے رنگ برنگی، چمکیلی اور نظروں کو بھاتی شعری کتابوں کو ہر سو پھیلانے کے باوجود اشاعت سخن کے منظر کو کثافت سے بھر دیا ہے؛ دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ان کتابوں سے شاعری کا معیار اور قاری کا ذوق دونوں نشیب کی طرف جا رہے ہیں۔اس طباعتی رجحان میں منافع کی بلند سطح دیکھ کر کئی نئے شاعر خود ناشر بن گئے اور کئی نئے ناشر، شاعر بھی ہو گئے۔اس صورتحال میں ''اصلی'' شاعر اور ''حقیقی'' ناشر کے درمیان پہلے سے موجود بُعد مزید بڑھ گیا۔یہ تناظر فی الحال قائم ہے اور شاعری کے مستقبل

کے حوالے سے کئی پریشان کن سوالات اُٹھا رہا ہے۔

پاکستان کی پہلی دہائی میں دیگر نثری اصناف.... سفر نامہ، طنز و مزاح، خودنوشت سوانح، مکاتیب وغیرہ.... کی اشاعتیں شاعری اورافسانوی ادب کی نسبت مقدار میں کم رہیں البتہ معیار سب کا بہتر رہا۔ معیار کے قائم رہنے کی بڑی وجہ مذکورہ اصناف کے باذوق و باشعور قارئین ہیں۔ افسانوی و شعری ادب، اشاعتی کاروبار کی ضرورتوں کے نام پر کم معیاری بلکہ غیر معیاری بھی شائع ہوا لیکن مذکورہ نثری اصناف کے پاس اس زمانے میں عامیانہ مذاق کی تسکین اور بد مذاق کاروبار کی تقویت کے لیے کچھ نہ تھا۔ گو آگے چل کر کسی حد تک یہ تفریق ختم ہوگئی؛ مثلاً اچھے سفر ناموں اور معیاری طنزیہ ومزاحیہ نثر کی طباعت کے ساتھ ساتھ نامعتبر سفر نامے اور ناشائستہ طنز و مزاح بھی اشاعتی کارگزاری کا حصہ بنتے چلے گئے۔ (اور اس کے جواز میں وہی دو لفظی ترکیب دھرائی جاتی رہی جو ہمارے یہاں ناشر سے لے کر فلم ساز تک سب کی نوک زباں پر ہے یعنی پبلک ڈیمانڈ)

تقسیم ہند سے پہلے اور قیام پاکستان کی پہلی دہائی تک سفر نامہ خال خال ہی شائع ہوتا تھا لیکن بعدازاں اس نے تخلیقی نثر کی دنیا میں بتدریج طباعتی فوقیت حاصل کر لی۔ سفر نامے کی اشاعتوں میں اضافے کی دو بڑی وجوہات ہیں: قارئین دنیا کے مختلف خطوں اور ثقافتوں کو جاننا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے تاریخ، جغرافیہ اور ثقافت کی تکنیکی، ثقیل اور غیر دلچسپ کتابوں کے بجائے دلچسپ اور ادبی جمالیات سے آراستہ کتابوں کے طلب گار تھے۔ دوسری وجہ وہ صورتحال تھی جو افسانوی ادب سے کہانی کا عنصر کم یا ختم ہونے سے پیدا ہوئی اور (قارئین کے نقطہ نظر سے) علامت و تجرید کے عناصر و اسلوب کا غلبہ بڑھنے سے تشویش ناک ہوگئی۔ لہٰذا افسانوی ادب کے قارئین و ناشرین سفر نامے کی طرف بتدریج ''نقل مکانی'' کرنے لگے۔ اکثر سفر نامہ نگاروں نے ''طلب'' کو سمجھتے ہوئے اپنی ''رسد'' یعنی سفر نامے میں فکشن، طنز و مزاح اور شعری اسلوب کی مقدار ''بقدر ذوق و ظرف'' بڑھا دی۔ یوں سفر نامہ عمومی طور پر ماضی کے سفر نامے سے مواد، پیش کش اور اسلوب میں مختلف ہوگیا۔ آج کا سفر نامہ عام قارئین کے ذہنی و جذباتی تقاضوں اور ناشرین کی تجارتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ لکھاری کی معیشت کو بھی بہ آسانی سہارا دیئے ہوئے ہے۔

ادبی تنقید نے سفر ناموں کی اشاعت کو تین طرح سے دیکھا ہے: اعلیٰ پائے کے سفر ناموں کی تحسین کی گئی ہے، افسانوی و تخلیاتی عناصر کی کارفرمائی کے حامل سفر ناموں کو کچھ ناقدین نے سراہا اور زیادہ نے رد کیا ہے، ادبی حوالے سے غیر معیاری اور معاشرتی زاویے سے غیر اخلاقی سفر ناموں (یا اُن کے چند حصوں) کی ہر جانب سے مذمت کی گئی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد طنز و مزاح کی اشاعت میں کمی آئی؛ قارئین و ناشرین کی توجہ افسانوی اور کسی حد تک شعری ادب کی جانب مبذول رہی۔ تقسیم ہند کے اثرات کے غلبے نے عوام کی خوش طبعی اور ادیب کی خوش فکری کو کچھ عرصے معطل کیے رکھا؛ آہستہ آہستہ حالات کا اعتدال اور عوام کا اطمینان پلٹا تو زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کی بہار بھی لوٹ آئی۔

طنزیہ ومزاحیہ نثر پہلی دو دہائیوں میں مقدار میں کم لیکن معیار میں خوب رہی۔ گوشروع میں طنز کی کارفرمائی کچھ زیادہ تھی لیکن بعدازاں مزاح نے پیش رفت کی تو طنز بھی مائل بہ اعتدال ہوئی، بلکہ بعض مقامات پر تو اس کی کاٹ کند ہوکر رہ گئی۔ مزاح کی اس کارکردگی سے،اس کی اشاعت وقرأت میں بے حد اضافہ ہوا۔

اگلی تین دہائیوں میں طنز ومزاح نے قابل توجہ اشاعتی پیش قدمی کی۔ اس حوالے سے عموماً تین طرح کی طباعتیں سامنے آئیں: الف۔ اعلیٰ ادبی سطح کے حامل طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے مختصر وضخیم مجموعے طبع ہوئے۔ ب۔ ایسے ناول، افسانے، سفرنامے، خاکے شائع ہوئے جو طنز ومزاح کی چاشنی یا نمکینی لیے ہوئے تھے۔ ج۔ طنز ومزاح کی بنیاد پر مقبولیت پانے والے اخباری کالم، ریڈیو فیچر اور ٹیلی ڈراموں کے مجموعے طبع ہوئے۔

اس عرصے میں طنز ومزاح کی مقدار (اور مارکیٹ) بڑھنے سے معیار کے حوالے سے مسائل پیدا ہوئے اور شائستہ وشستہ طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ اخلاقی وادبی اقدار و جمالیات سے تہی دست طنز ومزاح بھی اشاعت وقرأت کی دنیا میں رواج پا گیا؛ اب تو موخرالذکر، اول الذکر سے آگے بڑھ رہا ہے۔

قدیم وجدید طنزیہ ومزاحیہ ادب کے انتخابات شائع ہونے کا رجحان بھی خاصا رہا ہے لیکن کوئی مثالی، مقبول عام اور حقیقی انتخاب شائع نہ ہوسکا۔ کچھ عرصے سے اہم مزاح نگاروں کے ساتھ ساتھ ''پاپولر'' مزاح نگاروں کی کلیات طبع ہونے کا رواج بھی زور پکڑ رہا ہے لیکن عموماً ضخیم کلیات کے مہنگے اور ''ڈیلکس'' ایڈیشن قارئین کے بجائے سرکاری لائبریریوں کو ہدف بنا کر شائع کیے جارہے ہیں۔

اردو میں سوانح کی اشاعت کا جو سلسلہ ''حیاتِ سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' سے شروع ہوا تھا وہ زیادہ تیزی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ عموماً سوانحی ادب کی حامل اچھی اور اہم کتاب ایک بڑے وقفے کے بعد ہی شائع ہوتی تھی؛ قیام پاکستان کے بعد بھی اس صورتحال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی؛ البتہ مختلف ادبی شخصیات کے احوال وآثار پر مبنی ایسے تحقیقی مقالات ضرور طبع ہوتے رہے، جن میں ایک باب شخصیت کی سوانح وسیرت پر مشتمل ہوتا تھا۔ مکمل سوانحی کتب، ہماری مجموعی اشاعتی کارگزاری میں کم ہیں حالانکہ اس صنف کو قارئین میسر ہیں۔

خودنوشت سوانح کا اشاعتی رواج بھی محدود رہا البتہ ''یادوں کی بارات'' سے صورت حال تبدیل ہوئی، ''جہانِ دانش'' سے مزید بہتر ہوئی اور ''شہاب نامہ'' سے یکسر بدل گئی۔ ''شہاب نامہ'' ایک بڑا اشاعتی واقعہ ثابت ہوا (خصوصاً اپنے ناشر کے لیے)

گذشتہ سالوں میں نہایت معتبر خودنوشتیں سامنے آئی ہیں۔ لحہ موجود میں خودنوشت سوانح فقط ادیب ہی نہیں لکھ رہے، بلکہ سیاسی و عوامی شخصیات، فوجی حکمران اور کاروباری افراد بھی اپنی زندگی کے نقش محفوظ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ خودنوشت سوانح کی مقبولیت سے ادبی ناشرین کے ساتھ ساتھ اردو نثر کو بھی تقویت حاصل ہوئی ہے اور اردو مطبوعات کو ایسے قارئین بھی میسر آئے ہیں جو دیگر اصناف

ادب مثلاً ناول، افسانہ، شاعری وغیرہ کا عموماً مطالعہ نہیں کرتے۔ اس بات کا امکان روشن ہے کہ آنے والا دور آپ بیتی کا دور کہلائے۔

معروف ادیبوں کے مکاتیب ان کی زندگی میں یا انتقال کے بعد چھپنے کا سلسلہ جاری رہا ہے لیکن اس ضمن میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا مجموعہ ''خطوطِ غالب'' ہی ثابت ہوا۔ اس کے بعد ابوالکلام آزاد اور اقبال کے خطوط، اشاعت وقرأت کی دنیا میں نمایاں رہے۔ دیگر اہم ادبا کے خطوط تخلیق کار، نقاد اور دیگر علمی شعبوں سے وابستہ افراد تو ذوق وشوق اور تجسس کے ساتھ پڑھتے رہے لیکن قارئین ادب کی دلچسپی ان میں کم ہی رہی؛ البتہ خطوط کی ایک کتاب: ''حرف آشنا'' از صفیہ اختر کسی ناول کی طرح مقبول چلی آ رہی ہے۔ سو اس تناظر کے باعث ناشرین نے مکاتیب کے مجموعے شائع کرنے میں اس جوش کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی یہ اہم صنف ادب مستحق تھی۔

آزادی سے قبل اردو خاکہ نگاری کا اثاثہ: فرحت اللہ بیگ کے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' اور عصمت چغتائی کے ''دوزخی'' پر ہی مشتمل تھا۔ بقول انور سدید ''خاکہ نگاری کو زیادہ فروغ آزادی کے بعد ملا'' (۴۲) خاکے ادبی مجلّوں میں تواتر سے شائع ہوتے رہے البتہ خاکوں پر مشتمل مجموعے آہستہ روی سے سامنے آئے۔ گذشتہ بیس سالوں میں مزاحیہ اور تحلیل نفسی کے حامل خاکوں کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

انشائی عناصر کی حامل تحریریں تو قیام پاکستان سے قبل بھی اردو ادب میں نمایاں تھیں لیکن انشائیہ بطور صنف متعارف اور مروج پاکستان میں ہی ہوا۔ گو اس کے قارئین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن اسے دیگر نثری اصناف (مثلاً ناول، افسانہ، سفرنامہ اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین) کی طرح اشاعتی اہمیت کم حاصل ہوئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ: دلچسپ، رنگا رنگ، پرلطف اور صاحب فکر و جمال ہونے کے باوجود چند تنقیدی حلقوں اور رویوں کے باعث متنازع ہو گیا یا کر دیا گیا۔ اشاعتی سرد مہری کے باوجود انشائیوں کے مجموعے اور انشائیوں کے انتخاب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مختلف سرکاری اور نجی اشاعتی اداروں سے طبع ہوتے رہے اور اہل ذوق پر اس صنف کی قوت، تازگی اور کشادہ فکری آشکار کرتے رہے۔

ادب دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ فکری اختلافات یا ذاتی تحفظات کے سبب کسی بھی صنف ادب یا رجحان ادب کی اشاعت وترویج میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور قاری و ناقد تک تمام معاصر تخلیقی مواد مطبوعہ صورت میں بغیر کسی تعطل کے پہنچتا رہے تاکہ وہ اس صنف یا رجحان کے حیثیت ومعیار کا فیصلہ آسانی اور انصاف سے کر سکیں۔

اردو ادب کے تخلیقی جہان ہی نہیں، تحقیقی وتنقیدی آفاق بھی وسعت پذیر ہیں۔ جیسا کہ مطالعاتی رجحانات کے ضمن میں پہلے بھی ذکر ہوا کہ تحقیقی وتنقیدی کتب کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ اسے صرف ادیب، نقاد اور ادب کے طلبہ ہی پڑھتے ہیں، ان کتب کو باذوق قارئین کا ایک مخصوص حلقہ ہمیشہ میسر رہا ہے۔ ادبی تخلیقات وشخصیات کو زیادہ گہرائی سے جاننے کے لیے سنجیدہ قارئین تحقیقی وتنقیدی کتب سے ضرور رجوع کرتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ تحقیقی وتنقیدی اشاعتیں مقدار ومعیار میں افسانوی وشعری کتب کے بعد شمار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم

اختر کے نزدیک تو تنقید کی مقبولیت شعروافسانہ سے بھی زیادہ ہے(۴۳)(ڈاکٹر سلیم اختر نے ۱۹۷۳ء میں تنقید اور تاریخ ادب کی کتابیات مرتب کی تو تحقیقی وتنقیدی کتب کی تعداداور موضوعاتی تنوع کو دیگر اصناف سے بہتر پایا(۴۴))

پاکستان میں تحقیقی وتنقیدی کتب کی اشاعتیں سرکاری اور نجی اشاعتی اداروں کی جانب سے ایک تسلسل سے سامنے آتی رہی ہیں۔ ہمارے ایسے ممالک میں تجارتی حوالے سے غیر منافع بخش علمی وادبی منصوبے عموماً سرکاری اداروں کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچائے جاتے ہیں یا پہنچانے کی خواہش رکھی جاتی ہے۔ پاکستان کے سرکاری علمی وادبی اداروں نے اس سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اوران کے ذریعے اہم، سنجیدہ اور معتبر تحقیقی وتنقیدی کتب طبع ہوئی ہیں (اوران کی قیمتیں بھی مناسب ہی قرار پائی ہیں) لیکن ان اداروں کی کاوشوں کو دو منفی رویوں: مسودوں کے انتخاب میں اقربا پروری اور مطبوعات کی فروخت وترویج میں تساہل سے نقصان پہنچا ہے جس کا فائدہ نجی اشاعتی اداروں نے اُٹھایا ہے۔

نجی اشاعتی اداروں نے تخلیقی کتب کے ساتھ ساتھ تحقیقی وتنقیدی کتب کی طباعت کو بھی اپنے تجارتی مفاد میں پایا اور تحقیقی وتنقیدی کتب کی اشاعت میں (کم از کم) مقدار اور پھیلاؤ کے حوالے سے سرکاری اداروں پر فوقیت حاصل کر لی۔ معیار کے حوالے سے تین طرح کے اشاعتی رویے سامنے آئے: (الف) اعلیٰ معیار کی مستند تحقیقی وتنقیدی کتب طبع ہوئیں اور پرانی کتابوں کی اشاعت نو ہوئی۔ (ب) طلبہ کی نصابی ضرورت یا کچھ ناقدوں کی عجلت وتساہل پسندی کے باعث سطحی نوعیت کی تحقیقی وتنقیدی کتابیں بھی ہر دور میں سامنے آئیں۔ (ج) ناشرین، ناقدین سے (اپنے تجارتی مفاد کے مطابق) تنقیدی موضوعات اور کتاب کے اسلوب وانداز کے بارے میں اپنی تجاویز سے ہم آہنگ کام کراتے رہے۔

اردو تحقیق وتنقید کے دو روشن ترین شعبے غالبیات اور اقبالیات ہیں۔ دونوں شعبوں میں سرکاری ونجی اشاعتی اداروں کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ سرکاری ادارے (خصوصاً بزم اقبال اور اقبال اکادمی) علامہ اقبال کے حوالے سے اہم کتب ادبی منظر پر لانے میں کامیاب رہے (لیکن منظر عام پر اپنی کمزور ''مارکیٹنگ'' کے باعث نہ لا سکے) ان اداروں کی موجودگی اور اشاعتی کارکردگی کے باوجود نجی ناشرین کی علامہ اقبال میں اشاعتی وتجارتی دلچسپی کم نہ ہوئی۔ اس دلچسپی کی دو نمایاں وجوہات ہیں: (الف) اقبال پر تحقیقی وتنقیدی کام خاصی بڑی مقدار میں ہوتا رہا ہے۔ (ب) اقبال پر ہر چھوٹی بڑی اور اچھی یا معمولی تحقیقی وتنقیدی کتاب تجارتی حوالے سے بے حد مفید ثابت ہوئی ہے۔

غالبیات کا شعبہ بھی تخلیقی اور طباعتی حوالے سے پُر رونق ثابت ہوا ہے۔ نجی ناشرین کے لیے غالب واقبال پر شائع کردہ کتب کو سرکاری لائبریریوں تک بغیر کسی مناسب تشہیر وتجزیے کے پہنچانا ہمیشہ ایک آسان کام رہا ہے، ان دونوں شعبوں میں ناشرین کی دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

گذشتہ تین دہائیوں میں نئے عالمی فکری رجحانات اور نئی مغربی تنقید سے متاثر اردو کتب شائع ہونے کا سلسلہ بتدریج بڑھا ہے

لیکن تنقیدی تراجم کی جانب توجہ کم رہی ہے۔ انگریزی ادب کے وسیع المطالعہ ناقدین کی ایک مناسب تعداد کے باوجود، مغرب کی اہم تنقیدی کتب کے تراجم (مکمل صورت میں) نہ ہونا تعجب خیز ہے۔ خصوصاً سرکاری علمی و ادبی اداروں کو اس سلسلے میں فعال کردار ادا کرنا چاہیے تھا لیکن ان کا رویہ اس حوالے سے ''خنک'' ہی رہا ہے۔

اردو کے علمی و ادبی مجلّے قیام پاکستان سے پہلے بھی اہمیت کے حامل تھے۔ ۴۷ء کے بعد ان کی تعداد و اشاعت میں آہستہ روی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ مختلف مجلّے، ضخیم خاص نمبر بھی شائع کرنے لگے جنہیں تحقیقی و تنقیدی حوالے سے دستاویزی حیثیت حاصل ہوئی۔ خاص نمبروں کے رواج کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ عام نمبر نکلنا کم یا ختم ہو گئے۔ متعدد مجلّوں کی اشاعت میں باقاعدگی قائم نہ رہ سکی لیکن بے قاعدگی کے باوجود ادبی حلقے اور مخصوص قارئین ان کے منتظر ضرور رہتے تھے۔ عام قارئین کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ان ضخیم مجلّوں اور خاص نمبروں کی بلند علمی و ادبی سطح سے متوسط درجے کا قاری اور مغربی ادب سے ناواقف پوری طرح مستفید نہیں ہو پاتا۔ (۴۵) ضرورت اس امر کی تھی کہ متوسط درجے کے قاری اور ادب کے طلبہ کے لیے بھی علمی و ادبی مجلّے جاری کیے جاتے تا کہ وہ بھی نئے ادب کے منظروں اور موسموں سے پوری طرح واقف ہوتے اور ادب سے ان کے تعلق کو تقویت ملتی رہتی۔ خصوصاً سرکاری اشاعتی اداروں کو اس حوالے سے ضرور کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔

مطالعہ ادب اور اشاعت ادب کے رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد دیگر اشاعتی مسائل و امور پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اشاعتی اداروں کے مسائل کا سب سے بڑا سبب کتابی صنعت سے حکومت کی سرد مہری ہے۔ کسی بھی حکومت کی جانب سے کتابی صنعت کے مسائل اور اشاعت کتب کے فروغ کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ ناشرین کتب کو کاغذ کی فراہمی کے لیے نہ تو مقامی صنعت کو بہتر بنایا گیا اور نہ ہی درآمدی کاغذ پر ڈیوٹی میں کمی کی گئی (۴۶) حکومت نے بڑی چھوٹی صنعتوں اور دیگر کاموں کے لیے قرضے فراہم کیے لیکن تجارت کتب کو یہ سہولت نہیں دی گئی (۴۷) دیگر طباعتی ساز و سامان کو مہنگا ہونے سے روکنے کی کوئی ٹھوس پالیسی نہیں بنائی گئی، اشاعتی اداروں کو ڈاک کے اخراجات میں کوئی رعایت نہیں دی گئی۔ (۴۸) سرکاری ذرائع ابلاغ کو کتابوں کے فروغ اور مطالعے کی ترویج کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن اس اہم معاملے سے بے اعتنائی برتی گئی۔ (۴۹) حکومتی سطح پر ۱۹۷۲ء کو عالمی سال کتاب کے طور پر منایا گیا لیکن اس سال یا اس کے بعد بھی فروغ کتاب کے لیے ٹھوس اقدام نہ ہو سکے۔ جعلی کتابوں کی اشاعت نہیں روکی گئی؛ محکمہ ڈاک کی طرف سے پوسٹ بکس نمبر کے استعمال سے جعلی کتابوں کے کاروبار کو خوب فروغ حاصل ہوتا رہا۔ (۵۰) طباعت و اشاعت کو کاروبار کے بجائے صنعت قرار دینے کا مطالبہ قیام پاکستان سے چلا آ رہا ہے لیکن اعلانات کے باوجود اس مطالبے پر پوری طرح عمل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح سرکاری لائبریریوں کا خریداری کا نظام گزشتہ ساٹھ سالوں سے قابل اصلاح چلا آ رہا ہے لیکن اس جانب توجہ نہیں دی گئی۔ عام سکولوں اور کالجوں کی لائبریریاں جن پر آئندہ کے فکری ارتقا کا دارومدار ہے، انتہائی زبوں حالی کا نقشہ پیش کر رہی ہیں؛ ان میں سہولیات

اور معیاری کتب کم ہیں' اور کتابوں کی خریداری کے معاملے میں بدعنوانی اور بے توجہی عام ہے؛ اس صورتحال کی ایک جھلک اشاعتی ادارے ''التحریر'' کے بانی خالد سیف اللہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:

> ''زیادہ کمیشن کے معاملے میں ناشرین بے چارے بے بس ہو چکے ہیں' کیونکہ سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لیے کتابیں خریدنے کے لیے جب ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل آتے ہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کمیشن کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ناشرین بھی ایسے گاہکوں کو خوب پہچانتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ صاحب' کتابیں ہماری پسند کی خریدیئے اور کمیشن اپنی مرضی کا لیجئے۔ آپ خود ہی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ایسی سودے بازی میں لائبریری کے لیے کیسی کتابیں جا سکتی ہیں۔(۵۱)

پاکستان کے مخصوص سیاسی وحکومتی تناظر میں آزادی اظہار پر پابندی انتظامی بندوبست کا ایک معمول بن چکا ہے، جس کے نتیجے میں تحقیق ہماری تہذیب اور صداقت ہمارے مزاج کا قابل فخر حصہ نہیں بن سکے ہیں۔ آزادی اظہار پر پابندی سے ادب کے تخلیقی اور طباعتی دونوں عمل متاثر ہوتے رہے ہیں۔ تخلیق کاروں کی طرح ناشروں نے بھی حکومتی جبر، قید وبند اور مالی نقصانات برداشت کیے ہیں۔(۵۲)

کتابی دنیا کو حکومتی دباؤ اور سرد مہری کے ساتھ ساتھ معاشرتی بے اعتنائی کا بھی ہمیشہ سے سامنا رہا ہے۔

ناشرین کے نزدیک معاشرے کی اکثریت نے کتاب کو کبھی ضروریات زندگی میں شمار نہیں کیا۔(۵۳) معاشرے کا مالدار طبقہ کتابیں، پڑھنے کے لیے کم اور خود نمائی کے لیے زیادہ خریدتا ہے(۵۴) صاحب اقتدار افراد بقول ایک معروف ناشر کے کتاب خریدنے کے بجائے اسے ''ہدیتہً'' وصول کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔(۵۵) صاحب ذوق قارئین کی اکثریت کا تعلق متوسط طبقے سے ہے(۵۶) اور ان کی قوت خرید روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ فروغ مطالعہ کی راہ میں ایک رکاوٹ کتابوں کی قیمتیں بھی ہیں۔ حکومتی سرپرستی نہ ملنے اور حصول زر کی معاشرتی دوڑ میں شامل ہونے کے باعث اشاعتی ادارے بتدریج اپنی کتابوں کی قیمتیں بڑھاتے چلے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ناشر عبدالحمید چودھری نے یہ موقف اختیار کیا کہ کتاب کی قیمت نہیں بڑھ رہی، روپے کی قدر کم ہو رہی ہے۔(۵۷) سنگ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد کا کہنا ہے کہ اہل وطن لذت کام ودھن پر ہزاروں روپے اڑا سکتے ہیں لیکن دل ودماغ کی پرورش کے لیے کتاب خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔(۵۸) کتاب کی زائد قیمت کا باعث عمومی مہنگائی خصوصاً کاغذ اور دیگر طباعتی اشیاء کا گراں تر ہونا ہے۔ اس کے برعکس باذوق لیکن کم وسائل قارئین کا اصرار ہے کہ ناشر اپنے زائد منافع کے لیے انہیں کتاب سے دور ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ درمیانی راہ کے طور پر ایک معقول تجویز: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے الفاظ میں یہ بھی ہے کہ ''ناشر حضرات ہر اچھی کتاب کے دو ایڈیشن چھاپیں ایک ارزاں، دوسرا ڈی لکس ایڈیشن۔'' اپنے ایک مضمون ''ارزاں کتابوں کی فراہمی'' میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: ہماری اشاعتی تاریخ کے فقط دو ناشرین چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کی تحسین کرتے ہیں جنھوں نے برطانیہ کی ''پنگوئین'' اور ''پیلی کن'' کی سستی کتابوں کی مثال سامنے

رکھ کر کلاسیکی شاہ پارے اور جدید ادب کے نمونے اردو زبان میں شائع کیے۔(۵۹) گویا معیاری کتاب سستے داموں، کم وسائل قارئین تک پہنچانے کی کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کی جاسکتی ہے۔اس سلسلے میں ''مکتبہ میری لائبریری'' کے اشاعتی اسلوب کو سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر عطش درانی اس اشاعتی اسلوب کو علم و ادب کی گراں قدر خدمت قرار دیتے ہیں:

''مکتبہ میری لائبریری کی پیپر بیک سیریز کی کتابیں آج ہر گھر میں پہچانی جاتی ہیں۔کوئی طالب علم، کوئی استاد، کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا نہیں جس نے مکتبہ میری لائبریری کی سستی لیکن معیاری کتابوں کو پڑھا نہ ہو۔اس وسیع ادارے نے علم و ادب کی گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں جن کا اعتراف دوست اور دشمن سب نے کیا ہے''۔(۶۰)

افسوس! سستی کتابوں کی فراہمی کے یہ کامیاب تجربے ہماری اشاعتی روایت کا مستقل حصہ نہ بن سکے۔

کتابی دنیا کے مسائل کے مختلف اسباب میں سے ایک: ناشرین کا اپنے معاصرین کے لیے متعصّبانہ رویہ بھی ہے۔(۶۱) اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں تجارتی مسابقت کے باوجود ناشرین نے متحد ہو کر منظّم منصوبہ بندی سے ذوق مطالعہ کی ترویج اور نشر و اشاعت کے فروغ کے لیے کام کیا ہے۔(۶۲)

ناشرین کی باہمی کش مکش کے علاوہ ناشر اور کتب فروش کے درمیان بھی کشیدگی رہی جس نے آخر میں یہ صورت اختیار کی کہ ناشر خود کتب فروش بن گئے اور کتب فروش اشاعت و طباعت بھی کرنے لگے حالانکہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں اور ان کے تقاضے اور مسائل و مراحل بھی جدا جدا ہیں(۶۳) اشاعتی و کتابی دنیا کے مسائل کا گہرا ادراک بقول زید الخیر یہ نتیجہ سامنے لاتا ہے کہ ناشر اور کتب فروش کو ایک دوسرے کے شعبے میں طبع آزمائی کرنے کے بجائے صرف اپنے میدان میں خوش اسلوبی سے آگے بڑھنا چاہیے(۶۴) لیکن بدلے ہوئے حالات میں، ناشر کتب فروشی کو اپنائے بغیر اپنی بقا کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں؛ نیاز احمد (بانی سنگ میل پبلی کیشنز) کے نزدیک: ''اس ملک میں کوئی ناشر بک سیلنگ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا''(۶۵) سو اس صورتحال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک حکومتی سطح پر ناشرین کو کچھ مراعات حاصل نہیں ہوتیں، وہ اپنی بقا کے لیے اپنے اصل کام (اشاعت کتب) کے ساتھ کتب فروشی اور سرکاری اداروں اور کتب خانوں تک رسائی کے معاملات میں اپنا وقت اور صلاحیتیں صرف کرتے رہیں گے۔

اشاعتی و طباعتی دنیا کا ایک بڑا موضوع، مسئلہ اور تنازع ناشر اور ادیب کے تعلقات ہیں۔ناشر کے کاروبار کے عقب میں ادیب کی تخلیقی صلاحیت کارفرما ہوتی ہے۔لیکن ادیب ہی معاشی آسودگی سے محروم رہ جاتا ہے۔مجنوں گورکھ پوری کہتے ہیں:

''اگر آپ کو کتاب چھاپنے کا ذوق ہے تو پورے ذوق کا مظاہرہ کیجئے۔فائدہ بھی اٹھائیے۔مگر جس کی کتاب چھاپی ہے اس کو اس قابل رہنے دیں کہ آئندہ بھی کوئی نقش پیش کر سکے''۔(۶۶)

ناشرین اس سے مختلف موقف رکھتے ہیں، مثلاً مکتبہ کارواں کے بانی کا خیال ہے کہ اپنا جائز حق مل جانے کے باوجود ادبا و شعرا ناشرین کے خلاف رائے عامہ ہموار کرتے رہتے ہیں (٦٧)، لہٰذا ''مظلوم'' حلقہ ادب نہیں، حلقہ طباعت ہے۔ البتہ التحریر کے بانی خالد سیف اللہ ایسے کچھ ناشر اس بات کی بھرپور وکالت کرتے ہیں کہ مصنفین کو بھی معاشی آسودگی حاصل ہونی چاہیے۔ (٦٨) اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کسی تامل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بصورت دیگر تخلیق ادب اور اشاعت ادب دونوں شعبوں کا مستقبل مخدوش ہو جائے گا۔ اسی طرح کی خیر سگالی کا اظہار گاہے بگاہے ادبا کی جانب سے بھی ہوتا ہے بلکہ بعض ادبا تو ادیب و ناشر کی کشیدگی کے حوالے مصنفین کے رویے کو بھی موضوع بناتے ہیں مثلاً جوگندر پال:

> ''برصغیر ہند کا اردو کا ایک عام مصنف جتنا اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اتنا ہی اپنے ناشر کو بھروسے کے قابل نہیں گردانتا''۔ (٦٩)

ناشرین سے حلقہ ادب کی ایک بڑی شکایت نئے مصنفین کو متعارف نہ کرانے کے حوالے سے ہے لیکن اس مسئلے میں خود ناشرین کے درمیان بھی دو موقف نظر آتے ہیں۔ مثلاً ملک مقبول احمد (بانی مقبول اکیڈمی) کا موقف یہ ہے:

> ''نئے مصنفین کو بھی متعارف کرانا ناشر کی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ نئے لوگوں کی کتابیں شائع کی جائیں، اس کار خیر میں ناشر کو بقدر ذوق و ظرف حصہ لینا چاہیے''۔ (٧٠)

دوسرا موقف یہ ہے کہ ہر کتاب پر بھاری سرمایہ کاری ہوتی ہے لہٰذا ناشر اپنے وسائل کی بنیاد پر نئے لکھاری کو متعارف کرانے کا خطرہ کیوں مول لے؟۔ علاوہ ازیں نئے لکھاری اپنے لکھے کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ناشر کی جانب سے اصلاح، نظر ثانی اور ترمیم و اضافے کی کسی تجویز کو قبول کرنے سے عموماً گریز کرتے ہیں (٧١)؛ اول الذکر موقف نئے ادیب کے حق میں اور موخر الذکر ناشر کے مفاد میں ہے، لیکن بات یہیں پر نہیں رکتی کیونکہ کچھ عرصے بعد ہی موخر الذکر موقف اور فقط چند ''ناموں'' پر انحصار/ اکتفا کرنے کا رویہ خود ناشر کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔

> ''ناشر کے بکتر میں بھی چند کمزور حصے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے بڑے ناموں کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا جس سے یہ نام کسی دوسرے ادارے کی طرف منتقل ہو جائیں''۔ (٧٢)
>
> اور جن ادیبوں پر وہ اکتفا کیے ہوئے ہے:
>
> ''ان میں سے بیشتر صرف لکھے جارہے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی ارتقا کے رکنے یا معیار

گرنے کی وجوہات پر غور کرنا مناسب سمجھنے کی بجائے خود کو ایک مشین بنا دیا ہے''۔(۴۳)

ان مسائل کا حل خود احتسابی، اعتدال پسندی اور کشادہ دلی کے ساتھ ساتھ فروغ ذات کے بجائے فروغ ادب کو ترجیح بنانے میں پنہاں ہے؛ نیز تخلیقی وطباعتی دونوں منطقوں میں ربط باہم ضروری ہے۔ ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ اشاعتی ادارے بھی تہذیبی اثاثہ ہوتے ہیں، ان کے مسائل حل ہونے چاہیں اور ان کی بہتری کے لیے بھی کوششیں جاری رکھنی چاہیں۔ علاوہ ازیں قدیم وجدید اشاعتی اداروں کو تحقیق کا موضوع بھی بنانا چاہیے اور اشاعت وطباعت کی مختصر یا مکمل تاریخ بھی قلم بند ہونی چاہیے۔ کیونکہ تاریخ طباعت، تاریخ کتاب بھی ہے۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ اب تک تصنیف وتالیف کے کسی حلقے اور تحقیق کے کسی شعبے کی جانب سے اس ضمن میں کوئی مربوط کوشش نہیں کی گئی ہے۔ (پاکستان میں واحد مثال سید قاسم محمود کی ہے جنہوں نے تاریخ اشاعت لکھنے کا ارادہ کیا، افسوس! وہ ارادہ یا منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا؛ سید قاسم محمود کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ناشرین کو فقط ''کاروباری'' سمجھ کر نظر انداز کرنا مناسب رویہ نہیں ہے، ناشرین کی جدوجہد کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔(۴۴) اسی طرح پاکستان میں صرف ایک علمی وادبی مجلّے ماہ نامہ کتاب لاہور (نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، سابق نام: نیشنل بک کونسل آف پاکستان) نے ناشرین کی اہمیت، خدمات اور کتابی دنیا کے مسائل کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔)

دورِ جدید میں تہذیبی وفکری تسلسل اشاعتی کارگزاری کا حاصل ہے۔ ''حاصل'' پر غور کرنا لازم ہے لیکن جو شعبہ حاصل کا باعث بنا وہ بھی توجہ، تحقیق اور تاریخ میں جگہ چاہتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد عثمان، پروفیسر، ''کتاب کیا ہے''؟ ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۰-۱۱، جلد ۷، جولائی، اگست ۱۹۷۳ء، ص ۸۴

۲۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، ''اجتماعی شعور کی یافت میں مطالعے کا کردار''، قسط نمبر ۱، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۱، جلد ۲۲، ستمبر ۱۹۸۸ء، ص ۸
قسط نمبر ۲، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۲، ۱۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۰

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''دستک اس دروازے پر''، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۵

۴۔ حسن عسکری، ''قارئین ادب اور تخلیقی عمل''، مشمولہ عسکری نامہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۶۳

۵۔ حسن عسکری، ''قارئین ادب''، مشمولہ عسکری نامہ،ص۵۲۲

۶۔ حسن عسکری، ''ادب اور قارئین''، مشمولہ عسکری نامہ،ص۵۱۹، ۵۲۰

۷۔ حسن عسکری، ''ادب اور قارئین ادب''، مشمولہ عسکری نامہ،ص۵۲۰

۸۔ حسن عسکری، ''قارئین ادب اور تخلیقی عمل''، مشمولہ عسکری نامہ،ص۵۶۴

۹۔ انیس خورشید، اختر یوسف، ''پاکستان میں لوگ کیا پڑھتے ہیں؟''(ایک سروے)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۵، جلد ۸،
فروری ۱۹۷۴ء،ص۳۱

۱۰۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر ''اردو میں جاسوسی ادب''، مشمولہ اردو ادب کی شناخت، طبع اول، لاہور، اور ینٹ پبلشرز، ۲۰۰۷ء،ص۱۰۰

۱۱۔ رشید احمد چودھری، ''مکتبہ جدید''(تعارف وانٹرویو: محمد بدر منیر) انٹرویو، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱-۲، جلد ۲، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء،ص۲۲

۱۲۔ صلاح الدین احمد، مولانا، (مرتب)، ''مغربی پاکستان میں خواتین کیا پڑھتی ہیں''؟(مترجم: شاہد احمد دہلوی)، طبع اول، کراچی،
قومی کتاب مرکز، پاکستان، ۱۹۶۴ء،ص۴۵ تا ۴۸
صلاح الدین احمد، مولانا، (مرتب)، ''مغربی پاکستان میں مرد کیا پڑھتے ہیں''؟(مترجم: انعام عزیز)، طبع اول، کراچی،
قومی کتاب مرکز، پاکستان، ۱۹۶۴ء،ص۳۹ تا ۵۵

۱۳۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''ادبی رسائل کے مسائل''، مشمولہ: ادب وفن، طبع اول، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء،ص۲۲

۱۴۔ حنیف رامے، ''ہماری درسی کتابیں۔مشکلات ومسائل کا ایک رُخ''، ماہ نامہ کتاب لاہور، شمارہ ۴، جلد ۲، دسمبر ۱۹۶۷ء،ص۲۳

۱۵۔ حیدر رضا رضوی، سید، ''پاکستان میں نشر واشاعت کی صورت حال''(مترجم آفاق احمد)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۵، جلد ۱۳، مارچ
۱۹۷۹ء،ص۵

۱۶۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''ادبی رسائل کے مسائل''، مشمولہ ادب وفن،ص۲۳

۱۷۔ محمود الحسن، ''قومی تعلیمی پالیسی اور کتب خانے''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۱۳، اگست ۱۹۷۹ء،ص۳۱

۱۸۔ فرخندہ لودھی، ''تعلیمی پالیسی اور لائبریری''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱-۲، جلد ۶-۷، (تعلیمی پالیسی نمبر)، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۲ء،ص۸۸

۱۹۔ مختار صدیقی، ''پاکستان میں ادبی اشاعت''، مشمولہ مقالات مختار صدیقی، (مرتبہ شیما مجید)، طبع اول، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور،
۱۹۹۷ء،ص۴۲۱، ۴۲۲

۲۰۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، طبع اول، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء،ص۱۱

۲۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''لکھاری، لکھت اور قاری''، مشمولہ امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر، طبع اول، لاہور، اردو سائنس بورڈ،
۲۰۰۷ء،ص۱۱۶

۲۲۔ مختار صدیقی، ''پاکستان میں ادبی اشاعت''، مقالاتِ مختار صدیقی، ص ۴۱۹

۲۳۔ ابوالحسن، ''عادت مطالعہ اور ذوق مطالعہ''، (مترجم عاصم صحرائی)، ماہنامہ کتاب لاہور، شمارہ ۹، جلد ۱۳، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۲۲

۲۴۔ مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر، ''ادب اور کاروبار''، ماہنامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱، جلد ۸، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۶

۲۵۔ عبدالقیوم ساگر، ''پاکستان میں کتابی صنعت کے پچیس سال''، ماہنامہ کتاب، لاہور، (تعلیمی پالیسی نمبر)، شمارہ ۱۔۱۲، جلد ۶۔۷، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۱

۲۶۔ مختار صدیقی، ''پاکستان میں ادبی اشاعت''، مقالاتِ مختار صدیقی، ص ۴۲۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۲۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۲۹۔ سلیم ملک، محمد، ڈاکٹر، ''امتیاز علی تاج، زندگی اور فن''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۶

۳۰۔ احسان دانش، ''جہانِ دانش''، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۰ء، ص ۵۹۸، ۵۹۹

۳۱۔ بشیر احمد چودھری، ''مکتبہ میری لائبریری اور بشیر احمد چودھری''، (تعارف: عطش درانی، انٹرویو عبدالستار چودھری)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۹، جلد ۶، جون ۱۹۷۲ء، ص ۱۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۳۔ بدر منیر، محمد، ''آئینہ ادب''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۳، جلد ۲، نومبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۴

۳۴۔ عبدالسلام، شیخ، ''ایک ناشر کی یادداشتیں''، (تعارف اور انٹرویو: اکرم کامل)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۹۔۱۰، جلد ۲۳، جولائی اگست ۱۹۸۹ء، ص ۲۱

۳۵۔ نذیر احمد چودھری، ''انٹرویو از نذیر احمد چودھری''، (تحریر: صفدر ادیب)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱، جلد ۱، ستمبر ۱۹۶۶ء، ص ۱۱

۳۶۔ نیاز احمد، ''سنگ میل پبلی کیشنز کے جناب نیاز احمد سے ملاقات''، (انٹرویو: اکرم کامل)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۲، جلد ۱۶، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۸

۳۷۔ خالد فتح محمد / اسد ملک، اداریہ، سہ ماہی ادراک، گوجرانوالہ، شمارہ ۶، جون تا اگست ۲۰۰۵ء، ص ۵

۳۸۔ عمران اختر، پروفیسر، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۴۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۳۹۔ حیدر رضا رضوی، سید، ''پاکستان میں نشر و اشاعت کی صورت حال''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۵، جلد ۱۳، مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۵، ۶

۴۰۔ رفیق سندیلوی،''ڈائجسٹ اوران کا ادب''، سہ ماہی ادراک، گوجرانوالہ،شمارہ ۶، جون تا اگست ۲۰۰۵ء،ص ۴۳

۴۱۔ خالد فتح محمد/ اسد ملک، اداریہ، سہ ماہی ادراک، گوجرانوالہ، شمارہ ۶، جون تا اگست ۲۰۰۵ء،ص ۵

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، اے۔ ایچ پبلشرز، ۱۹۹۶ء،ص ۵۹۰

۴۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر،''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء،ص ۲۴۵

۴۴۔ ایضاً۔

۴۵۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر،''ادبی رسائل کے مسائل''، مشمولہ: ادب وفن،ص ۲۵

۴۶۔ حیدر رضا رضوی، سید،''پاکستان میں نشرواشاعت کی صورتحال''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۵، جلد ۱۳، مارچ ۱۹۷۹ء،ص ۷

۴۷۔ ایضاً۔

۴۸۔ عبدالسلام، شیخ،''ایک ناشر کی یادداشتیں''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۹-۱۰، جلد ۲۳، جولائی اگست ۱۹۸۹ء،ص ۲۳

۴۹۔ عبدالحمید، چودھری،'' مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید سے ملاقات''، (تحریر اکرم کامل)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۱۹، اگست ۱۹۸۵ء،ص ۱۲

۵۰۔ بشیر احمد چودھری،'' مکتبہ میری لائبریری اور بشیر احمد چودھری''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۹، جلد ۶، جون ۱۹۷۲ء،ص ۱۳

۵۱۔ خالد سیف اللہ،''التحریر کے ڈائریکٹر خالد سیف اللہ کا انٹرویو''، (تحریر: عبدالستار چودھری)، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۸، مارچ ۱۹۷۴ء،ص ۳۷

۵۲۔ نذیر احمد چودھری،''انٹرویو از نذیر احمد چودھری''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱، جلد ۱، ستمبر ۱۹۶۶ء،ص ۱۱

۵۳۔ عبدالسلام، شیخ،''ایک ناشر کی یادداشتیں''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۹-۱۰، جلد ۲۳، جولائی اگست ۱۹۸۹ء،ص ۲۳

۵۴۔ ایضاً۔

۵۵۔ نذیر احمد چودھری،''ایک ناشر سے انٹرویو''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱، جلد ۱، ستمبر ۱۹۶۶ء،ص ۱۳

۵۶۔ ایضاً۔

۵۷۔ عبدالحمید، چودھری،'' مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید سے ملاقات''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۱۹، اگست ۱۹۸۵ء،ص ۱۲

۵۸۔ نیاز احمد،''انٹرویو برائے ادبی صفحہ''، ہفت روزہ، دی پاکستان پوسٹ، لندن، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء،ص ۱۵

۵۹۔ عبدالسلام خورشید،''ارزاں کتابوں کی فراہمی''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۲، جلد ۸، نومبر ۱۹۷۳ء،

۶۰۔ عطش دُرانی، ڈاکٹر،'' مکتبہ میری لائبریری اور بشیر احمد چودھری''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۹، جلد ۶، جون ۱۹۷۲ء،ص ۱۲

۶۱۔ رشید احمد چودھری، ''مکتبہ جدید''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱-۲، جلد ۲، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۳

۶۲۔ ایضاً۔

۶۳۔ خالد سیف اللہ، ''التحریر کے ڈائریکٹر خالد سیف اللہ سے انٹرویو''، شمارہ ۶، جلد ۸، مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۳۸

۶۴۔ زید الخیر، '' بک سیلرز کے مسائل''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۸، مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۲۸

۶۵۔ نیاز احمد، ''سنگ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد سے ملاقات''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۲، جلد ۱۶، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۸

۶۶۔ مجنوں گورکھپوری، پروفیسر، ''ادب اور کاروبار''، شمارہ ۱، جلد ۸، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۶

۶۷۔ عبدالحمید، چودھری، '' مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید سے ملاقات''، ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۱۹، اگست ۱۹۸۵ء، ص ۱۳

۶۸۔ خالد سیف اللہ، ''التحریر، لاہور''، (تحریر وانٹرویو: طاہر اصغر) ماہ نامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۱۹، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۔۱۸

۶۹۔ جوگندر پال، ''سفر جاری ہے''، (تبصرہ)، مشمولہ پذیرائی (مؤلف ومرتب ملک مقبول احمد)، طبع اول، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۴

۷۰۔ مقبول احمد، ملک، انٹرویو، (تحریر: اکرم کامل) شمارہ ۲، جلد ۲۰، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۱۷

۷۱۔ نیاز احمد، ''انٹرویو برائے ادبی صفحہ''، ہفت روزہ دی پاکستان پوسٹ، لندن، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۷۲۔ خالد فتح محمد/ اسد ملک، اداریہ، سہ ماہی ادراک، گوجرانوالہ، شمارہ ۶، جون تا اگست ۲۰۰۵ء، ص ۶

۷۳۔ ایضاً، ص ۵۔۶

۷۴۔ قاسم محمود، سید، ''منشی نول کشور سے ملک مقبول احمد تک''، مشمولہ پذیرائی، (مؤلف ومرتب: ملک مقبول احمد)، طبع اول، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۹

دوسرا باب

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کا قیام و ارتقا
اور اشاعتِ اردو ادب کے لیے چالیس سالہ خدمات
(۱۹۶۲ء تا ۲۰۰۲ء)

کتابوں کی طباعت: تہذیبی روایت کی نشر واشاعت، دانش کی ترویج اور فکر وتجربہ کی ترسیل کا باعث بنتی ہے؛ گویا اشاعت کتاب آئینہ تمدن بھی ہے اور خالق تمدن بھی!

بنیادی طور پر کسی قوم کا تمدن ہی تحریر وتخلیق کے لیے فضا تشکیل دیتا ہے، تخلیقی احساس کو کتاب کی صورت میں ایک صوری ومعنوی وجود عطا کرتا ہے اور اپنے آپ کو کتاب میں ہی مجسم کر کے اپنی بقا کے خواب کو تعبیر دیتا ہے۔

ہر معاشرے میں اشاعت کتب کا سلسلہ کاروباری اور غیر کاروباری دونوں سطحوں پر جاری رہتا ہے۔ غیر کاروباری سطح پر اشاعتی کام عموماً حکومت، نیم سرکاری، غیر سرکاری اور تعلیمی وفلاحی ادارے اور مشنری جذبہ رکھنے والے اشخاص انجام دیتے ہیں۔ کاروباری سطح پر اشاعت کتب کا سلسلہ ہر کاروبار کی طرح طلب ورسد کی بنیاد پر ہی قائم ہوتا اور رہتا ہے؛ کاروباری طور پر اشاعت کتب کا کام منفعت بخش اور علمی وادبی لحاظ سے سودمند ہے۔ (یہ واحد تجارت ہے جس سے علم وادب، عالم وادیب اور قاری وناظر کا مفاد جڑا ہے)

کتاب کا ناشر محض ایک تاجر نہیں رہتا بلکہ علمی وادبی حلقوں اور مختلف عوامی طبقوں میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے یا کم از کم موضوع بحث ضرور بنتا ہے اور اس طرح ناشر ''فروخت کنندہ'' کے عمومی منصب سے بلند ہو جاتا ہے اور اگر اس کی مطبوعات کا معیار بہتر اور مصنفین سے روابط مخلصانہ اور دیانتدارانہ ہوں تو معاشرتی حافظے میں اس کا خوش کن تاثر اور تمدنی تاریخ میں معتبر رتبہ قائم رہتا ہے۔ ناشر کی اہمیت و حیثیت کے حوالے سے (معروف اشاعتی ادارے فیروزسنز کے بانی مولوی فیروزالدین کے صاحبزادے) ڈاکٹر عبدالوحید لکھتے ہیں:

> ''اشاعت کتب کے میدان میں ناشر کی حیثیت ایک قائد کی سی ہے۔ وہ مصنف کے خیالات کو نقصان کا خطرہ مول کر قارئین تک پہنچاتا ہے۔ اسی کی استعداد اور استحکام پر کتاب کی فروخت کا دارومدار ہے۔ وہ عوام کی تعلیم کے بیش از بیش ذرائع مہیا کر کے ایک باخبر اور باعلم قوم کی تعمیر میں مصروف ہے۔ اس میدان میں دوسرے اداروں کی نسبت اس کی خدمات زیادہ قابل اور لائق تحسین ہیں''۔(۱)

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ناشر کی اہمیت وحیثیت تسلیم شدہ ہونے کے باوجود ہمارے یہاں اس کی ذات ومطبوعات کے حوالے سے تحقیقی کام انجام نہیں دیا جاتا۔ سید امیر حسن نورانی نے اپنی کتاب ''سوانح منشی نول کشور'' میں اس ''تحقیقی غفلت'' کے حوالے سے اپنا ردعمل اس طرح ظاہر کیا ہے:

> ''ہماری علمی وادبی دنیا کی غفلت وبے حسی افسوسناک اور تعجب خیز ہے کہ منشی نول کشور کے حالات اور کارناموں کا جائزہ لینے اور ان کو ضبط تحریر میں لانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ جبکہ اس دور

میں بعض معمولی شخصیتوں پر تحقیقی کام ہورہے ہیں، ایک ایسی شخصیت کو نظرانداز کرنا محسن کشی نہیں تو کیا ہے، جس کی بدولت ہمیں اپنی زبان وادب کا بیش بہا سرمایہ حاصل ہوا''۔ (۲)

اشاعتی اداروں پر تحقیقی کام نہ ہونے کے باوجود ہر اشاعتی ادارہ (بالخصوص علمی وادبی کتب طبع کرنے والا ادارہ) متعدد حوالوں سے علمی وادبی دنیا میں موضوع بحث بنتا ہے، مثلاً شائع شدہ کتب کی نوعیت وافادیت، کتابوں کا صوری ومعنوی معیار، کتاب کی ادبی و معاشرتی اقدار سے مطابقت، ادیبوں اور عالموں سے روابط، علم وادب کے مختلف زاویوں اور شخصیتوں کو ابھارنے یا نظرانداز کرنے کا رویہ وغیرہ؛ ان زاویوں سے ہر اہم اشاعتی ادارہ قارئین وناقدین کے وسیع حلقے میں محاکمے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔

ہر مہذب معاشرے میں ہر قابل ذکر اشاعتی ادارے سے علمی وتہذیبی ادوار کی تجسیم، روایات کی تدوین اور اقدار کی ترویج کی توقع رکھی جاتی ہے۔ بصورت دیگر معاصر تاریخ اور علمی وادبی حلقے اس ادارے کی اخلاقی حیثیت پر سخت تنقید کرتے ہیں (اس تنقید کا اس کاروباری ادارے پر کوئی اثر ہو یا نہ ہو، یہ ایک الگ بحث ہے) کسی بھی اخبار/ رسالے میں تبصرہ کتب کے گوشے میں تصنیف ومصنف کے ساتھ ناشر کی طباعتی کارکردگی کا بھی ضرور کیا جاتا ہے۔

کتابوں کی طباعت واشاعت کا کام مشکل، صبرآزما اور محنت طلب ہونے کے ساتھ ساتھ مزید کئی نفاستوں اور باریک بینوں کا متقاضی بھی ہے۔ ناشر کے کام، مقاصد اور تجارتی مراحل کا ذکر ایک ناشر (ملک مقبول احمد بانی مقبول اکیڈمی لاہور) نے اپنی خودنوشت سوانح ''سفر جاری ہے''، میں اس طرح کیا ہے:

> ''کتابوں کی طباعت کا کاروبار کئی حوالوں سے ایک پرخطر کام ہے....... کتاب اس مقصد کے تحت شائع کی جاتی ہے کہ اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا جائے، اس کے مطالب ومفاہیم عام کیے جائیں۔ لہٰذا کتاب کا ناشر ایک کتب فروش کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے...... اس کام سے روزی کمانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے یا جس کا تصور کیا جاتا ہے..... مثبت اور منفی زاویوں کے باوجود کتابوں کی اشاعت ایک باوقار کام اور باعزت پیشہ ہے۔
>
> بلا شبہ کتاب مصنف کے لکھ دینے ہی سے وجود میں آتی ہے لیکن کتاب کو صوری حسن ورعنائی ناشر ہی فراہم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کتاب سازی کو تخلیقی عمل سے تشبیہ دی گئی ہے....... ناشر کے لیے ایسی کتب شائع کرنا اس کے کاروبار کی زندگی اور وسعت کی علامت ہوتی ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہوں یا کسی ممتاز ومعروف ادیب کی تصنیف ہونے کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ بک جائیں۔ ایسی کتب ہی ناشر کو مزید سرمایہ کاری کا اہل بناتی ہیں اور اس کے

> کاروبار کو وسعت دیتی ہیں.... ناشر کو ایسا مصنف ہی اچھا لگتا ہے جس کی کتاب پر اس کا لگا ہوا سرمایہ جلد واپس آ جائے۔اشاعتی کاروبار میں بھی طلب و رسد کا اصول ہی چلتا ہے''۔(۳)

اس اقتباس سے اشاعت کتب کے تمام معاملات اور ناشر کی ترجیحات (بہ زبان ناشر) سامنے آ جاتی ہیں؛ گویا نجی اشاعتی ادارے اپنی کاروباری مصلحتوں اور حصول منفعت کی منزلوں کو نظر انداز کر کے محض علمی و ادبی خدمات کے لیے خود کو وقف نہیں کر سکتے۔ (البتہ استثنائی مثالیں بہ دقت اور وہ بھی جزوی کارکردگی کی حامل مل سکتی ہیں) ناشر کی علمی و ادبی شعبے میں کسی خاص خدمت کو موضوع بناتے ہوئے عموماً حقیقت پسند ناقد اس کی تجارتی مجبوریوں، مصلحتوں اور منفعتوں سے کسی حد تک صرف نظر کر کے اس کی اشاعتی کارکردگی پر اظہار خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ایک مثال: معروف ادیب اور نقاد ڈاکٹر اسد اریب نے بچوں کے ادب کی اشاعتوں کے حوالے سے تحقیق کرتے ہوئے ایک قدیم اشاعتی ادارے کے بارے میں اس انداز میں اظہار خیال کیا ہے:

> ''فیروز سنز پاکستان کا سب سے بڑا ادارہ ہے، جس کا اشاعتی پروگرام پاکستان کے تمام دوسرے اداروں سے زیادہ وسیع اور قدیم ہے......فیروز سنز چونکہ ایک کاروباری ادارہ ہے اس لیے اس کے پیش نظر وسیع اشاعت کی اہمیت بہتر ادب کی اہمیت سے زیادہ ہے کیونکہ تجارتی ادارے منفعت کے نقطۂ نظر سے قدم اٹھاتے ہیں''۔(۴)

(اپنے مقالے میں ڈاکٹر اسد اریب نے مذکورہ بالا اشاعتی ادارے کی مطبوعات کے صوری و معنوی معیار کو سراہنے کا عمل اس ادارے کے تجارتی اہداف و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہی انجام دیا ہے)

اردو ادب کی اشاعت و ترویج کے حوالے سے شہر لاہور، قیام پاکستان سے پہلے بھی ایک اہم مرکز تھا؛ برصغیر کے اطراف و جوانب میں لاہور کی تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعتی کاوشوں کو بھی خوب سراہا جاتا تھا۔آزادی کے بعد لاہور نہ صرف علم و ادب کا ایک اہم منبع و مرکز بنا بلکہ کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے ایک ہمہ جہت حیثیت اختیار کر گیا، اب تک اس شہر کا اشاعتی اختصاص برقرار ہے۔

قیام پاکستان کے کچھ سالوں بعد لاہور میں نجی اشاعتی و طباعتی اداروں میں اضافہ ہوا۔گو وقت گزرنے کے ساتھ کئی اشاعتی ادارے نشیب و فراز کے مراحل سے بھی گزرے لیکن اشاعت و طباعت کی رفتار تقریباً یکساں رہی۔ذرا آگے چل کر مختلف وجوہات کی بنا پر چند اداروں کے اشاعتی منصوبے سمٹنے لگے، ان میں کچھ نے تو اپنے حالات پر قابو پا لیا اور کچھ ادارے ختم ہو گئے۔کچھ قدیم ادارے جو آج بھی اشاعتی دنیا میں زندہ ہیں؛ ان میں نمایاں فیروز سنز لاہور (قیام:۱۸۹۴ء) اور ملک غلام علی اینڈ سنز (قیام:۱۸۸۷ء) ہیں۔کئی قدیم کامیاب ادارے مثلاً دارالاشاعت پنجاب وغیرہ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد یا ذرا آگے چل کر ختم ہو گئے۔

کئی اداروں نے اشاعت اردو ادب کے لیے کئی دہائیوں تک خدمات انجام دیں لیکن آخر کار وہ بھی زوال پذیر ہو گئے، مثلاً: مکتبہ جدید، مکتبہ میری لائبریری، جدید ناشرین، نیا ادارہ، گوشہ ادب، لاہور اکیڈمی، آئینہ ادب، ادارہ فروغ اردو، مکتبہ اردو، اکادمی پنجاب، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، عشرت پبلشنگ ہاؤس، شیش محل کتاب گھر، ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز، البیان۔

پاکستان بننے سے ذرا پہلے یا بعد میں قائم ہونے والے لاہور کے ایسے ادارے جو آج بھی اپنی علمی و ادبی اشاعتیں جاری رکھے ہوئے ہیں؛ ان میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں: التحریر، قوسین، مکتبہ عالیہ، مقبول اکیڈمی، اظہار سنز، کلاسیک، نذیر سنز، فکشن ہاؤس، ماورا، نگارشات، تخلیقات، الحمد، سنگت پبلشرز، اے ایچ پبلشرز، ٹی اینڈ ٹی پبلشرز وغیرہ۔

لاہور کے بھرپور اشاعتی تناظر میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کا سفر ۱۹۶۲ء میں شروع ہوا تھا۔ برصغیر کے دیگر معروف اشاعتی اداروں کی طرح سنگ میل کا آغاز بھی انتہائی کم وسائل سے (اور خاصی حد تک بے سروسامانی کے عالم میں) ہوا؛ اس کی ترقی و کامیابی بے پناہ جدوجہد کے نتیجے میں ممکن ہوئی۔ اس ادارے کے ارتقا اور کارناموں کا سہرا اس کے بانی نیاز احمد کے سر ہے۔ نیاز احمد کا شخصی و معاشرتی اور فکری و تجارتی تناظر واضح کرنے کے لیے ان کی سوانح اور شخصیت پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

نیاز احمد ۱۹۲۹ء میں ضلع امرتسر کی تحصیل ترن تارن کے قصبے فتح آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں محمد یعقوب اور والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا؛ میاں محمد یعقوب کے والد (اور نیاز احمد کے دادا) کا نام میاں علی بخش تھا۔ میاں محمد یعقوب کے ہاں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے؛ سب سے بڑی بیٹی تھیں اور ان کا نام خورشید بیگم تھا، ان سے چھوٹے نیاز احمد تھے باقی بھائیوں کے نام یہ ہیں: ارشاد احمد، اقبال احمد، نذیر حسین اور عابد حسین؛ ان میں صرف اقبال احمد، حیات ہیں۔

نیاز احمد نے جب ہوش سنبھالا تو ان کا کنبہ برما میں تھا؛ ان کا خاندان امرتسر سے لاہور آیا اور پھر ان کے والد بسلسلہ ملازمت اہل وعیال کے ساتھ برما چلے آئے؛ وہ برما میں تیل کی ایک کمپنی میں ملازم ہوئے۔ اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے قریب تھی؛ برما میں غیر یقینی حالات دیکھتے ہوئے نیاز احمد کے والد نے اپنے اہل وعیال کو لاہور کے لیے روانہ کر دیا (اور خود برما میں ہی مقیم رہے) انہوں نے ملازمت چھوڑ کر ایک دکان کھول لی۔ جنگ عظیم دوم شروع ہو جانے پر وہ برما سے نکلے اور پیدل چلتے ہوئے کلکتہ پہنچ گئے (کیونکہ سفر کی باقی صورتیں تقریباً معدوم یا عام آدمی کی پہنچ سے دور ہو چکی تھیں لہٰذا برما سے پیدل قافلے بڑی تعداد میں کلکتہ اور دیگر علاقوں میں پہنچ رہے تھے) کلکتے سے وہ لاہور اپنے بیوی بچوں کے پاس آ گئے۔ نیاز احمد کی ننھیال لاہور میں تھی لہٰذا والد کی لاہور سے غیر موجودگی کے باوجود ان کے گھرانے کی دیکھ بھال مناسب انداز میں انجام پاتی رہی۔

قیام پاکستان سے پہلے نیاز احمد کے والد تلاش معاش کے لیے رام پور بھی گئے اور کچھ عرصے بعد واپس آ گئے؛ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد روزگار کے لیے ہندوستان جانا ہوا لیکن پانچ چھ ماہ کی قلیل مدت میں ہی واپسی عمل میں آ گئی۔ یہاں آ کر وہ لوہے سے وابستہ کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ فقط پینتالیس برس کی عمر میں انتقال ہو گیا، تدفین لاہور میں ہوئی۔

نیاز احمد کو مسلم ہائی سکول لاہور (برانڈرتھ روڈ، رام گلی، دہلی دروازہ، لاہور) میں داخل کرایا گیا تھا؛ ساتویں آٹھویں جماعت میں انہیں مختلف انعامات بھی ملے۔ (جن میں سے ایک حاضریوں میں باقاعدگی پر بھی تھا) میٹرک کا امتحان ۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانے اور امتحانی فیس نہ ہونے کی نذر ہو گیا اور یوں نیاز احمد کی خواہش اور کوشش کے برخلاف باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ اسی زمانے میں نیاز احمد کو محکمہ خوراک میں ایک نوکری میاں چنوں میں ملی، انہوں نے تین چار ماہ یہ نوکری کی اور پھر والدہ کے حکم پر اسے چھوڑ کر لاہور آ گئے (والدہ کے لیے بیٹے کا اتنی دور جا کر ملازمت کرنا نہایت پریشانی کا باعث بن رہا تھا)

۱۹۴۸ء میں نیاز احمد نے لاہور آ کر پبلشرز یونائیٹڈ میں نوکری حاصل کی جو پندرہ روپے ماہوار سے شروع ہوئی اور نوکری چھوڑنے تک ساڑے تین سو روپے ماہوار ہو گئی۔ پبلشرز یونائیٹڈ۔ آٹھ مسلمان ناشرین کا ایک مشترکہ اشاعتی ادارہ تھا جو انہوں نے تقسیم ہند سے پہلے تحریک پاکستان کے حوالے سے کتابیں شائع کرنے کے لیے (نئی انارکلی میں ایک دکان لے کر) قائم کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد پبلشرز یونائیٹڈ کا شعبہ اردو ختم ہو گیا البتہ انگریزی شعبہ خاصے عرصے برقرار رہا۔ (۵)

نیاز احمد نے جب نوکری کا آغاز کیا تو پبلشرز یونائیٹڈ کے منیجر عبدالسلام تھے جو (ان کی نوکری کے) پندرہ دن بعد اس ادارے سے علیحدہ ہو گئے اور اپنا ذاتی اشاعتی کاروبار شروع کر دیا۔ عبدالسلام کے بعد پبلشرز یونائیٹڈ کے نئے منیجر شیخ ریاض بنے وہ اس زمانے کے معروف ناشر شیخ نصیر ہمایوں کے بیٹے تھے۔ شیخ نصیر ہمایوں کے بارے میں نیاز احمد لکھتے ہیں: ''میں جناب شیخ محمد نصیر ہمایوں (مرحوم) (احسن برادرز) کا ممنون احسان رہوں گا جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور جنہوں نے مجھے کتابوں سے محبت کرنا سکھایا''۔ (۶)

شیخ محمد نصیر ہمایوں اور شیخ ریاض نے پبلشرز یونائیٹڈ ختم ہونے پر اس ادارے کی دکان خرید لی، احسن برادرز اور قومی کتاب خانہ ان کے ذاتی ادارے تھے اور وہ ایک اخبار ''تعمیر'' کے نام سے بھی نکالتے تھے۔ شیخ نصیر ہمایوں ایک بہت ہمدرد انسان تھے انہوں نے نیاز احمد کے ساتھ دورانِ ملازمت بہت اچھا سلوک روا رکھا اور جب نیاز احمد نے ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کیا تو بھی شیخ نصیر نے ان سے خلوص و مروت کا تعلق و رشتہ برقرار رکھا۔

پبلشرز یونائیٹڈ میں نیاز احمد کی ملازمت کی نوعیت ہمہ جہتی تھی، ساری دکان کی دیکھ بھال، صفائی، کتابوں کی فروخت، کتابت کے مراحل کی نگرانی وغیرہ سب کچھ نیاز احمد کو کرنا پڑتا تھا۔ فراغت کے لمحوں میں وہ اس ادارے کی اردو کتب خصوصاً نسیم حجازی کے ناول پڑھتے؛ کوئی ناول رات کو گھر میں پڑھنے کے لیے بھی لے آتے اور دوسرے یا تیسرے دن مطالعہ کر کے واپس کر دیتے۔ یوں بے قاعدہ اور غیر رسمی انداز میں گویا تعلیم کا دوبارہ آغاز ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت میں موجود ذوقِ ادب کی تعمیر و تشکیل کا سلسلہ بھی بتدریج آگے بڑھنے لگا۔ اسی زمانہ ملازمت میں نیاز احمد کی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں خصوصاً منٹو اور اختر شیرانی سے ملاقات کی سبیل یہیں پیدا ہوئی۔ (۷)

۱۹۶۲ء میں نیاز احمد نے ملازمت چھوڑ کر اپنا ذاتی ادارہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے نام سے قائم کیا۔اس کے لیے وسائل بہت ہی قلیل تھے (البتہ عزائم اور مقاصد جلیل تھے) ادارے کے دفتر اور دکان کے لیے پہلے شاہ عالمی لاہور میں ایک چھوٹا سا کمرہ لیا گیا، حالات بہتر ہونے پر اردو بازار لاہور کی ایک دکان میں منتقل ہو گئے، بعدازاں کاروبار وسیع اور تعداد کتب میں بے پناہ اضافہ ہونے کے باعث لوئر مال لاہور میں آفس اور شوروم قائم کیا گیا۔

سنگ میل نے آغاز میں عمومی نوعیت کی کتب شائع کیں؛ سب سے پہلی اہم کتاب : تزک بابری (مترجم : رشید اختر ندوی) تھی جو پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان زیادہ تر مذہبی نوعیت کی کتب شائع ہوتی رہیں؛ ان میں اہم اور معروف کتاب ''امام اعظم'' تھی۔

آغاز میں ادبی کتب کم شائع ہوئیں، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر وحید قریشی، سید اصغر علی شاہ جعفری کی تنقیدی کتب اور احمد شجاع پاشا اور اکرام اللہ کی افسانوی کتب سے ادبی اشاعتوں کے سلسلے میں قدرے تیزی آئی۔سنگ میل کے قیام کی پہلی دہائی کے آخر میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''پیار کا پہلا شہر'' اور ڈاکٹر سلیم اختر کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' سے اردو ادب اور سنگ میل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے (کتب کی تفصیل و تجزیہ مقالے میں آگے آئے گا۔)

سنگ میل کے قیام سے ہی نیاز احمد کے اکثر ادیبوں اور شاعروں سے تعلقات پختہ ہوتے چلے گئے۔ان تعلقات کی استواری میں نیاز احمد کی اشاعت ادب میں گہری دلچسپی اور خوش اخلاقی نے اہم کردار ادا کیا؛ کتاب کا حق تصنیف (رائلٹی) دینے کا کھرا اصول بھی ان کے بہت کام آیا۔(وہ کتاب چھپنے کے ایک ماہ کے بعد رائلٹی ادا کر دیتے خواہ کتاب فروخت ہو یا نہ ہو) عموماً کئی مصنفین نے سنگ میل سے ایک کتاب شائع کرانے کے بعد اس حد تک اعتماد و اطمینان محسوس کیا کہ بعدازاں اپنی تمام (یا اکثر) کتابوں کی اشاعت کے لیے سنگ میل سے ہی رابطہ کیا۔

سنگ میل پبلی کیشنز سے نیاز احمد کے چھوٹے بھائی نذیر حسین بھی کچھ عرصے وابستہ رہے لیکن پھر نذیر حسین نے علیحدہ ہو کر پہلے پرنٹنگ پریس لگایا جو کامیاب نہ ہو سکا، پھر اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ نذیر سنز لاہور کے نام سے قائم کیا۔اس ادارے نے اشاعتی دنیا میں کامیابی اور نیک نامی حاصل کی۔

نیاز احمد کی شادی ان کی ایک عزیزہ جمیلہ بیگم سے ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ نیاز احمد کے دو بیٹے اعجاز احمد اور افضال احمد اور ایک بیٹی سعیدہ بیگم ہیں۔اعجاز احمد کا سن پیدائش ۱۹۵۷ء ہے؛ انہوں نے سکول کی تعلیم کے دوران میں ہی کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔اس مصروفیت کے بڑھ جانے کے باعث ان کا تعلیمی سلسلہ نویں جماعت سے آگے نہ چل سکا۔(۸) والد سے انہیں کاروباری سوجھ بوجھ، مطالعے کی عادت، شعر و ادب کا ذوق اور مصنفین سے خوشگوار روابط قائم کرنے کا سلیقہ حاصل ہوا۔اعجاز احمد کی صلاحیتیں سنگ

میل پبلی کیشنز کے کاروباری حجم اور وقار میں اضافے کا باعث بنیں۔ اعجاز احمد کی خوش اخلاقی، بلند ہمتی اور کاروباری صلاحیت کے حوالے سے کشور ناہید لکھتی ہیں:

> ''اعجاز کو اللہ نے کتاب کی فروخت کا ایسا ہنر دیا تھا کہ وہ چاہتا تھا تو ایک ہزار کتاب ایک ہفتے میں ختم ہو جاتی تھی۔ اعجاز کی کم علمی اس کی بلند ہمتی پہ کبھی حاوی نہ آ سکی۔ اس نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا کہ باپ کے ساتھ کام میں لگ گیا تھا۔''(۹)

اعجاز احمد ۱۸۔ جولائی ۲۰۰۱ء کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ (ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے) دوسرے بیٹے افضال احمد کا سن پیدائش ۱۹۵۹ء ہے، انہوں نے گریجوایشن کرنے کے بعد کاروبار میں اپنے والد اور بڑے بھائی کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ (افضال احمد کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں) نیاز احمد کے بڑھاپے اور مختلف عارضوں میں مبتلا ہونے کے باعث افضال احمد کی کاروباری ذمہ داری بڑھ گئی ہے اور وہ اس سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ نیاز احمد کی رہائش پہلے کسان بلڈنگ بیرون اکبری گیٹ لاہور اور پھر سمن آباد میں کرایے کے مختلف مکانوں میں رہی؛ اس کے بعد وہ ماڈل ٹاؤن میں کرایے کے ایک مکان میں رہنے لگے اور بعد ازاں ماڈل ٹاؤن میں ہی ذاتی رہائش گاہ کے لیے ایک کوٹھی (نمبر ۲-سی، ۱۲۸) خرید لی۔

نیاز احمد مختلف ممالک میں بھی گئے، خصوصاً ترکی سات مرتبہ گئے (اور وہ غیر ممالک میں ترکی کو ہی سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں) انگلینڈ میں چھ مرتبہ اور سعودی عرب دو دفعہ جانا ہوا، (عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی) اس کے علاوہ ایران اور ناروے بھی گئے، ہندوستان (۱۹۶۲ء میں) سنگ میل کے قیام سے پہلے سیر کے لیے گئے تھے، بعد ازاں ہندوستان جانے کا طے شدہ پروگرام چھوٹے بھائی نذیر حسین کی اچانک وفات کے باعث ملتوی کرنا پڑا۔(۱۰) نیاز احمد بڑھاپے اور مختلف بیماریوں کے باوجود فعال اور متحرک ہیں اور ان کی سربراہی اور نگرانی میں سنگ میل کے معیار و رفتار و وقار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

نیاز احمد کی شخصیت کے نمایاں پہلو کی وضاحت کے لیے مناسب الفاظ ''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو'' ہی ہیں۔ کتاب سے محبت، طباعت کی جمالیات سے آ گاہی و وابستگی ان کے فکر و مزاج کے اہم زاویے ہیں؛ شاید اسی لیے ان کا ادارہ ملک عزیز میں اشاعتی جمالیات کا سنگ میل بن چکا ہے۔ نیاز احمد سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے (انہوں نے اخبار کا مطالعہ بھی فقط نمایاں سرخیاں دیکھنے تک محدود رکھا ہے) ہر قسم کے سیاسی، ادبی، تجارتی اور سماجی تنازعات سے دور رہتے ہیں؛ سنگ میل کی سیکڑوں مطبوعات میں سے فقط چند کتابوں کے کچھ حصے متنازع قرار پائے ہیں۔ نیاز احمد کی طبیعت میں محنت کشی اور مستقل مزاجی ہے؛ علمی و ادبی کتب کی اشاعت کے علاوہ کسی اور کاروبار پر توجہ نہیں دی؛ کوئی اخبار/ رسالہ وغیرہ نہیں نکالا، حتیٰ کہ بڑے ناشرین کی عمومی روایت کے مطابق مطبع (پرنٹنگ پریس) بھی لگانے کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ ایک اور عمومی اشاعتی رویہ اور روایت ٹیکسٹ بک بورڈ وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت ہے؛ نیاز احمد نے سنگ میل کو اس بے حد

منافع بخش کاروبار سے دور رکھا ہے۔

شروع میں سنگ میل کی ادبی اشاعتیں افسانوی نثر اور تنقید پر مشتمل تھیں؛ لیکن فکشن عموماً ''پاپولر'' نوعیت کی تھی اور تنقیدی کتب کا مواد نصابی ضرورتوں پر استوار تھا۔ احسان الحق اختر اور محمد احسان الحق کی تنقیدی کتابیں اس سلسلے کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس عرصے میں سنگ میل نے اشاعت اردو ادب کے حوالے سے اپنا تعارف تو کرا دیا لیکن ابھی شناخت اور انفرادیت قائم کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔

سنگ میل نے اپنی انفرادیت کے قیام اور استحکام کے لیے تخلیقی و تنقیدی دونوں اشاعتی اطراف میں کاوش شروع کی۔ تخلیقی کتب کی (اشاعتی) دنیا میں پیش رفت کے لیے اکرام اللہ کا ناولٹ ''جنگل'' اور مستنصر حسین تارڑ کا ''پیار کا پہلا شہر'' بنیاد بنے۔ مستنصر نے اپنے ایک کالم میں اس زمانے پر روشنی ڈالی ہے۔ مستنصر نے بتایا ہے کہ ان کی کتابیں معروف اشاعتی ادارے ''التحریر'' (بانی: خالد سیف اللہ) چھاپتے تھے لیکن کشور ناہید نے نیاز احمد (بانی سنگ میل) سے کتابیں طبع کرانے کی سفارش کی۔ مستنصر، نیاز احمد سے ملاقات کا احوال کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اگلے روز ایک درمیانی عمر کا وجیہہ شخص، بہت دھیمی اور نرم مزاج کا، میری دکان پر آیا۔ ''میرا نام نیاز احمد ہے۔ سرکلر روڈ پر سنگ میل پبلی کیشنز کے نام سے میری ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میں درسی کتابیں شائع کرتا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ میں ادبی کتابیں بھی شائع کروں۔ آپ مہربانی کریں اور کوئی ایک کتاب عنایت کر دیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔
> اس کا لہجہ اتنا ریشم ایسا نرم اور پرخلوص تھا کہ جب میں نے ایک مرتبہ پھر معذرت کی تو مجھے شرمندگی سی ہوئی۔ نیاز احمد نے میرے انکار کا برا نہ مانا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک بچے کی سی معصومیت تھی۔ ''میں نے اکرام اللہ کا ناولٹ ''جنگل'' شائع کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ باقاعدہ ادبی کتابیں چھاپنے کا آغاز آپ سے کروں۔ اگر کبھی کوئی گنجائش ہوئی تو یاد کر لیجیے گا۔ میں بھی فون پر رابطہ رکھوں گا۔'' (۱۱)

مستنصر کا ناول ''پیار کا پہلا شہر'' دھنک کے مدیر سرور سکھیرا نے پہلے دھنک میں قسط وار اور بعد میں کتابی صورت میں چھاپا لیکن ناول ناشر کی ناتجربہ کاری کے باعث عدم دستیاب یا کمیاب رہا۔ دوسرا ایڈیشن سنگ میل نے بہ اہتمام شائع کیا، بہتر مارکیٹنگ کے باعث سارے ملک میں پھیلایا اور مصنف کو اس کی رائلٹی بھی فوراً ادا کر دی۔ صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں ناول فروخت ہو گیا اور دوسرے ایڈیشن کی نوبت آ گئی، بقول مستنصر یہ ان کے لیے اشاعتی حوالے سے انوکھا تجربہ تھا۔ اس تجربے کے خوشگوار اثرات مستنصر پر بطور مصنف اور سنگ میل پر بطور ادارہ مرتب ہوئے۔ (سنگ میل سے شائع ہونے والی مستنصر کی دوسری کتاب ''خانہ بدوش'' کی پہلی اشاعت پر ادارے

نے انہیں پچیس ہزار (موجودہ تقریباً پانچ لاکھ) رائلٹی پیش کی) (۱۲)

سنگ میل نے آغاز ہی سے تخلیقی کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی کتب شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تخلیقی کتب کی نسبت تحقیقی و تنقیدی مطبوعات کسی نجی اشاعتی ادارے کے لیے کم منفعت کا کام ہے لہٰذا عموماً یہ ''بارگراں'' سرکاری و نیم سرکاری، تعلیمی یا تحقیقی ادارے اٹھاتے ہیں (خصوصاً باب تحقیق میں)

سنگ میل نے شروع کے چند سالوں میں ہی ڈاکٹر وحید قریشی کی ''باغ و بہار ایک تجزیہ'' (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) اور سید اصغر علی شاہ کی مرتبہ ''شعورِ تنقید'' ایسی کتب کی اشاعت سے تحقیقی و تنقیدی شعبے میں اضافہ کیا لیکن سنگ میل کی پہلی معروف تحقیقی و تنقیدی کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کی ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ہے جو پہلی بار ۱۹۷۱ء میں طبع ہوئی۔ (اس کی اشاعتی تفصیل توضیحی کتابیات کے باب میں آئے گی۔)

کسی بھی نجی اشاعتی ادارے کی ایسی مطبوعات جو اس کے لیے زیادہ منافع بخش نہ ہوں، عموماً زیادہ قابل تحسین ٹھہرتی ہیں۔ تخلیقی کتب اور ''پاپولر ادب'' کی نسبت تحقیقی و تنقیدی کتب اسی زمرے میں آتی ہیں؛ چند تنقیدی کتب تجارتی حوالے سے سودمند اور جلد فروخت ہو جانے والی بھی ہوتی ہیں لیکن عموماً ان کی فروخت کا عمل آہستہ روی سے آگے بڑھتا ہے۔

تحقیقی و تنقیدی شعبے میں سنگ میل نے کچھ کتابیں پہلی بار شائع کیں؛ اور کچھ ایسی کتابوں کی نئی اشاعت کا اہتمام کیا جو قبل ازیں دیگر اشاعتی اداروں سے طبع ہو کر کتابی مارکیٹ سے نایاب ہو چکی تھیں۔ مجموعی طور پر سنگ میل نے تحقیقی کتب کم اور تنقیدی زیادہ شائع کیں۔

ادبی تحقیق و تنقید کے حوالے سے تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد نہایت معتبر، قابل حوالہ اور لائق مطالعہ کتب منصۂ شہود پر آ چکی ہیں؛ سنگ میل نے جن اہم ناقدین و محققین کی تصنیف/ تصانیف طبع کیں ان کے نام (بہ لحاظ حروف تہجی) ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

آفتاب احمد، آغا سلیمان باقر، آل احمد سرور، ابو محمد مصلح، اجمل نیازی، احتشام حسین، احسان الحق اختر، احسان الحق، محمد، ارم سلیم، اسلم قریشی، اسمٰعیل میرٹھی، محمد، مولوی، اشفاق حسین، اصغر علی شاہ جعفری، افتخار حسین شاہ، سید، اقبال صلاح الدین، الطاف گوہر، امین راحت چغتائی، انتظار حسین، انور سجاد، انیس ناگی، اے، بی اشرف، بذل حق محمود، تاج سعید، تبسم کاشمیری، جاوید اختر، سید، جمیل جالبی، حسن رضوی، حسن عسکری، حمید اللہ، صاحبزادہ، حنیف شاہد، محمد، خاطر غزنوی، خواجہ محمد زکریا، داؤد رہبر، رام بابو سکسینہ، رفیع الدین ہاشمی، ریاض احمد، ساقی فاروقی، سلیم اختر، سمیع اللہ قریشی، سہیل احمد، سویامانے یاسر، شاہین مفتی، شیما مجید، صفدر حسین، طاہر تونسوی، عابد علی عابد، عاشق حسین بٹالوی، عبداللہ، سید، عطش درانی، عطیہ سید، غلام حسین ذوالفقار، فتح محمد ملک، فرزانہ سید، فرمان فتح پوری، فریدہ ناز، پروفیسر، قاضی جاوید، کشور ناہید، کلثوم نواز، گوپی چند نارنگ، مبارک علی، ڈاکٹر، محمد افضل، میاں، محمد ریاض، محمد سلیم، محمد عثمان، پروفیسر، محمود شیرانی، مظفر عباس، معین الرحمٰن، سید، منیر احمد شیخ، نادم سیتاپوری، ناہید قاسمی، نفیس اقبال، نوید حسن، وحید عشرت، وحید قریشی، یوسف کامران۔

(۱۹۶۲ء سے۲۰۰۲ء تک) درج بالا ناقدین ومحققین میں سب سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی کتب ڈاکٹر سلیم اختر کی شائع ہوئیں (کل انیس کتابیں) ڈاکٹر سلیم اختر کی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کو حاصل ہوئی (اور ۲۰۰۵ء تک اس کے ستائیس ایڈیشن طبع ہو چکے تھے)۔ڈاکٹر فتح محمد ملک کی گیارہ، عابد علی عابد کی آٹھ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی سات، گوپی چند نارنگ کی چھ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی چھ، ڈاکٹر سید عبداللہ کی پانچ، ڈاکٹر طاہر تونسوی کی چار، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، انیس ناگی اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تین تین کتب شائع ہوئیں۔

اس ضمن میں اہم اشاعتی کارنامہ محمد حسن عسکری کے مضامین کی یکجائی ہے جو دو ضخیم کتابوں کی صورت میں سامنے آیا ہے: ''عسکری نامہ'' اور ''مجموعہ محمد حسن عسکری''۔ ان ضخیم کتابوں کے ذریعے محمد حسن عسکری کا سارا تنقیدی سرمایہ (مع افسانوی اثاثہ) درست متن اور خوبصورت طباعت کے ساتھ محفوظ ہو گیا ہے۔ ''مجموعہ محمد حسن عسکری'' اور ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی کلیات: ''تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید'' کے باعث پاکستان میں تنقیدی کلیات کی طباعت کا رواج پڑا اور ادبی محققوں، طالب علموں اور ادب کے عام قارئین کو ایک ہی جلد میں کسی نقاد کے فکری وتنقیدی افکار برائے مطالعہ واستفادہ میسر آنے لگے۔ ''مجموعہ محمد حسن عسکری'' اور (ڈاکٹر سلیم اختر کا تنقیدی کلیات) ''تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید'' طباعتی دنیا میں ایک پُرخطر تجربہ تھا جو کامیاب رہا۔

اردو تحقیق وتنقید کے شعبے میں ایک آباد اور پررونق گوشہ اقبالیات کا بھی ہے۔ سنگ میل، اقبالیات کے سلسلے میں اپنا اشاعتی فریضہ بہ خیر وخوبی انجام دیتا رہا ہے۔ صد سالہ جشن اقبال ۱۹۷۷ء کی مناسبت سے سنگ میل نے گیارہ اہم اور حوالہ جاتی کتب شائع کی تھیں۔ یہ سلسلہ ۲۰۰۲ء تک مناسب رفتار اور موزوں معیار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا ہے۔ (کتب کی تفصیل باب دوم میں)

نظری وعملی تنقید کو تاب وتواں تراجم سے ملتی ہے۔ تنقیدی کتب کے تراجم کی اشاعت کسی حد تک غیر منفعت بخش سرمایہ کاری ہے؛ لیکن دنیا بھر میں تنقیدی کتب کے تراجم کی اشاعت (سرکاری/ نیم سرکاری اور تعلیمی اداروں کے ساتھ) نجی اشاعتی ادارے بہ اہتمام کرتے ہیں لیکن پاکستان میں عموماً یہ بھاری پتھر صرف سرکاری/ نیم سرکاری اور تعلیمی اداروں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔

سنگ میل کی معیاری تنقیدی مطبوعات کے افراط کے تناظر میں تنقیدی تراجم کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے؛ چالیس سال کے طویل زمانی دورانیے میں تنقیدی تراجم کی قابل ذکر مثالیں فقط دو ہیں: ایلیٹ کے مضامین، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی۔ فکر اقبال کا تعارف (فرانسیسی دانشور کی کتاب کا ترجمہ) از ڈاکٹر سلیم اختر۔

سنگ میل کی تحقیقی وتنقیدی مطبوعات سے درج ذیل اشاعتی رجحانات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ عموماً معروف ومقبول ناقدین کو اشاعتی منصوبے میں شامل کیا گیا ہے۔

۲۔ کئی مکاتب فکر کے ناقدین کی کتب شائع ہوئیں اور کئی مکاتب کو قطعاً نظر انداز کیا گیا۔

۳۔ ماضی کی اہم اور کمیاب کتب دوبارہ بہ اہتمام شائع کرنے کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا۔ پاکستان کے بعض سرکاری اداروں کی مطبوعہ قدیم کتابوں کی اشاعت نو کا بندوبست کیا گیا۔

۴۔ عموماً موضوعات اور تنقیدی مواد کے انتخاب، ترتیب اور پیشکش میں کاروباری مصلحتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے (اسے ایک فطری امر بھی کہا جا سکتا ہے)

۵۔ سنگ میل کی کئی تنقیدی مطبوعات عام فہم، مختلف نصابی تقاضوں سے ہم آہنگ اور حسن طباعت کی حامل ہونے کے باعث اور سنگ میل کے بہتر تجارتی نیٹ ورک کے سبب عام قارئین اور چھوٹے بڑے تمام کتب خانوں تک پہنچ گئیں۔ اس طرح تنقیدی کتب کا خصوصی حلقوں اور چند کتب خانوں تک محدود رہنے کا تصور خاصی حد تک ختم ہو گیا۔

۶۔ سنگ میل کے اشاعتی منصوبے میں جدید تر تنقیدی رجحانات شامل رہے ہیں؛ سنگ میل نے کچھ ایسے موضوعات پر ضخیم لیکن خوبصورت کتابیں شائع کیں جو ادبی حلقے کے لیے نو وارد اور عام قارئین کے لیے نامانوس تھے۔ (مثلاً ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' از گوپی چند نارنگ) گویا سنگ میل نے مستقبل کے تنقیدی ادب کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

ایسے پاکستانی معاصر محققین و ناقدین کی تعداد خاصی ہے جن کی کوئی کتاب سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں شامل نہیں۔ گو اس حوالے سے کسی نجی اشاعتی ادارے کو پابند تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے موقر و موثر طباعتی منصوبے سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ہر منبع فکر اور مبلغ علم سے اپنے اشاعتی دائرے کو وسیع اور تر و تازہ کرتا رہے۔ ذیل میں چند اہم ناقدین و محققین کے نام درج کیے جا رہے ہیں جن کی تنقیدی بصیرتوں کو سنگ میل کے طباعتی پیراہن ملنے سے اردو تنقید کی اشاعتی ترویج اور سنگ میل کے طباعتی وقار میں اضافہ ہوتا۔ (نام بہ لحاظ حروف تہجی درج کیے جا رہے ہیں)

ابوالخیر کشفی، ابواللیث صدیقی، احسن فاروقی، اختر حسین رائے پوری، اسلم فرخی، اشتیاق حسین قریشی، امتیاز علی عرشی، انعام الحق کوثر، انور سدید، جیلانی کامران، حامد بیگ مرزا، رشید امجد، سبط حسن، سجاد باقر رضوی، سہیل بخاری، شان الحق حقی، شوکت سبزواری، صلاح الدین احمد، مولانا، عبادت بریلوی، عشرت رحمانی، علی عباس جلال پوری، عندلیب شادانی، عبدالسلام، عبدالقیوم، غلام مصطفےٰ خان، محمد سلیم ملک، ڈاکٹر، مرزا محمد منور، مشفق خواجہ، ممتاز احمد خان، ممتاز شیریں، نجیب جمال، ڈاکٹر، وزیر آغا، یونس جاوید۔

سنگ میل کے اشاعتی کارناموں میں اردو کی قدیم لغات کی طبع نو اور نئی لغات کی تشکیل و طباعت بھی شامل ہے۔

مولوی سید تصدق حسین رضوی کی ''لغات کشوری'' فارسی اور اردو کی معروف لغت اور مطبع منشی نول کشور کا اہم اشاعتی کارنامہ ہے۔ سنگ میل نے اس نایاب لغت کو بہ اہتمام شائع کر کے حلقہ قارئین اور کتب خانوں تک پہنچا کر اس کی حقیقی ''اشاعت'' کی ہے۔

مولوی سید احمد دہلوی کی معروف عالم ''فرہنگِ آصفیہ'' کی تمام جلدیں، مولوی نورالحسن نیر کی مرتبہ مقبول عام ''نوراللغات'' کی

چار جلدیں اور امیر مینائی کی ''امیر اللغات'' کو سنگ میل کی اعلیٰ طباعت اور (اندرون و بیرون ملک) وسیع ترسیل سے نئی نمود ملی۔ علاوہ ازیں درج ذیل اہم، نایاب اور تاریخی اہمیت کی حامل دولسانی / سہ لسانی لغات شائع ہوئیں۔

اردو انگلش اور انگلش اردو ڈکشنری از جان شیکسپیئر، اردو کلاسیکل ہندی اور انگلش ڈکشنری از پلاٹس، اردو انگلش ڈکشنری از ڈنکن فوبس، ہینڈی اردو انگلش ڈکشنری از ایس سنگا جی، لاء اور کمرشل اردو انگلش ڈکشنری از ایس ڈبلیو فیلن۔ ذوالفقار احمد تابش نے ''اعجاز اللغات'' کے عنوان سے نئی لغت ترتیب دی؛ ایک ''اعجاز اللغات'' جدید بھی طبع ہوئی۔

سنگ میل کی ترتیب وتشکیل کردہ کوئی اردو لغت ادارے کی بنیادی پہچان نہ بن سکی۔ (جیسے فیروز سنز کی فیروز اللغات وغیرہ) لیکن سنگ میل کی یہ کاوش قابل قدر ہے کہ اس نے قدیم اہم لغات کو اپنا اشاعتی پلیٹ فارم مہیا کیا اور ان کی بہترین ترسیل کا اہتمام کیا۔ لغات کی اشاعت کے باب میں سنگ میل پاکستان کے ہر قسم کے اشاعتی اداروں (سرکاری/ نیم سرکاری/ نجی) سے پیچھے نہیں رہا۔

افسانوی نثر کے میدان میں سنگ میل کی عطا باقی نثری وشعری مطبوعات سے زیادہ ہے؛ اب تک ڈھائی سو سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں؛ ان میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانے اور افسانوی کلیات شامل ہیں۔ افسانوی کلاسیک کو چھاپنے کے ضمن میں سنگ میل کا سب سے بڑا کارنامہ ''طلسم ہوش ربا'' کی سات ضخیم جلدوں کی اشاعت ہے۔

''طلسم ہوش ربا'' کی اشاعت نو کا انتظار حسین نے روز نامہ مشرق لاہور میں شائع ہونے والے اپنے کالم ''باتیں ملاقاتیں'' میں پر جوش خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں اس کا اشاعتی پس منظر یوں بیان کیا:

> ''ادارہ سنگ میل'' کے مالک نیاز احمد صاحب نے ایک روز باتوں باتوں میں کہا کہ میں طلسم ہوش ربا کو چھاپنے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ میں نے یہ بات ایک کان سنی، دوسرے کان اڑا دی۔ میں نے جتنے ناشروں کو دیکھا ہے کہ ترنگ میں بڑے بڑے دعوے کر ڈالتے ہیں۔ مگر رات گئی بات گئی۔ نیاز صاحب کی اس بات کو بھی میں نے بس ایک دعویٰ جانا اور چپ رہا۔ دل میں سوچا کہ جن اداروں کو سرکاری گرانٹ کی سہولت حاصل ہے ان میں سے تو کسی نے اس داستان کو چھوا نہیں، سنگ میل کیا کھا کے اسے شائع کرنے کی ہمت کرے گا۔
>
> نیاز صاحب نے جب پھر یہ ذکر کیا تو میں نے کہا کہ نیاز صاحب! اگر آپ نے واقعی طلسم ہوش ربا چھاپ ڈالی تو ہم آپ کو دوسرا منشی نول کشور مان لیں گے۔
>
> بات آئی گئی ہوئی۔ اور اس دوران میں نیاز صاحب نے فسانہ آزاد چھاپ ڈالا، سرشار کا یہ شاہکار چار ضخیم جلدوں میں ہے اور کئی ہزار صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر سنگ

میل کی اس اشاعت کو دیکھا اور اب شک ہونے لگا کہ یہ شخص کہیں سچ مچ طلسم ہوش ربا بھی نہ چھاپ ڈالے۔

پہلے تو طلسم ہوش ربا کی ساری جلدوں کی فراہمی ہی ایک مسئلہ تھا، نیاز صاحب نے کنوؤں میں بانس ڈالے اور لشٹم پشٹم ساری جلدیں فراہم کرلیں۔اس کے بعد چل سو چل۔اور اب طلسم ہوش ربا کی اشاعت ہمارے سامنے ہے''۔(۱۳)

''طلسم ہوش ربا'' سے پہلے سنگ میل نے رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد (چار جلدوں پر مشتمل) چھاپا تھا تو پوری ادبی دنیا میں اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا تھا اور کلاسیک کی حیاتِ نو کو عصری اشاعتی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا گیا تھا۔

''فسانہ آزاد'' کی اشاعت کو ڈاکٹر سلیم اختر نے ۱۹۸۴ء کے ادبی جائزے میں پرجوش انداز میں سراہا:

''''فسانہ آزاد'' کی ۴ جلدوں کی اشاعت ایک اہم سنگ میل ہے۔...... سرشار کا یہ شاہکار جو مدت سے عدم دستیاب تھا اسے مکمل صورت میں شائع کرنا بذات خود ایک اہم کارنامہ ہے کیونکہ ۴ ہزار صفحات پر مشتمل ''فسانہ آزاد'' کی اشاعت آسان نہ تھی لہٰذا سب نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا مگر نیاز صاحب کا اس معاملہ میں یہ حال ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی

اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا ''(۱۴)

علاوہ ازیں میر امن کی باغ و بہار کے قدیم نسخے کی اشاعت کو بھی خوب سراہا گیا۔باغ و بہار کے مزید کئی ایڈیشنز شائع ہوئے۔

افسانوی نثر (داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ) کے اہم نام ذیل میں درج کیے جارہے ہیں جنہیں سنگ میل نے بہ اہتمام اپنے اشاعتی منصوبے میں شامل رکھا ہے:(بہ اعتبار حروف تہجی)

آغا سہیل، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، اصغر ندیم سید، اکرام اللہ، انتظار حسین، انوار احمد، انور سجاد، انیس ناگی، اے حمید، بانو قدسیہ، بشریٰ اعجاز، پریم چند، تبسم کاشمیری، ثریا شہاب، جاوید شاہین، جمیلہ ہاشمی، حجاب امتیاز علی، حسن عسکری، خالدہ حسین، خدیجہ مستور، راجندر سنگھ بیدی، راشد الخیری، رسوا، رشید اختر ندوی، رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا، سجاد حیدر یلدرم، سرشار، سعید شیخ، سلیم اختر، شرر، طارق محمود، ظہیر بابر، عابد علی عابد، عبداللہ حسین، عصمت چغتائی، عطیہ سید، عظیم بیگ چغتائی، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، محمد حسین جاہ، منشی محمد خالد اختر، محمد عمر میمن، مستنصر حسین تارڑ، مسعود اشعر، مظہر الاسلام، ممتاز مفتی، منٹو، منیر احمد شیخ، میر امن، مرزا ادیب، نثار عزیز بٹ، نذیر احمد، ڈپٹی، نیلم احمد بشیر، ہرچرن چاولہ۔

افسانوی نثر کے باب میں جن مصنفین کے کلیات/ضخیم مجموعے طبع ہوئے ان کے نام یہ ہیں: (بہ اعتبار حروف تہجی)

احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، اے حمید، بانو قدسیہ، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، راشد الخیری، رسوا، عاشق حسین بٹالوی، عظیم بیگ چغتائی، قرۃ العین حیدر، منٹو، نذیر احمد، ڈپٹی۔

مقبول عام (پاپولر) ادب کے سلسلے میں رضیہ بٹ کے بتیس، بلقیس ریاض کے چار، اے حمید اور دیگر خواتین و حضرات کے متعدد ناول بھی شائع کیے گئے ہیں؛ جن کی اہمیت و افادیت قارئین کے حوالے سے تو ہے، ادب کے حوالے سے نہیں۔

تراجم کے معاملے میں بھی دیگر اصناف کی نسبت افسانوی نثر کا پلڑا بھاری ہے۔ سنگ میل نے مختلف زبانوں انگریزی، جرمن، فارسی، ترکی، بلغارین اور دیگر زبانوں کے افسانوی ادب کو بہ اہتمام شائع کیا۔ اہم مترجمین کے نام (بہ اعتبار حروف تہجی) درج کیے جا رہے ہیں:

آغا بابر، اشفاق احمد، اظہر جاوید، انتظار حسین، بذل حق محمود، جمشید مسرور، حجاب امتیاز علی، حمید یزدانی، رتی سجاد، رضی ترمذی، کشور ناہید، منیر احمد، نثار احمد اسرار

سنگ میل کی افسانوی مطبوعات سے درج ذیل اشاعتی رجحانات سامنے آتے ہیں:

۱۔ سنگ میل نے افسانوی مطبوعات کے ضمن میں کاروباری اور ادبی دونوں قسم کے تقاضے پیش نظر رکھے ہیں؛ کاروباری تقاضے کے پیش نظر پچاس سے زائد پاپولر نوعیت کے ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہوئے اور ہر دہائی میں ان کے لاتعداد ایڈیشنز طبع ہوئے۔ البتہ ادبی تقاضوں کے حامل افسانوی مجموعوں اور ناولوں کی تعداد زیادہ اشاعت پذیر رہی۔

۲۔ سنگ میل نے عموماً پہلے سے معروف و مقبول ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کو ہی اپنے اشاعتی منصوبے کا حصہ بنایا۔

۳۔ نئے، کم معروف، کاروباری طور پر غیر سود مند ناول نگار و افسانہ نگاروں کو عموماً سنگ میل کا اشاعتی پلیٹ فارم میسر نہ آسکا (ایک آدھ استثنائی مثال بہ دقت تلاش کی جا سکتی ہے)

۴۔ افسانوں اور ناولوں کے ضخیم مجموعے شائع کرنے کا پرخطر فیصلہ کامیابی سے ہمکنار ہوا اور ''گمشدہ'' تحریریں بہ آسانی میسر آنے لگیں، ان افسانوی مجموعوں اور کلیات کی اشاعت سے خصوصاً ادب کے طلبہ اور محققین کو سہولت حاصل ہوئی۔

۵۔ معاصر تنقیدِ افسانہ، سنگ میل کی فکشن گیلری سے گزرے بغیر اپنے سفر کو مکمل اور نتائج سفر کو حتمی قرار نہیں دے سکتی، البتہ سنگ میل نے اردو کے چند اہم ترین معاصر ناول و افسانہ نگاروں سے صرفِ نظر کر کے اپنی فکشن گیلری کا ایک حصہ نامکمل ضرور چھوڑ دیا ہے۔

۶۔ جدید تر افسانہ نگار و ناول نگار بھی سنگ میل کی طباعتی فہرست میں شامل ہوئے ہیں۔ علامتی و تجریدی افسانے کے قارئین محدود تھے (اور علامتی و تجریدی افسانے کے مداحین کے پاس ان افسانوں کے مطالعے کے لیے ذرائع بھی محدود تھے کیونکہ عموماً علامتی و

تجریدی افسانے موقر لیکن محدود اشاعت رکھنے والے ادبی جرائد میں طبع ہوتے یا کم معروف اشاعتی اداروں سے بہ صورت مجموعہ شائع ہوتے ہیں اور ان کے مداحین بہ دقت انہیں تلاش کر کے پڑھتے ہیں) سنگ میل کی طباعتی وتجارتی قوت سے علامتی و تجریدی افسانوں کے مجموعے ہر علاقے کے قارئین (اور خصوصاً کتب خانوں) تک پہنچ گئے۔

ڈرامے کے بارے میں عام خیال یہی رہا کہ یہ پڑھے جانے والی صنف نہیں ہے لیکن سنگ میل نے ڈراموں کے پچاس سے زائد ضخیم مجموعے شائع کر کے اس خیال کا بطلان کر دیا۔

سنگ میل سے درج ذیل ڈرامہ نگاروں کے مجموعے شائع ہوئے (بہ اعتبار حروف تہجی)

ابصار عبدالعلی، اشفاق احمد، اصغر ندیم سید، امتیاز علی تاج، امجد اسلام امجد، انور سجاد، انیق احمد، بانو قدسیہ، حجاب امتیاز علی، رضی ترمذی، عابد علی عابد، عظیم بیگ چغتائی، مستنصر حسین تارڑ، منٹو، مرزا ادیب، مرزا ریاض، یونس بٹ، محمد۔

(اشفاق احمد کے نو اور بانو قدسیہ کے سات مجموعے طبع ہوئے)

سنگ میل نے بڑی تعداد میں ٹیلی ویژن ڈرامے شائع کر کے ٹیلی ڈراما کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ سفر نامے کے بعد ٹیلی ڈرامے کے مجموعے سنگ میل کا دوسرا اشاعتی اختصاص ہیں۔ گو کوئی قابل ذکر، مقبول عام اور ادبی طور پر مضبوط ڈرامے سنگ میل کے اشاعتی منصوبے کا حصہ نہیں بن سکے۔

ایسے افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار جن کی کوئی تصنیف سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں شامل نہ ہو سکی ان میں سے چند اہم نام (بہ لحاظ حروف تہجی) ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

احسن فاروقی، احمد داؤد، احمد ہمیش، حامد بیگ مرزا، حمید کاشمیری، حیات اللہ انصاری، رحمٰن مذنب، رشید امجد، سلیم آغا قزلباش، سلیم احمد، سلیم چشتی، شوکت صدیقی، صدیق سالک، صفدر میر، عبدالقادر جونیجو، عرش صدیقی، عزیز احمد، علی تنہا، علیم مسرور، غلام الثقلین نقوی، غلام عباس، فرخندہ لودھی، فضل احمد کریم فضلی، فہیم اعظمی، کمال احمد رضوی، منشا یاد، منو بھائی، نورالہدیٰ شاہ، یونس جاوید۔

شاعری کے باب میں سنگ میل کی اشاعتی عطا نثر سے کم ہے لیکن معمولی اور غیر اہم ہرگز نہیں۔ سنگ میل نے کلاسیکی شعرا کو بھی اہتمام سے شائع کیا، معاصر شعرا اور جدید تر شعرا کو بھی طبع کیا؛ شاعروں کی ضخیم کلیات کی اشاعت کا مشکل لیکن قیمتی مرحلہ بھی طے کیا۔ (کلیات اور ضخیم مجموعہ ہائے نثر و نظم سنگ میل کا اشاعتی اختصاص بن چکے ہیں) سنگ میل نے جن شاعروں کو طبع کیا ان میں سے چند نام (بہ اعتبار حروف تہجی) ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

آتش، آغا صادق، احمد شجاع پاشا، احمد ندیم قاسمی، اختر ہوشیار پوری، اشفاق حسین، اعجاز فاروقی، اظہار الحق، اقبال، امجد اسلام امجد، امین راحت چغتائی، انجم رومانی، بہادر شاہ ظفر، پرتو روہیلہ، تبسم کاشمیری، تصدق حسین خالد، جاوید شاہین، جمشید مسرور، حالی، حزیں

کاشمیری، حسن رضوی، خاطر غزنوی، زاہد ڈار، ساقی فاروقی، سعادت سعید، سودا، شبنم شکیل؛ شہرت بخاری، شہزاد احمد، ضمیر جعفری، ضیا جالندھری، طاہر سعید ہارون، عابد علی عابد، عرش صدیقی، عدم، غالب، فراق، فہمیدہ ریاض، قتیل شفائی، قیوم نظر، کشور ناہید، مجید امجد، محسن احسان، محشر بدایونی، مصحفی، مظفر وارثی، مومن، میرا جی، میر تقی میر، ناصر زیدی، وحید قریشی، یوسف کامران۔

سنگ میل کا قدیم ترین اہم شعری مجموعہ ڈاکٹر وحید قریشی کا ''نقد جاں'' ہے جو ۱۹۶۸ء میں طبع ہوا۔

سنگ میل نے جن شعرا کے کلیات، یکجا صورت میں چند مجموعے اور ضخیم انتخاب کلام بھی شائع کیے ہیں ان شعراء کے نام یہ ہیں:

آتش، احمد ندیم قاسمی، اقبال، بہادر شاہ ظفر، جاوید شاہین، جرات، ساقی فاروقی، سودا، شہزاد احمد، ضمیر جعفری، ضیا جالندھری، عابد علی عابد، غالب، فہمیدہ ریاض، قتیل شفائی، قیوم نظر، کشور ناہید، میرا جی، میر تقی میر۔

پاکستان میں شاعری کے تراجم کی جانب ادبی حلقے کی توجہ کم اور اشاعتی طبقے کی بہت ہی کم رہی۔ سنگ میل کی شعری تراجم پر مبنی کتب فقط تین ہیں: ''عکس'' (محمود درویش کی نظمیں) مترجم امجد اسلام امجد، فلسطین فلسطین مترجم منو بھائی، چینی شاعری مترجم یحییٰ امجد۔

سنگ میل نے شاعری کی کتابیں خاصی تعداد میں شائع کیں اور معاصرین میں سے چند معروف شعراء کو بہ اہتمام شائع کیا لیکن افسانوی نثر اور سفر نامے کی طرح کثیر تعداد میں مقبول و معروف شعراء کو سنگ میل نے اپنے اشاعتی منصوبے کا حصہ نہ بنایا۔

افسانوی نثر میں جدید تر رجحانات کی حامل کتب مناسب تعداد میں شائع ہوئی ہیں لیکن باب شاعری میں نئے، جدید اور تجرباتی میلانات رکھنے والے شعری مجموعوں کی تعداد انتہائی کم ہے۔ ''پاپولر'' اور روایتی لہجے کے حامل (خصوصاً غزل گو) شعرا کی تعداد زیادہ ہے۔ مزاحمتی شعر و ادب سے عمومی طور پر سنگ میل نے تعلق کم رکھا ہے لیکن سب سے زیادہ شعری مجموعے کشور ناہید کے شائع کیے ہیں، جن کا مزاحمتی لہجہ ایک کھلی حقیقت ہے (کل پانچ شعری مجموعے اور دو ضخیم کلیات) کشور ناہید نے اپنی بات نظم و نثر میں آزادی اور بے باکی سے کہی ہے اور سنگ میل نے ان کی نظم و نثر کی اشاعت سے کبھی گریز نہیں کیا۔

ہمارے یہاں شاعری مقدار و معیار میں زیادہ ہوتی رہی ہے لہٰذا کوئی نجی اشاعتی ادارہ کوشش کے باوجود تمام شعراء کی معیاری تخلیقات کو اپنے اشاعتی دامن میں نہیں سمیٹ سکتا؛ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک معتبر، موقر اور کئی حوالوں سے اہم ادارے سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ایسے شعراء سے طباعتی ربط ضرور قائم کرے گا جو ادبی تاریخ میں اپنے لیے ایک اہم مقام بنا چکے ہیں۔ ایسے اہم معاصر شعرا کی فہرست طویل ہے جن کی کوئی کتاب سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں شامل نہ ہو سکی، چند اہم نام (بہ لحاظ حروف تہجی) ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

اقبال عظیم، ابن انشاء، احسان دانش، اختر شیرانی، احمد فراز، احمد مشتاق، ادا جعفری، اسلم انصاری، افتخار عارف، پروین شاکر، تابش دہلوی، جوش ملیح آبادی، جمیل الدین عالی، جون ایلیا، حمایت علی شاعر، خالد اقبال یاسر، شاہد احمد دہلوی، شکیب جلالی، ظفر اقبال، ظہور

نظر،فیض احمد فیض،مسعود حسن شہاب دہلوی،منیر نیازی،ن۔م۔راشد،ناصر کاظمی،وزیر آغا۔

سفر نامہ اردو میں ایک قدیم صنف ہے لیکن اس صنف کے لیے ایک بڑے حلقہ قرأت کی تخلیق سنگ میل کی اشاعتی کاوشوں کے باعث ممکن ہوئی۔سنگ میل نے ستر سے زائد سفر نامے شائع کیے،ان میں بیشتر مقبول عام کتابوں میں شمار ہوتے ہیں؛خصوصاً مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ''بیسٹ سیلر'' کہلاتے ہیں اور ان کے ہر سفر نامے کے متعدد ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔مستنصر کے سفر نامے مصنف اور ناشر کے لیے منفعت وشہرت اور قاری کے لیے خوشگوار اور تحیر خیز دنیاؤں کی سیاحت کا باعث بنے ہیں۔سنگ میل نے اپنے چالیس سالہ اشاعتی دور (۱۹۶۲ء - ۲۰۰۲ء) میں جن مصنفین کے سفر نامے شائع کیے ان کے نام (بہ لحاظ حروف تہجی) ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

آصف جیلانی،آصف فرخی،اختر ممونکا،اسلم کمال،اشفاق احمد،امجد اسلام امجد،امجد ثاقب،انتظار حسین،اے بی اشرف،اے حمید،بشریٰ اعجاز،بلقیس ریاض،پروین عاطف،حسن رضوی،حسین احمد پراچہ،خالد جاوید مشہدی،رضا علی عابدی،رفیق ڈوگر،سعید آسی،سلمیٰ اعوان،سلیم اختر،ش۔فرخ،عباس برمانی،عطاء الحق قاسمی،غازی صلاح الدین،فردوس حیدر،فرید احمد پراچہ،قرۃ العین حیدر،قمر علی عباسی،کرامت بخاری،کشور ناہید،لطف اللہ خان،محمد خالد اختر،محمد کاظم،مستنصر حسین تارڑ،مسکین علی حجازی،ممتاز چھٹہ،ممتاز مفتی،منیر فاطمی۔(مستنصر حسین تارڑ کے سولہ سفر نامے شائع ہوئے؛اختر ممونکا اور رضا علی عابدی کے پانچ پانچ سفر نامے طبع ہوئے۔)

سفر نامے کے باب میں سنگ میل کی مطبوعات کے نمایاں رجحانات یہ ہیں:

۱۔ سفر نامے کی صنف سے سنگ میل کا خصوصی اشاعتی شغف دیکھنے میں آیا ہے۔

۲۔ سفر نامے کے لیے حلقہ قارئین کی تخلیق کے لیے سفر نامے کو کاروباری تقاضوں کی خاطر قدیم اور کلاسیکی انداز سے باہر نکال کر فکشن کے قریب تر کر دیا گیا ہے۔

۳۔ قارئین کے مزاج کو افسانوی/تخیلاتی/امتزاجی (حقیقی سیاحت نامے اور افسانے کا امتزاج) سفر نامے کا عادی بنایا گیا ہے؛ نتیجتاً حقیقی سیاحت ناموں کی مقبولیت محدود ہو کر رہ گئی ہے (لیکن ان کی تخلیق کا سلسلہ جاری رہا ہے)

۴۔ سنگ میل کے شائع کردہ سفر ناموں سے اس صنف کے نئے ذائقے سامنے آئے ہیں۔

مستنصر کے سفر ناموں نے اردو نثر میں اضافہ کیا؛نیز شاعری اور افسانوی نثر کے قارئین کو بھی سفر نامے کی محبت وقرأت میں مبتلا کر دیا ہے۔اس کا بنیادی سبب مستنصر کے اسلوب کی شعریت،کہانی کہنے اور (بنانے) کا شغف اور کبھی شگفتہ مزاجی اور کبھی رومانی پیرائے سے قاری کو گرفت میں رکھنے کا ہنر ہے۔اشفاق احمد کا ''سفر در سفر'' اور افسانوی مجموعے:''سفر مینا'' میں شامل چند سفر نامے مختلف اسلوب اور طرزِ احساس کے حامل ہیں۔سفر در سفر کا شمار سنگ میل کی مقبول عام کتابوں میں ہوتا ہے۔''سفر در سفر'' میں کہانی اور سیاحت ہی آمیز نہیں ہوئی،تاریخ،دانش اور خود نوشت سوانح بھی یکجا ہو گئی ہیں۔انتظار حسین کے سفر نامے،ان کے افسانوں،کالموں،گفتگو،انٹرویوز اور مختصر

مضامین کے اثرات سے ایک نیا ذائقہ تخلیق کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔رضا علی عابدی اور آصف جیلانی نے ایک نئی نوعیت کا سفرنامہ لکھا؛ یہ سفرنامہ دستاویزی،نشریاتی اور ادبی پہلوؤں سے مرکب ہو کر وجود میں آیا ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نوعیت کے سفرناموں کا پہلا نشریاتی روپ بھی مقبول ہوا اور کتابی روپ بھی قارئین کی پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ممتاز مفتی کا سفرنامہ حج ''لبیک'' اردو میں لکھے گئے حج کے تمام سفرناموں سے قطعی طور پر مختلف ہے (گو سنگ میل نے اسے بعد میں شائع کیا،''لبیک'' بہت پہلے ''التحریر'' سے شائع ہو کر معروف ومقبول اور متنازع ہو چکا تھا۔البتہ سنگ میل کے ذریعے اس کی اشاعت وترویج وسیع پیمانے پر ہوئی) مجموعی طور پر اردو نثر کے لیے سنگ میل کے شائع کردہ اکثر سفرنامے تقویت کا باعث بنے ہیں۔سفرنامے کے تراجم کے حوالے سے سنگ میل کی اشاعتی کارکردگی محدود ہے؛ چالیس سالہ طباعتی دورانیہ میں دو ہی قابل ذکر تراجم نظر آتے ہیں: البیرونی کی کتاب الہند (مترجم لطیف ملک،مطبوعہ ۱۹۶۵ء) ابن جبیر کا سفرنامہ (مترجم محمد خالد اختر،مطبوعہ ۱۹۹۴ء)

اردو کے کئی اہم سفرنامہ نگار سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں شامل نہیں ہیں۔سنگ میل نے دیگر اصناف کی طرح قدیم سفرناموں کی دوبارہ اشاعت کی جانب توجہ نہ کی ورنہ اس باب میں بھی سنگ میل کو مالی منفعت کے ساتھ ساتھ علمی وادبی حلقوں کی جانب سے خوب پذیرائی حاصل ہوتی۔(ایک مثال: اردو کا پہلا سفرنامہ (محمد اکرام چغتائی کا مرتب کردہ)۔یوسف خان کمبل پوش کا عجائبات فرنگ ''تاریخی یوسفی'' کے عنوان سے شائع ہو کر خوب مقبول ہوا ہے لیکن یہ اشاعت ۲۰۰۲ء کے بعد کی ہے اور زیرنظر مطالعہ ۲۰۰۲ء تک محدود ہے) اردو کے چند اہم قدیم اور معاصر سفرنامہ نگاروں کی فہرست ذیل میں درج کی جارہی ہے جن سے سنگ میل کا طباعتی ربط قائم نہ ہو سکا: (بہ اعتبار حروف تہجی)

ابن انشاء،ابوالحسن علی ندوی،اختر ریاض الدین،جمیل الدین عالی،حامد علی خان،نواب،ذوالفقار احمد تابش،سرسید احمد خان، سلیمان ندوی،شبلی نعمانی،شریف فاروق،عبادت بریلوی،عبداللہ ملک،عبدالماجد دریا آبادی،عبیداللہ سندھی،غلام الثقلین نقوی،فخر زمان، کریم خان،نواب،ماہر القادری،محمد خان کرنل،محمد خالد اختر،محمد سعید حکیم،محمد طفیل،محبوب عالم مولوی منشی،محمود نظامی،مسیح الدین علوی،نثار علی بیگ،نصیر احمد ناصر،وجاہت علی سید،وزیر آغا،ولی محمد قاضی،یعقوب علی عرفانی۔

سفرنامے سمیت تخلیقی نثر کے باب میں سنگ میل کی اشاعتی کارکردگی قابل توجہ ہے۔(تخلیقی نثر میں (سفرنامے سمیت) آپ بیتی،سوانح،طنز ومزاح،مضامین،مکاتیب وغیرہ شامل ہیں۔)

نثر کے شعبے میں آزاد،اقبال،الطاف حسین حالی،سرسید احمد خان کے مضامین،مکاتیب اور سوانح کی حامل کتب بہ اہتمام شائع کی گئیں۔آپ بیتی اور سوانح کے باب میں سنگ میل کی نمایاں ترین کتاب ''شہاب نامہ'' ہے جو بلا شبہ سنگ میل کی اشاعتی حیثیت اور تجارتی وقار کو بڑھانے کا باعث بنی۔دیگر آپ بیتیاں یہ ہیں: (بہ لحاظ حروف تہجی)

الطاف گوہر کی گوہر گزشت، انتظار حسین کی چراغوں کا دھواں، انعام الحق، ائیر کموڈور کی ایام رفتہ ،جعفر تھانیسری کی کالا پانی، سردار محمد چودھری کی متاع فقیر، شہرت بخاری کی کھوئے ہوؤں کی جستجو، ظفر احسن ایبک کی خاطرات، عشرت رحمانی کی عشرت فانی، کشور ناہید کی بری عورت کی کتھا، لطف اللہ خان کی ہجرتوں کے سلسلے، مرزا ادیب کی مٹی کا دیا۔

آپ بیتی کے ضمن میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ایک منفرد تجربہ کیا۔ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی بکھری ہوئی لاتعداد تحریروں سے ان کی آپ بیتی بازیافت کی اور اپنے قلم سے ایک لفظ کا اضافہ کیے بغیر سچ مچ کی ایک آپ بیتی اردو نثر کے حوالے کر دی۔ سنگ میل نے ''آپ بیتی رشید احمد صدیقی'' کے عنوان سے اس کے تمام ایڈیشنز بہ اہتمام شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مولوی عبدالحق کی سوانح بھی اسی طریق اور اسلوب میں ''ذکر عبدالحق'' کے نام سے مرتب کی لیکن اسے مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ سنگ میل نے سوانحی نوعیت کے مواد کی حامل درج ذیل کتب بھی شائع کی ہیں:

آغا ناصر کی گمشدہ لوگ، اے حمید کی داستان گو، بانو قدسیہ کی مرد ابریشم، حجاب امتیاز علی کی (ڈائری کے چند حصے) لیل و نہار، ضمیر جعفری کی (ڈائری کے چند صفحے) ضمیر حاضر، ضمیر غائب، کشور ناہید کی لیلیٰ خالد۔

سنگ میل نے آپ بیتیاں دیگر اصناف نثر و نظم کے مقابلے میں کم چھاپی ہیں لیکن اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ اردو میں آپ بیتیاں لکھنے کا رواج کم ہی رہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ بیتیوں کی اشاعت بہت زیادہ منفعت بخش ثابت نہیں ہوتی سوائے ان آپ بیتیوں کے جو افسانوی انداز کی حامل ہوں یا کسی سبب سے متنازع ہو جائیں۔ آپ بیتی کے باب میں سب سے نمایاں، مقبول عام اور مالی طور پر منفعت بخشی آپ بیتی قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' ہے؛ اس کی مقبولیت کے عقب میں افسانوی اسلوب و مواد کی بھرپور کار فرمائی موجود ہے۔ (مزید تفصیل توضیحی کتابیات میں) کشور ناہید کی آپ بیتی ''بری عورت کی کتھا'' اپنے عنوان کی طرح چونکانے کی صفت لیے ہوئے ہے۔ یہ آپ بیتی دوٹوک، دبنگ اور بے باک نسائی لہجے کے باعث (مختصر ہونے کے باوجود) سنگ میل کی ایک اہم اشاعت کے طور پر جانی جاتی ہے۔ قدیم خودنوشت سوانح (اور سفرنامہ) مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' کی اشاعت بھی سنگ میل کی قابل ذکر طباعتی کارگزاری میں شامل ہے۔ ظفر احسن ایبک کی ''خاطرات'' کی اہمیت تاریخی، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' اور عشرت رحمانی کی ''عشرت فانی'' کی اہمیت ادبی اور مرزا ادیب کی آپ بیتی ''مٹی کا دیا'' کی اہمیت معاشرتی و ادبی دونوں طرح کی ہے۔

طنز و مزاح کے شعبے میں سنگ میل نے جہاں امتیاز علی تاج، پطرس بخاری اور شفیق الرحمٰن کی معروف و مقبول کتب دوبارہ بہ اہتمام طبع کیں؛ وہاں اے حمید، سعیدہ مشکور، سلیم اختر کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں پر مشتمل کتب پہلی بار شائع کیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے شگفتہ اخباری کالموں کے سات مجموعے اور ظفر اقبال کے طنزیہ کالموں کا ایک مجموعہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں (کالموں کے مجموعے زیر نظر مطالعے سے خارج ہیں) ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی پچیس سے زائد ''پاپولر ادب'' کی حامل کتب بھی سنگ میل سے شائع ہوئیں (ان کتب میں

مزاحیہ کالم، مضامین، ڈرامے، خاکے وغیرہ شامل ہیں) ڈاکٹر محمد یونس بٹ ٹیلیویژن، اخبار اور کتاب تینوں سطحوں پر قبولیت عام رکھنے والے مزاح نگار ہیں۔لفظوں کی الٹ پلٹ، سیاسی حالات و شخصیات کے مضحکہ خیز پہلوؤں کی پیشکش اور ایک فرضی شگفتہ بیان سے حقیقت کا انکشاف ان کے بنیادی حربے ہیں۔

سنگ میل نے شفیق الرحمٰن کے تمام مجموعوں کو بصورت کلیات دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ اشاعت ۲۰۰۳ء میں سامنے آئی، کسی اہم مزاح نگار کی اتنی بڑی کلیات کا سامنے آنا مزاح کی اشاعت کے باب میں سنگ میل کا منفرد کارنامہ قرار پایا ہے۔(دو جلدوں کے کل صفحات ۱۳۳۴ ہیں) ایک انوکھی کتاب سعیدہ مشکور (بیگم مشکور حسین یاد) کی ڈائری ہے؛ بیگم کی ڈائری کے عنوان سے اس مزاحیہ روز نامچے میں مزاح نگار (مشکور حسین یاد) خود مزاح کی زد پر ہیں؛ مضحک پہلوؤں کو طشت از بام کرنے والی یہ کتاب محبت سے عبارت ہے اور میاں بیوی دونوں کی حس مزاح اور حوصلہ مندی کو ظاہر کرتی ہے۔

تخلیقی نثر کے باب میں سفر نامے، آپ بیتی، طنز و مزاح کے علاوہ لطیف تر، فکر انگیز اور شعریت کی حامل نثر بھی اشاعت پذیر ہوئی ہے، جن میں نمایاں نام منظور الٰہی شیخ، داؤد رہبر، فلک پیما، مظہر الاسلام اور سلمان بٹ کے ہیں۔منظور الٰہی شیخ کی تینوں کتب پہلے بھی متعدد بار شائع ہوئیں؛ سنگ میل نے انہیں بہ اہتمام شائع کر کے اپنی ترسیلی صلاحیت کے ذریعے ملک کے طول وعرض میں پھیلا دیا (قبل ازیں منظور الٰہی شیخ کی تحریروں کے مداحین ان کی تمام کتب قدرے دقت سے حاصل کر پاتے تھے (خصوصاً ادبی مراکز سے دور شہروں میں)؛ اسی طرح سنگ میل نے فلک پیما کے مجموعہ مضامین کو شائع کر کے کتابی اور ادبی اُفق سے غائب ہوتے مصنف کو حیات نو دی ہے۔ داؤد رہبر کی البیلی نثر کے دلاویز مجموعے بھی مصنف کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنے ہیں۔سلمان بٹ کے انشائیوں کا مجموعہ ''سفید بال'' سنگ میل کا واحد انشائی مجموعہ ہے۔

انشائیہ ایسی نہایت اہم نثری صنف سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں باقی اصنافِ نثر و نظم کی طرح شامل نہ ہوسکی۔اس کی بنیادی وجہ تجارتی طور پر اس صنف کا غیر منفعت بخش اور تنقیدی سطح پر متنازع ہونا ہے۔انشائیے کے حوالے سے لکھی جانے والی ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی کتاب ''انشائیہ کی بنیاد'' بھی متنازع ثابت ہوئی۔(سنگ میل اور دیگر اہم اشاعتی اداروں کی انشائیے سے بے اعتنائی کے باوجود انشائیوں کے متعدد مجموعے اور انتخاب شائع ہونا ایک بڑا اشاعتی واقعہ بھی ہے)

تخلیقی نثر میں سفر نامے اور طنز و مزاح کی مانگ زیادہ رہی۔اسی لیے ان دونوں شعبوں کی ڈھیروں کتب طبع ہوئیں؛ دیگر اصناف (آپ بیتی، مضامین، مکاتیب، سوانح وغیرہ) کی کتب سنگ میل کے مجموعی اشاعتی تناظر میں کم ہیں لیکن نا قابل فراموش ہرگز نہیں۔اردو کے عام قارئین عموماً شاعری اور ناول، افسانے سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں؛ سنگ میل نے ان اصناف کے علاوہ تخلیقی نثر کے قارئین کا ایک حلقہ بھی اپنی خوبصورت اور متنوع مطبوعات سے محکم کیے رکھا اور یوں اردو کے نثری ادب کی اشاعت و ترویج کے لیے ایک اہم خدمت

انجام دی۔تخلیقی نثر کے باب میں درج ذیل اہم اور صاحب طرز نثر نگاروں سے سنگ میل کا اشاعتی ربط نہ پیدا ہو سکا۔(بہ اعتبار حروف تہجی ذیل میں نام درج کیے جا رہے ہیں)

ابن انشاء، ابراہیم جلیس، احسان دانش، اسلم فرخی، اکبر حمیدی، انور سدید، جمیل آذر، جوش ملیح آبادی، چراغ حسن حسرت، رستم کیانی، رشید امجد، شوکت تھانوی، صدیق سالک، غلام الثقلین نقوی، غلام جیلانی اصغر، محمد خان کرنل، مختار مسعود، مرزا محمد منور، مسعود مفتی، مشتاق احمد یوسفی، مشتاق قمر، منشایاد، مہدی افادی، نظیر صدیقی، وزیر آغا۔

اہم، نمایاں اور اپنے زمانے کا مثالی اشاعتی ادارہ ہر قابل ذکر معاصر کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔سنگ میل جس کے اہم، نمایاں اور مثالی ہونے کا اعتراف کیا جاتا ہے، اگر ہر اہم معاصر کو اپنے اشاعتی منصوبے میں شامل کر لیتا (یا کرنے کی کوشش کرتا) تو اس کے وقار و معیار میں مزید اضافہ ہوتا اور اس کی غیر جانبداری کا تاثر محکم ہوتا۔معروف محقق ڈاکٹر شاہد حسن رضوی (مدیر سہ ماہی الزبیر) سنگ میل کی اشاعتی کاوشوں کو سراہتے ہوئے اس معاملے کو بھی نشان زد کرتے ہیں:

> ''سنگ میل نے ادبی مطبوعات کو نیا آہنگ دیا ہے۔اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں معیاری کتب پیش کی ہیں۔لیکن مجموعی صورتحال کے تناظر میں یہ بہت کم کام ہے۔سنگ میل نے بہت اہم معاصر ادیبوں اور شاعروں کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اپنی حیثیت کو اشاعتی تاریخ کی نظر میں کم کر دیا ہے''۔(۱۵)

سنگ میل کے سخت ناقد بھی اس کے اشاعتی معیار کو سراہتے ہیں لیکن مصنفین کے انتخاب اور کتب کی قیمتوں پر اپنے اپنے نقطہ نظر سے تحفظات رکھتے ہیں۔معروف شاعر پروفیسر محمد خالد اشاعت ادب کے حوالے سے سنگ میل کی کارکردگی پر اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> ''سنگ میل کی حیثیت اشاعت ادب کے مافیا کی ہے بکنے والے اور بکوانے والے مصنفین سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔کتب کی اشاعت کا معیار اعلیٰ ہے لیکن قیمتیں مناسب سے بہت زیادہ''۔ (۱۶)

گویا علمی و ادبی حلقہ اہم معاصرین کو نظر انداز کرنے اور کتابوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے کرنے پر سنگ میل کو کوئی ''رعایت'' دینے پر تیار نہیں ہے۔(قیمتوں کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ اسی باب میں آگے چل کر لیا جائے گا اور نظر انداز معاصرین کی نشاندہی ،سنگ میل کی تخلیقی و تنقیدی مطبوعات کا جائزہ لیتے ہوئے کر دی گئی ہے) اردو اور پنجابی کے معروف شاعر اور افسانہ نگار غلام حسین ساجد سنگ میل کے حوالے سے یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں:

> ''سنگ میل پبلی کیشنز خالصتاً استیصالی ادارہ ہے۔ان کی مطبوعات صرف لائبریریوں کی زینت بننے کے لیے شائع ہوتی ہیں۔وہ عام قاری کی دسترس سے باہر اور بعض مخصوص صاحب اقتدار

لوگوں کی خاصیہ فرسائی کے لیے شائع کی جاتی ہیں''۔(۱۷)

درج بالا تینوں آ را سے کشور ناہید اختلاف رکھتی ہیں، وہ لاہور کے طباعتی اداروں میں سنگ میل کو ہی سب سے اہم، موثر اور معتبر سمجھتی ہیں اور ان کی رائے میں علم وادب کی خدمت، مصنفین سے ربط اور قارئین تک کتابیں بہ آ سانی پہنچانے میں سنگ میل کا کوئی پاسنگ نہیں؛ وہ اپنے مضمون ''لاہور کے طباعتی ادارے'' میں لکھتی ہیں:

> ''یہ صرف سنگ میل کو خیال آیا کہ پرانے گزیٹیئرز سے لے کر اسباب بغاوت ہند، الہلال، طلسم ہوش ربا اور فسانہ آزاد کو نابود سے، وجود تک لے کر آئے اسی طرح انگریزوں کے زمانے کی مطبوعات کو دوبارہ زندگی دی۔ پاکستانی ادیبوں کو تاریخ وسیاست کے سارے موضوعات پر لکھنے کے لیے اکسایا اور یوں کتابوں کو الماریوں سے نکال کر پڑھنے والے کے ہاتھ میں دے دیا''۔(۱۸)

ڈاکٹر سلیم اختر سنگ میل کے مستقل مصنف ہیں؛ سوائے چند کتابوں کے ان کی تمام تصانیف (تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی) سنگ میل سے ہی شائع ہوئی ہیں؛ پاکستان کے دیگر اشاعتی اداروں کی علمی وادبی کارکردگی کے تناظر میں وہ سنگ میل کو ''اردو زبان وادب کی آبیاری'' کے لیے واحد اور یکتا ادارہ خیال کرتے ہیں؛ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

> ''آج سنگ میل پبلی کیشنز نے جو بین الاقوامی شہرت حاصل کر رکھی ہے؛ تو بنیادی سبب نیاز صاحب (اور صاحبزادوں اعجاز احمد اور افضال احمد) کی محنت، دیانتداری، معاملات میں کھرا ہونا اور اشاعت کتب میں نئے نئے تجربات ہیں۔ کتنے ناشر ہیں، جو ضخیم لغات، گزیٹر، ناولوں، افسانوں کے مکمل ''مجموعے'' اقبالیات اور طلسم ہوش ربا کا سیٹ، شاعری کے ساتھ تنقیدی کلیات اور پھر ان سب پر مستزاد انگریزی کتب شائع کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ان دنوں ساٹھ ستر قبل پڑھائی جانے والی اردو نصاب کی کتب (جیسے سرمایہ اردو مرتبہ حافظ محمد شیرانی) شائع کر رہے ہیں۔ الغرض! اردو زبان وادب کی آبیاری کے لیے نیاز احمد اپنے وجود میں تنہا ہی ادارہ ہیں''۔(۱۹)

سنگ میل کے اشاعتی حسن ومعیار پر خاصی حد تک آرا مشترک ہیں لیکن اہم معاصرین کو اشاعتی اہمیت دینے، غیر جانبداری برتنے، کتابوں کی عوامی ترسیل اور قیمتوں کی موزونیت کے حوالے سے آرا منقسم ہیں؛ اسی طرح دیگر اشاعتی اداروں کی طرح سنگ میل پر بھی ادیبوں کے ایک حلقے کو وجود میں لانے، فوقیت اور فروغ دینے کے حوالے سے تحفظات اور اعتراضات موجود ہیں؛ مثلاً معروف ناول

نگار عرفان احمد خان (جو کہ خود بھی ایک ناشر ہیں) لکھتے ہیں:

''کسی زمانے میں ادب میں لیفٹ اور رائیٹ گروپ ہوا کرتے تھے اب اشاعتی اداروں کے رائٹرز کے گروپ وجود میں آ چکے ہیں مثال کے طور پر مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین کے خلاف محض اس لیے بات نہیں کریں گے کہ وہ بھی سنگ میلین ہیں۔ یہی معاملہ دیگر اشاعتی اداروں کا بھی ہے''۔(۲۰)

نئے ادیبوں کو متعارف کرانے کے حوالے سے اشاعتی اداروں کے رویے پر عرفان احمد خان کی رائے یہ ہے:

''میرے سامنے تو صرف ایک ہی اشاعتی ادارے ''التحریر'' کی مثال ہے جنہوں نے بہت سے بڑے رائٹرز کا پہلا ایڈیشن شائع کیا اور انہیں ادبی دنیا میں متعارف کروایا۔ دو چار کے نام میں جانتا ہوں جو ''التحریر'' سے پہلی بار شائع ہوئے اور معروف ہوئے مثال کے طور پر پروین شاکر اور مستنصر حسین تارڑ۔ سنگ میل نے تو ہمیشہ جیتنے والے گھوڑے پر داؤ کھیلا ہے اور کامیاب رہے ہیں انہوں نے کبھی گھاٹے کا سودا کیا ہی نہیں۔ ویسے بھی سنگ میل اپنی کتاب لائبریریوں میں ڈمپ کرنے کے معاملے میں شہرت رکھتا ہے، اس کی کتابیں سوائے دو چار کے، عام قاری کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ''التحریر'' کے علاوہ کسی اور اشاعتی ادارے کا اتنا بڑا کردار نہیں کہ ذکر کیا جا سکے''۔(۲۱)

نئے/نو آموز/نو وارداور مستقبل کے ممکنہ اور متوقع بڑے ادیبوں کی اولین اشاعتوں سے گریز کا عمل سنگ میل کے طباعتی کاروبار کی پہلی دہائی میں کم اور باقی تین دہائیوں میں بڑھتا چلا گیا۔ بانی ادارہ نیاز احمد کی رائے اس حوالے سے کچھ یوں ہے:

''ہم نئے لکھنے والوں کی کتابیں نہیں چھاپتے کیونکہ ان کی اصلاح نہیں ہوئی ہوتی اور کسی کو اگر یہ کہہ دیا جائے کہ بھائی اپنی اس کتاب کو کسی سینئر ادیب یا شاعر کو دکھا لو تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تخلیق کو حرف آخر سمجھتا ہے حالانکہ دنیا میں ہر جگہ کتاب کو چھپنے سے پہلے مکمل طور پر ایڈیٹنگ کے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ سارے پبلشرز نیک ہیں یا تمام لکھنے والوں کی شکایات درست ہیں مگر اس معاملہ میں دونوں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں''۔(۲۲)

طباعت و اشاعت سے وابستہ کوئی نجی تجارتی ادارہ اس حوالے سے پابند تو نہیں ہے کہ وہ ضرور تمام مصنفین کو شائع یا نئے ادیبوں

کی اشاعت اول کا اہتمام کرے؛ اس سلسلے میں وہ قطعاً آزاد ہوتا ہے، اپنی ترجیحات کے مطابق فیصلہ کرتا ہے البتہ جب کوئی اشاعتی ادارہ بے حد نمایاں، اہم اور ایک مثالی حیثیت اختیار کر لے (یا مثالی حیثیت رکھنے کا دعویٰ کرے) اور اس کے طباعتی انداز اور اشاعتی اطوار کی تقلید بھی ہونے لگے تو علمی و ادبی حلقے اور قارئین و ناظرین کے طبقے اس سے یہ توقعات ضرور رکھتے ہیں کہ وہ مصنفین کے انتخاب میں مخصوص اور محدود ہونے کے بجائے عمومیت، وسیع النظری اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کرے گا، ''بیسٹ سیلر'' ادیبوں کے ساتھ ساتھ ادب کے نقطہ نظر سے نہایت اہم (اور مارکیٹ کے نقطہ نظر سے کم اہم) ادیبوں اور نو آموز لیکن حقیقی اور پر از امکانات تخلیق کاروں کو بھی اشاعتی پذیرائی سے محروم نہیں رکھے گا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ کسی بھی اہم (یا بعد ازاں اہم ہو جانے والے) ادیب و شاعر کی اشاعتی پذیرائی ادارے کی معاشرتی و ادبی پذیرائی میں ہمیشہ اضافے کا باعث بنتی ہے۔ سنگ میل کے اشاعتی معیار، مطبوعاتی حجم اور فروغ کتاب کی کاوشوں کے باوجود مذکورہ بالا زاویوں سے سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مصنفین کے انتخاب و اشاعت کے علاوہ کسی اشاعتی ادارے کی مطبوعات کے مواد کے حوالے سے بھی بعض اوقات تنازعات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ متنازع مواد کی عموماً تین نوعیتیں ہوتی ہیں: اول، معاشرے کی نظر میں متنازع: معاشرہ کسی کتاب یا اس کے کسی حصے پر اس وقت معترض ہوتا ہے جب کتابی مواد معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی حدود سے متجاوز ہو۔ دوم: حکومت یا مقتدر طبقوں کی نگاہ میں متنازع: سوم: علمی و ادبی حلقے کی نظر میں متنازع۔ سنگ میل نے اول الذکر دونوں نوعیتوں کا مواد کبھی شائع نہیں کیا۔ گو سنگ میل نے تیسری نوعیت کے متنازع مواد کی اشاعت سے بھی حتی المقدور گریز کیا لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود درج ذیل کتب کلی یا جزوی طور پر نزاعی ثابت ہوئی ہیں:

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر (دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی کتاب شعبہ تنقید میں سنگ میل کی سب سے مقبول کتاب ہے) انشائیہ کی بنیاد از ڈاکٹر سلیم اختر، ہدایت نامہ شاعر از ساقی فاروقی، انداز نظر از فتح محمد ملک (صرف چند حصے)، اردو نظم میں موجودیت از شاہین مفتی (صرف چند حصے)، لبیک از ممتاز مفتی (گو یہ سفر نامہ حج ماہانہ سیارہ ڈائجسٹ میں قسط وار اور ''التحریر'' سے کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول اور خوب متنازع ہو چکا تھا؛ سنگ میل نے اس کی نزاعی کیفیت کی شدت کم ہو جانے پر اسے چھاپا) لبیک کو ادبی کے ساتھ ساتھ معاشرتی و مذہبی طور پر متنازع کتب کے زمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے نیاز احمد کہتے ہیں:

> ''سنگ میل نے آغاز سے ہی یہ پالیسی رکھی ہے کہ کوئی کتاب (یا اس کا کوئی حصہ) اسلام، پاکستان اور کسی شخص کے خلاف ہرگز نہ ہو۔ سنگ میل آج بھی اس اصول پر کاربند ہے۔ سنگ میل اپنے مصنفین پر سوائے ان تین امور کے کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ ادب میں تنازعات چلتے رہتے ہیں، بعض اوقات ان کا عکس مطبوعات میں بھی آ جاتا ہے۔.... ساقی فاروقی کی

''ہدایت نامہ شاعر'' میں فقط شاعروں کی غلطیاں نکالی گئی ہیں''۔ (۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ ساقی فاروقی کی کتاب میں فقط غلطیاں نہیں نکالی گئیں بلکہ اہم شاعروں پر طنز و تشنیع کے تمام معاصر ریکارڈ توڑ دیئے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی سیکڑوں کتابوں کے طباعتی تناظر میں فقط دو تین کتابوں کا کلی یا جزوی طور پر متنازع ہو جانا، اشاعتی ادارے کی منفی کارکردگی کے زمرے میں نہیں آتا۔

ہر اشاعتی ادارے کی مطبوعات کے اندراجات اور صوری معیار کے ساتھ ساتھ ان کی دستیابی اور قیمتیں بھی موضوع بحث بنتی ہیں کیونکہ کتاب کی قیمت سے قاری کا مالی معاملہ براہ راست جڑا ہوتا ہے؛ اچھا ناشر اچھی کتاب شائع کرنے کے ساتھ ساتھ کتاب کی رسائی کو بھی قاری کے لیے ممکن بناتا ہے (یا اسے بنانا چاہیے)؛ اس حوالے سے سنگ میل کے طباعتی و تجارتی رویے کا (قیمتوں کے حوالے سے) مفصل جائزہ لینا ضروری ہے (کیونکہ یہ مسئلہ خاصی نزاعی ہے)

سنگ میل کی پہلی اشاعتی دہائی (۱۹۶۲ء۔۱۹۷۲ء) میں اس کی مطبوعات کی قیمتوں کی صورتحال، قارئین کے نقطہ نظر سے بہت بہتر اور مناسب رہی حالانکہ مطبوعات کا معیار (کاغذ/ طباعت/ جلد بندی کے حوالے سے) نہایت اچھا تھا۔ اس بات کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۹۶۷ء میں رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' (مترجم: محمد عسکری مرزا) ۷۵۰ صفحات پر شائع ہوئی، قیمت ساڑے بارہ روپے تھی۔

۱۹۶۷ء میں ہی احسان الحق اختر کی ''مثنوی سحر البیان۔ ایک تہذیبی مطالعہ'' شائع ہوئی، قیمت سات روپے اور صفحات ۳۴۸ تھے۔

۱۹۶۸ء میں تبسم کاشمیری کی کتاب ''نقدِ سرشار'' ۳۰۸ صفحات پر شائع ہوئی، قیمت ساڑے چار روپے تھی۔

۱۹۶۸ء میں وحید قریشی کا شعری مجموعہ ''نقدِ جاں'' شائع ہوا، اس کی قیمت چھ روپے تھی (۷۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت اعلیٰ کاغذ اور عمدہ طباعت کے ساتھ سامنے آئی تھی)

۱۹۶۸ء میں ہی سید اصغر علی شاہ جعفری کی کتاب ''شعورِ تنقید'' طبع ہوئی قیمت پانچ روپے اور صفحات ۱۷۵ تھے۔

۱۹۶۹ء میں سید آغا حیدر کی مرتبہ ''مطالعہ آب حیات'' (منتخب مقالات) ۱۸۴ صفحات پر طبع ہوئی، قیمت پانچ روپے تھی۔

۱۹۷۰ء میں نادم سیتاپوری کی ''غالب نام آورم'' شائع ہوئی، قیمت ساڑھے سات روپے تھی اور صفحات ۳۷۶ تھے۔

۱۹۷۰ء میں ہی تبسم کاشمیری کی مرتبہ ''آب حیات'' طبع ہوئی، قیمت ساڑھے بارہ روپے تھی اور صفحات ۴۳۱ تھے۔

۱۹۷۰ء میں وحید قریشی کی ''نذرِ غالب'' پہلی بار شائع ہوئی، قیمت ساڑھے سات روپے اور صفحات ۳۴۲ تھے۔

۱۹۷۱ء میں وحید قریشی کی ''نذر غالب'' کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا (دوسرا ٹائپ جبکہ پہلا ایڈیشن لیتھو میں تھا) تو قیمت دس روپے

اور صفحات ۳۴۲ ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں اقبال صلاح الدین کی کتاب ''حضرت امیر خسرو کی پہلیاں اور کہہ مکرنیاں'' شائع ہوئی، ۱۶۸ صفحات تھے اور قیمت تین روپے تھی۔

۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر سلیم اختر کی ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' شائع ہوئی، قیمت آٹھ روپے تھی اور صفحات ۲۵۶ تھے۔

دوسری طباعتی دہائی (۱۹۷۲ء۔۱۹۸۲ء) میں قیمتوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ لیکن اس اضافے کو قارئین کے لیے پریشان کن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً:

۱۹۷۷ء میں ناصر زیدی کا شعری مجموعہ ''ڈوبتے چاند کا منظر'' بارہ روپے کا تھا، صفحات ۱۱۲ تھے۔

۱۹۷۸ء میں اعجاز فاروقی کے شعری مجموعے ''سورج کی آنکھ'' کی قیمت پچیس روپے تھی، صفحات ۱۵۰ تھے۔

۱۹۷۸ء میں ہی حزیں کاشمیری کا شعری مجموعہ ''ناز و نیاز'' شائع ہوا تو اس کی قیمت اکیس روپے تھی، صفحات ۱۸۴ تھے۔

۱۹۸۱ء میں تاج سعید کی کتاب ''کرشن نگر'' پہلی بار شائع ہوئی تو اس کی قیمت تیس روپے تھی، صفحات ۲۸۶ تھے۔

تیسری دہائی (۱۹۸۲ء۔۱۹۹۲ء) میں قیمتوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا لیکن بعض کتابوں کی قیمتیں مناسب اور قاری کی پہنچ میں رہیں؛ دونوں طرح کی مثالیں درج کی جا رہی ہیں:

۱۹۸۳ء میں آغا سہیل کے افسانوی مجموعے ''شہر نا پرساں'' کی قیمت پچیس روپے تھی، صفحات ۱۷۶ تھے۔

۱۹۸۳ء میں ہی اشفاق احمد کی ''تو تا کہانی'' کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا قیمت ۷۵ روپے تھی، صفحات ۴۹۶ تھے۔

۱۹۸۴ء میں یوسف کامران کے شعری مجموعے ''سفر تمام ہوا'' کی قیمت اکیس روپے تھی، صفحات ۱۰۹ تھے۔

۱۹۸۴ء میں ہی رتن ناتھ سرشار کی ''فسانہ آزاد'' کی چاروں جلدوں میں پہلی دو جلدوں کی قیمت دو دو سو روپے اور دوسری دو جلدوں کی تین تین سو روپے تھی، صفحات بالترتیب یہ تھے: ۶۷۲، ۴۴۴، ۱۱۴۸، ۱۰۷۲

۱۹۸۵ء میں بانو قدسیہ کی کتاب ''نا قابل ذکر'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، قیمت پچاس روپے تھی، صفحات ۲۸۶ تھے۔

۱۹۸۷ء میں مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ''اندلس میں اجنبی'' کی تیسری اشاعت عمل میں آئی، قیمت نوے روپے تھی، صفحات ۴۲۲ تھے۔

۱۹۸۷ء میں ہی مظہر الاسلام کا افسانوی مجموعہ ''باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی'' شائع ہوا، قیمت پینتالیس روپے تھی، صفحات ۱۸۶ تھے۔

۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوی مجموعے ''کڑوے بادام'' کی قیمت ۹۰ روپے تھی، صفحات ۲۹۹ تھے۔

۱۹۸۹ء میں اے حمید کے سفر نامے ''امریکا نو'' کی قیمت ایک سو پچاس روپے تھی حالانکہ صفحات ۴۹۱ تھے۔

۱۹۸۹ء میں ہی محمد عمر میمن کے افسانوی مجموعے ''تاریک گلی'' کی پہلی اشاعت سامنے آئی تو اس کی قیمت ساٹھ روپے تھی، صفحات ۱۸۰ تھے۔

۱۹۹۰ء میں عابد علی عابد کا مجموعہ ناول وافسانہ ''داغ ناتمام'' کے نام سے چھپا تو اس کی قیمت صرف ایک سوبیس روپے تھی اور صفحات ۳۹۶ تھے۔

۱۹۹۱ء میں ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' کی قیمت چار سو پچاس روپے تھی،

۱۹۹۲ء میں ''الکھ نگری'' کی قیمت پانچ سو روپے تھی، صفحات ۹۹۶ تھے۔

اس دہائی میں قیمتوں میں اضافہ محسوس ہونے کے باوجود بعض ضخیم کتابوں کی قیمتیں موزوں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد کی دہائی میں قیمتیں بڑھتی چلی گئیں۔ کتب کی قیمتوں میں اضافے کی درج ذیل امکانی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

ا: عمومی طور پر پورا ملک مہنگائی کی زد پر رہا۔ ب: کاغذ کی قیمتوں اور طباعتی معاوضوں میں اضافہ ہوا۔ ج: سنگ میل نے اپنی مطبوعات کے لیے کاغذ، طباعت اور جلد بندی کا معیار کئی درجے بلند کیا۔ د: سنگ میل کی شہرت، کاروباری استحکام اور متعدد مطبوعات کی بے پناہ مانگ کے باعث ادارے نے اپنے تجارتی استحقاق کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے نفع کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ کچھ کتابوں کی قیمتیں اس دہائی میں بھی کسی حد تک مناسب کہی جاسکتی ہیں۔

چوتھی دہائی (۱۹۹۲ء۔۲۰۰۲ء) میں قیمتوں کی صورتحال پیش کرنے کے لیے چند مثالیں درج کی جارہی ہیں:

۱۹۹۲ء ظہیر بابر کی کتاب ''دیدہ بیدار کے خواب'' شائع ہوئی تو قیمت ۲۱۰ روپے تھی، صفحات ۴۴۸ تھے۔

۱۹۹۳ء میں ضیاء جالندھری کی شعری کلیات ''سرِشام سے پس حرف تک'' شائع ہوئی، قیمت ۲۱۰ روپے تھی، صفحات ۴۳۱ تھے۔

۱۹۹۶ء میں داؤد رہبر کا مجموعہ مکاتیب ''سلام و پیام'' کے عنوان سے چھپا، قیمت ۴۹۹ روپے رکھی گئی اور صفحات بھی اتفاقاً ۴۹۹ ہی تھے۔

۱۹۹۶ء میں ہی ڈاکٹر انوار احمد کا افسانوی مجموعہ ''ایک ہی کہانی'' شائع ہوا، قیمت ۷۵ روپے تھی، صفحات ۱۱۱ تھے۔

۱۹۹۸ء میں حجاب امتیاز علی کی کتاب ''تصویرِ بتاں'' کی قیمت ۱۵۰ روپے تھی، صفحات ۲۳۴ تھے۔

۱۹۹۸ء میں ہی اے حمید کی ''مٹی کی مونالیزا'' کی قیمت ۱۵۰ روپے تھی، صفحات ۲۲۴ تھے۔

۱۹۹۹ء میں متعدد مرتبہ شائع ہونے والے مرزا رسوا کے مقبول عام ناول ''امراؤ جان ادا'' کی قیمت ۱۲۵ روپے تھی، صفحات ۲۰۴ تھے۔

۲۰۰۱ء میں ہی داؤد رہبر کی کتاب ''باتیں کچھ سریلی سی'' کی قیمت ۱۶۰ روپے ہے، صفحات ۱۸۸ ہیں۔

۲۰۰۱ء میں ہی قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی تینوں جلدوں پر مشتمل کتاب کی قیمت ۹۰۰ روپے ہے،

صفحات ۹۰۶ ہیں۔

۲۰۰۱ء میں کشور ناہید کی دوسری شعری کلیات ''دشت قیس میں لیلیٰ'' شائع ہوئی، قیمت ۹۰۰ روپے ہے، صفحات ۱۳۱۱ ہیں۔

چوتھی دہائی میں کتابوں کی قیمتوں میں اضافے کے باعث عام قارئین اپنی متعدد پسندیدہ کتابوں کو خود خرید کر پڑھنے کے قابل نہیں رہے اور انہوں نے اس کے حصول کے لیے کتب خانوں کا رخ کیا۔ سنگ میل کے معیار، کتابوں کی طلب اور موثر تجارتی نیٹ ورک کے باعث عام لائبریریوں اور تعلیمی اداروں کے کتب خانوں (پاکستان کے تقریباً ہر شہر) میں سنگ میل کی مطبوعات نظر آنے لگیں۔ تعلیمی اداروں کی لائبریریوں میں سنگ میل کی مطبوعات سے جہاں طلبہ کو بہت فائدہ ہوا وہاں بعض اوقات سنگ میل کی مہنگی کتابوں کی رسائی کے سلسلے میں طلبہ کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس حوالے سے پروفیسر عمران اختر لکھتے ہیں:

> ''راقم نے ایک سروے کیا جس میں گورنمنٹ کالجز کی لائبریریں شامل ہیں۔ عام طور پر گورنمنٹ کالجز میں ایک طالب علم کو دو کتابیں پندرہ دن کے لیے ایشو کی جاتی ہیں اور کتابوں کی مالیت پانچ سو روپے تک مقرر کی ہوتی ہے، پانچ سو روپے سے زائد قیمت والی کتاب ایک طالب علم کو ایشو نہیں کی جاتی ایسی صورت میں دیکھنا پڑتا ہے کہ سنگ میل کی کتنی مقبول کتابیں ایسی ہیں جن کی قیمت پانچ سو روپے تک ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے پاس سامنے ایک فہرست کتابوں کی پڑی ہے اس میں جس کتاب کی قیمت پر نظر ڈالتا ہوں اس کی قیمت ایک ہزار سے اٹھارہ سو روپے تک درج ہے۔ پچھلے سال جتنی کتابیں شائع ہوئیں ان کی قیمت بارہ سو روپے سے اٹھارہ سو روپے تک تھی۔ بازار میں گذشتہ لکھنو کی قیمت دو سو یا اس سے کچھ زیادہ ہے لیکن سنگ میل کے ہاں گذشتہ لکھنو کی قیمت بارہ سو روپے ہے شاید وہ لکھنو کو مہنگے داموں بیچنا چاہتے ہیں۔
>
> اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدنظر رکھا جائے کہ وہ کتابیں جو نسبتاً زیادہ اہم ہیں یا پھر نصاب میں شامل ہیں ان پر ۲۵ فیصد رعایت دی جاتی ہے اور وہ کتابیں جو جنرل ہیں یا کم بکتی ہیں ان پر ۳۳ فیصد رعایت دیتے ہیں''۔ (۲۴)

گویا مہنگی کتابیں قاری کی ذاتی دسترس سے باہر ہونے کے ساتھ ساتھ کتب خانوں میں بھی قاری کی (خصوصاً طلبہ کی) رسائی سے دور ہوگئی ہیں۔ نیاز احمد اپنے ادارے کی مہنگی کتابوں کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''میں نے ابتداء میں فاطمہ مبین کا ایک ناول ثریا چھاپا تھا جس کی قیمت تین روپے تھی اب وہی

ناول میں نے دوبارہ چھاپا ہے اس کی قیمت ایک سو پچیس روپے ہے۔ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔
کاغذ، سیاہی، پلیٹس ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ حکومت کی جانب سے کتاب کی چھپائی پر کوئی
رعایت نہیں دی جاتی، کاغذ ہمیں ڈیوٹی کے ساتھ خریدنا پڑتا ہے''۔(۲۵)

(درج بالا اقتباس میں جس ناول کی قیمت غلطی سے ۱۲۵ روپے بتائی گئی ہے یا کتابت ہوئی ہے اس کی قیمت ۲۵۰ روپے ہے)

نیاز احمد نے راقم الحروف کو ایک انٹرویو میں اشاعتی اداروں کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا:

''کتاب کی قیمتیں مجبوراً بڑھائی گئی ہیں۔ افسوس ہمارے معاشرے اور میڈیا کو سوائے کتابوں
کے کہیں اور مہنگائی دکھائی نہیں دیتی۔ ہم مہنگے ہوٹلوں میں رنگا رنگ کھانوں پر ایک ہی شام میں
ہزاروں روپے لٹا دیتے ہیں لیکن کتاب خریدتے ہوئے یا تو ڈسکاؤنٹ مانگتے ہیں یا سرے سے
کتاب خریدنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیتے ہیں''۔(۲۶)

مطبوعات سنگ میل کی قیمتوں کے مذکورہ بالا جائزے، پروفیسر عمران اختر کے لائبریریوں کے حوالے سے سروے اور نیاز احمد کے انٹرویوز کے درج بالا حصے پیش نظر رکھ کر نتیجہ اخذ کریں تو یہ امور سامنے آتے ہیں۔

مطبوعاتِ سنگ میل کی قیمتوں کے اضافے کی صورتحال پہلی دو دہائیوں (۱۹۶۲ء۔۱۹۸۲ء) تک مناسب اور قابل قبول رہی، پھر قیمتوں میں روز افزوں اضافہ دیکھنے میں آیا؛ لیکن اس دوران مہنگائی بڑھی جس کے باعث سنگ میل ہی نہیں دیگر اشاعتی اداروں نے بھی اپنی کتابوں کی قیمتیں بڑھا لیں۔ باقی دو دہائیوں (۱۹۸۲ء۔۲۰۰۲ء) کا زمانہ مطبوعات سنگ میل کے قارئین کے لیے بتدریج مشکل ہوتا چلا گیا۔ علاوہ ازیں ان دو دہائیوں میں سنگ میل نے بطور خاص کتابوں کے خارجی روپ کو بہتر سے بہترین بنانے کی کاوش بھی کی جس سے طباعتی اخراجات میں خاصا اضافہ ہو گیا جو آخر کار قارئین کو منتقل ہو گیا۔ آخری بات یہ کہ سنگ میل کی شہرت اور مطبوعات کی بڑھتی طلب کے باعث ادارے نے بغیر کسی تجارتی خوف کے اپنے منافع میں اضافے کی حکمت عملی اپنائی۔ اس صورتحال کا ایک قابل قبول حل قاری اور ناشر دونوں کے لیے یہ ہو سکتا تھا کہ ہر اہم اور مقبول کتاب کا ایک سستا ایڈیشن بھی شائع کیا جاتا؛ ایسے تجربات اور ایسی روایات ہماری اشاعتی تاریخ میں وافر ہیں۔ موجودہ کیفیت یہ ہے کہ قاری ''بہ حسرت و یاس'' سنگ میل کی انتہائی خوبصورت، پرمغز اور ہزاروں علمی و ادبی دلچسپیوں کی حامل کتاب کو قیمت دیکھ کر واپس شیلف میں رکھ دیتا ہے۔ کتب خانوں میں بھی چند کتابوں کو چھوڑ کر مہنگی کتابیں قارئین اور ارکین کتب خانہ کو جاری نہیں کی جاتیں۔ کتاب ناقد کے نقطہ نظر سے بے شک اعلیٰ و معیاری ہو لیکن عام قاری تک پہنچے بغیر اسے جواز، مقبولیت اور معاشرتی و تاریخی حافظے میں کوئی گوشہ حاصل کرنے کے لیے بڑا تردد اور انتظار کرنا پڑتا ہے۔

مطبوعات کے موضوع و اندراجات، طباعتی معیارات، اشاعتی ترویج اور قاری تک کتب کی ترسیل کے معاملات کے ساتھ ساتھ

مصنفین سے ناشر کے روابط وتعلقات بھی قابل تجزیہ ٹھہرتے ہیں۔ناشر اور مصنف کے باہمی ربط و تعلق کے بغیر کتاب کا منصۂ شہود پر آنا ممکن نہیں لیکن اس کے باوجود ناشر اور مصنف کے تعلقات ہمارے ملک میں کبھی مثالی نہیں رہے۔ڈاکٹر سلیم اختر ناشر اور مصنف کو''دو کنارے'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگرچہ مصنف اور ناشر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں مگر اس کے باوجود ان دونوں کی مغائرت نے اب تو روایتی حیثیت اختیار کر لی ہے یوں کہ اب دونوں ندی کے ان دو کناروں میں تبدیل ہو چکے ہیں جو کبھی نہیں ملتے۔کتاب ان دو کناروں پر پل کا کام کر سکتی تھی مگر درحقیقت وہی باعث نزاع بنتی ہے''۔(۲۷)

عموماً مصنفین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ناشرین کا سارا رتبہ ہماری کتابوں کے باعث قائم ہے لیکن ہمیں ہی نظرانداز کر دیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو اچھا خاصا استحصال کیا جاتا ہے۔ناشرین ان الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں اور یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں کہ مصنفین اپنی شہرت ومقبولیت اور قلم کی طاقت کے سہارے اپنے حق میں اور ناشرین کے خلاف رائے عامہ ہموار کر لیتے ہیں۔ہمارے یہاں مصنف و ناشر کے مابین پائی جانے والی خلیج اور بڑھتی ہوئی کشیدگی کے حوالے سے ذوالفقار احمد تابش اپنے ایک مضمون''مصنف و ناشر کا رشتہ'' میں ترقی یافتہ ممالک کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا بھر میں ، جہاں کتابی تجارت اب سائنٹیفک بنیادوں پر استوار ہو چکی ہے۔ ناشرین مصنفین کے ساتھ تعلق کی خوشگواری کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔اس ضمن میں جہاں ان کی پیشہ وارانہ ایسوسی ایشن بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں وہاں آپس کے تعلق کو بڑھانے کے لیے ناشر اور مصنف ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کلمہ خیر کہنے میں بخل سے کام نہیں لیتے''۔(۲۸)

اس تناظر میں بانی سنگ میل نیاز احمد کے مصنفین سے روابط اور رویے کا جائزہ لیتے ہیں۔سب سے پہلے مصنف و ناشر کے تعلق، کتاب کے دائمی حقوق خریدنے اور رائلٹی بالکل نہ دینے کے الزام کے حوالے سے نیاز احمد کی رائے دیکھتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟ ایک قومی اخبار کے زیر اہتمام مصنف و ناشر کے حوالے سے ہونے والے ایک مکالمے میں نیاز احمد، اپنی رائے اور اپنے ادارے کی پالیسی کو یوں بیان کرتے ہیں:

''دس سال کے بعد ادیب کو اپنی کتاب کے حقوق واپس مل جاتے ہیں، دائمی حقوق خریدنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔یہ قانونی بات ہے کہ کوئی ناشر بھی ایسا نہیں جو مصنف کو رائلٹی نہ دیتا ہو، اس کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے لیکن اگر مصنف خود پیسے دے کر کتاب چھپوانے کے لیے کہے تو ہم

انکارنہیں کر سکتے۔ہمیں نیشنلائزیشن پر کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ سسٹم نہیں چلے گا۔ ہمارے دروازے تمام مصنفین کے لیے کھلے ہیں لیکن ہر ایک کو انتظار کرنا پڑے گا''۔(۲۹)

ناشرین کے رائلٹی نہ دینے کے رویے پر اپنے دو مختلف انٹرویوز میں نیاز احمد نے ان آرا کا اظہار کیا:

''(رائلٹی دینے کے مسئلے پر)'' یہ شکایت کسی حد تک درست کہی جا سکتی ہے لیکن مجھ سے کبھی کسی کو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوئی، ہمارا ادارہ کتاب چھپنے کے ڈیڑھ دو ماہ کے اندر لکھنے والے کو اس کی رائلٹی دے دیتا ہے''۔(۳۰)

''ہم دس فی صد رائلٹی دیتے ہیں، نہ کم نہ زیادہ، بعض اوقات کتاب کی اشاعت کے چند دن بعد ہی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ ہمارے مصنفین (خصوصاً مستقل مصنفین) کو اس حوالے سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، ہم سے کتابیں چھپوانے کے بعد بہت کم مصنفین (شاید دو تین) اشاعتی طور پر ہم سے الگ ہوئے''۔(۳۱)

ناشر کی رائے اور نقطہ نظر جان لینے کے بعد سنگ میل کے تین مستقل مصنفین مستنصر حسین تارڑ، کشور ناہید اور ڈاکٹر سلیم اختر کی سنگ میل کے حوالے سے مختلف جگہوں پر بکھری ہوئی آرا کو یہاں یکجا کیا جاتا ہے تا کہ مصنفین کے آئینے میں ناشر پوری طرح نظر آ سکے۔مستنصر حسین تارڑ، نیاز احمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ پہلے ناشر ہیں جنھوں نے مصنفوں کو باقاعدہ اور باعزت طریقے سے رائلٹی دینے کا آغاز کیا آج اگر دوسرے ناشر بھی ادیبوں کو رائلٹی دینے پر مجبور ہیں تو اس میں سارا قصور نیاز احمد کا ہے''۔ (۳۲)

کشور ناہید، نیاز احمد کے خلوص و مروت کی قائل ہیں خصوصاً جو وہ اپنے مستقل مصنفین کے لیے رکھتے ہیں؛ کشور ناہید اپنے مضمون ''زمزم شخصیت۔ نیاز احمد'' میں لکھتی ہیں:

''مستنصر حسین تارڑ سے لے کر کتنے ہی ادیب تھے جن کا تعارف میں نے نیاز صاحب سے کروایا۔ اب میں بلا اعلان، ان کے گھر کی فرد بن چکی تھی۔ میں ہی نہیں بانو قدسیہ ہوں کہ اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب ہوں کہ واصف علی واصف، بیدار بخت کینیڈا سے ہوں کہ محمد عمر میمن امریکہ سے اور پھر انتظار حسین، عبداللہ حسین، اکرام اللہ، یہ سب رفیق بلا تکلف نیاز صاحب کو کبھی کبھی امتحان میں بھی ڈال دیتے مگر وہ شخص اگلے دن چیک لیے مسکراتا ہوا، سامنے آتا۔ایسے خوش کہ رائلٹی وصول کر کے ان لوگوں نے احسان کیا ہے''۔(۳۳)

ڈاکٹر سلیم اختر کا سنگ میل سے ایک بار ربط قائم ہوا تو اب تک ٹوٹنے نہیں پایا؛ وہ تحقیق وتنقید کے باب میں ڈھیروں کتابیں اور ان کے درجنوں ایڈیشنز ایک ہی نجی اشاعتی ادارے سے شائع کرانے والے واحد شخص ہیں۔ ان کی اشاعتی مستقل مزاجی کو ان کے ناشر کے حسن سلوک سے بھی تقویت ملتی رہی ہے۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

> ''کتاب چھپے تو ناشر فکر مند ہو جاتا ہے، ہائے اللہ! میں کیا کروں اب مجھے مصنف کو کچھ معاوضہ بھی دینا ہوگا، نیاز صاحب بھی کتاب چھپتے ہی فکر مند ہو جاتے ہیں کہ کیسے جلد از جلد مصنف کا معاوضہ ادا کروں۔ اس لاہور میں کتنے ناشر ہوں گے، جو فون کر کے مصنف سے کہیں کہ تمہارا چیک بنا رکھا ہے، آ کر لے جاؤ!
>
> یہ حسن سلوک صرف میرے لیے ہی نہیں، بلکہ تمام مصنفین کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ ہے۔ اس لیے سبھی عزت واحترام سے ان کا نام لیتے ہیں اور مارکیٹ میں ساکھ بنی ہے۔
>
> سنگ میل کے دیگر مصنفین اعتراف کریں یا نہ کریں، مگر میں اس اعتراف میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا کہ جب کبھی مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی، تو کسی رشتہ دار یا دوست کے برعکس میں نیاز صاحب سے ادھار لے لیتا ہوں، جو بعد میں کتابوں کی رائلٹی میں سے منہا ہو جاتا ہے''۔ (۳۴)

کسی ناشر کی شخصی وتجارتی اخلاقیات کے بارے میں اس کے مستقل مصنفین کی رائے مثبت ہونا پاکستان کی اشاعتی وطباعتی صورتحال میں ایک حیران کن واقعہ ہے۔

کسی اشاعتی ادارے کے اشاعت کتب اور تجارت کتب سے وابستہ دیگر اداروں سے تعلقات بھی موضوع بحث بنتے ہیں۔ سنگ میل کے کتابوں کی طباعت واشاعت وترسیل سے متعلقہ تمام تجارتی اداروں سے روابط عمومی طور پر خوشگوار رہے۔ (یہ رائے مختلف اشاعتی اداروں سے حاصل ہونے والی آرا کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ دو چار اداروں نے اس بارے میں رائے دینے سے گریز کیا۔) ۱۹۵۷ء میں قائم ہونے والے اشاعتی ادارے کلاسیک لاہور نے سنگ میل کے حوالے سے یہ رائے دی ہے:

> ''معاصر اشاعتی ادارے سنگ میل پبلی کیشنز کا اشاعتی سفر ہمارے ساتھ ہی شروع ہوا تھا۔ سنگ میل نے مستقل مزاجی اور کاروباری سمجھ بوجھ کا بہترین مظاہرہ کیا اور مثالی کامیابی حاصل کی۔ ہم ان کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہیں..... جہاں تک سنگ میل کے اشاعتی اور طباعتی معیار کا تعلق ہے اسے اعلیٰ درجے کا قرار دیا جا سکتا۔ مصنفین کے معاملات میں ہماری شنید کے مطابق وہ لین دین کے کھرے ہیں۔....... سنگ میل اور کلاسیک کے کاروباری تعلقات

ہمیشہ اچھے رہے ہیں۔اور ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اچھے ہی رہیں گے''۔(۳۵)

معروف اشاعتی ادارے مقبول اکیڈمی لاہور کے بانی ملک مقبول احمد نے سنگ میل پبلی کیشنز اور نیاز احمد کے حوالے سے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا:

''اشاعتی معیار بہت اچھا ہے، نیاز صاحب نے بڑی خوبصورت کتابیں شائع کی ہیں۔رائلٹی کے حوالے سے مصنفین کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔تاجرانِ کتب کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہیں، میرے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں اور کاروباری لحاظ سے بھی ان سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ہوا''۔(۳۶)

معروف وممتاز اشاعتی ادارے ''التحریر'' لاہور کے اعزازی مہتمم پروفیسر عمران اللہ (بانی ادارہ: خالد سیف اللہ کے صاحبزادے) سنگ میل کی اشاعتی کارکردگی اور تجارتی تعلقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سنگ میل پبلی کیشنز ایک معیاری اشاعتی ادارہ ہے جس نے بہت سے نئے، پرانے مصنفین کی تخلیقات کو شائع کیا ہے۔اشاعت میں کاغذ اور طباعت کے معیار میں خاص توجہ دی ہے جس کی وجہ سے کتب کی قیمتیں کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔

دوسرے تجارتی اداروں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب ہے اور خاطر خواہ تعاون کرتے ہیں اپنے اس رویے کی وجہ سے انہوں نے اشاعتی اداروں میں خاص مقام حاصل کر لیا ہے''۔(۳۷)

اشاعتی ادارے ''کاغذی پیرہن'' لاہور نے سنگ میل پبلی کیشنز کی مطبوعات کے معیار، معاصرین ادب کی اشاعت، کتابوں کی رائلٹی اور دیگر اشاعتی اداروں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے درج ذیل تفصیلی رائے دی ہے:

''سنگ میل کا اشاعتی اور طباعتی معیار بہت اعلیٰ ہے۔کتب کی قیمت کو مناسب تو نہیں کہا جا سکتا مگر مارکیٹ کے رویے کو دیکھا جائے تو وہ اپنی کتابوں کی قیمت مقرر کرنے میں حق بجانب ہیں کیوں کہ پرچون کے لیے جو کتابیں آگے کتب فروشوں کو دی جاتی ہیں، ان پر کم از کم پچاس فی صد رعایت دینا ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ہر کتاب کی قیمت قاری کی پہنچ سے باہر ہے.....

سنگ میل پبلی کیشنز نے تقریباً تقریباً تمام بڑے مصنفین کی نہ صرف چیدہ چیدہ کتابیں شائع کی ہیں بلکہ انہوں نے سینئر ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے تمام کام پر مشتمل مجموعے بھی شائع کیے ہیں۔مگر حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے آج تک بیسویں صدی کے نصفِ آخر اور موجودہ دور

کے سب سے بڑے شاعر، ادیب اور نقاد وزیر آغا کی کوئی کتاب شائع نہیں کی اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس ادارے کی کم نصیبی ہے..... جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، سنگ میل والے مصنفین کو رائلٹی دینے کے معاملے میں بہت کھرے ناشر ہیں۔۔ نہ صرف یہ، وہ عین وقت پر مصنفین کی رائلٹی ان کے گھروں میں جا کر بذاتِ خود ادا کرتے ہیں اور مصنفین کو اس ادارے کے چکر نہیں کاٹنا پڑتے۔

ہمارے اشاعتی ادارے سے سنگ میل کے تجارتی تعلقات بہت اچھے رہے ہیں وہ ہم سے جتنی بھی کتابیں خریدتے ہیں، ان کی قیمت وقت پر (یعنی تین مہینے کے فوراً بعد) ادا کر دیتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ادارہ، دوسرے اداروں کی کتابوں کے واجب الادا بل تین مہینے کے فوراً بعد ادا کر دیتا ہے اور یہ اصول انہوں نے شروع سے اپنا رکھا ہے''۔(۳۸)

معاصر اشاعتی اداروں کی مجموعی طور پر مثبت رائے سنگ میل کے موزوں تجارتی تعلقات کار کو واضح کرتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے اردو ادب کی طباعت و اشاعت کے چالیس سالوں میں سیکڑوں تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کتب شائع کر کے اپنی انفرادیت و شناخت قائم کی اور اردو کی اشاعتی تاریخ میں اپنے نقش کو محفوظ کر لیا ہے۔ سنگ میل نے اپنے مصنفین کو وقار اور خلوص دیا اور تصنیفی حق سے کبھی محروم نہیں رکھا۔ اردو ادب کے قارئین کے لیے صوری و معنوی حسن سے عبارت شاندار اور طرح دار کتابیں شائع کر کے اپنی ترسیلی صلاحیت سے ہر جگہ (ہر کتابی مرکز اور ہر کتب خانے میں) پہنچا دیں۔ عمومی طور پر تجارتی تنازعات سے سنگ میل دور رہا۔ سنگ میل نے متنازع مواد چھاپنے سے بھی گریز کیا (سوائے تین چار کتابوں کے سنگ میل کی کوئی کتاب نزاعی ثابت نہیں ہوئی)

سنگ میل نے نمایاں، اہم اور پاکستان کی حد تک اردو ادبی مطبوعات کا ایک مثالی ادارہ ہونے کے باوجود اردو کے درجنوں اہم مصنفین سے کوئی اشاعتی ربط قائم نہیں کیا۔ سنگ میل کی اشاعتی تاریخ کی پہلی دو دہائیوں میں کتابوں کی قیمتیں مناسب رہیں اور باقی دو دہائیوں میں تیزی کے ساتھ ان میں اضافہ ہوا؛ متعدد اہم کتابیں عام قاری کی مالی دسترس سے باہر نکل گئیں۔

سنگ میل نے خصوصاً اردو کے افسانوی ادب کی طباعت و اشاعت میں گہری دلچسپی لے کر برصغیر میں مطبع منشی نول کشور کے بعد ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ لمحہ موجود میں اردو ادب اور سنگ میل ایک دوسرے کا اہم حوالہ ہیں۔ نیاز احمد کی کتاب اور اردو ادب سے جو دلچسپی یونائیٹڈ پبلشرز کی ملازمت کے دوران نسیم حجازی کے ناول پڑھتے ہوئے قائم ہوئی تھی اس نے اردو ادب اور سنگ میل دونوں کو بڑی فراوانی سے نوازا ہے۔ ایک معاصر انگریزی اخبار میں سنگ میل کے حوالے سے ایک تحسینی فیچر کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''متروک مسودوں، قدیم ترین ادبی تحریروں، فراموش اور گم شدہ تاریخوں اور نادر و نایاب کتابوں سے بہت ہی کم لوگ دوستی کرتے ہیں لیکن اشاعتی ادارہ سنگ میل ان کی ترویج پر کمر بستہ ہے۔تاریخ کی حفاظت اس کے لیے حصول رزق کا بہانہ ہے۔
سنگ میل کی کامیابیوں کی کہانی.... محبت،محنت اور پرخلوص کوشش کی کہانی ہے۔آج یہ اشاعتی ادارہ شیخ نیاز احمد کی سربراہی میں مطبوعہ ادب کا ملکی سطح پر سب سے معتبر ماخذ بن چکا ہے۔
سنگ میل ایک ایسا کاروباری ادارہ ہے جس نے تاریخ کی حفاظت اور احیا کی حیران کن خواہش سے جنم لیا''۔(۳۸)

حوالہ جات

۱۔ عبدالوحید،ڈاکٹر،''کتابیں اور معاشرہ''، ماہنامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱-۲، جلد۲، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۱۷

۲۔ امیر حسن نورانی، سید، ''سوانح منشی نول کشور''، پٹنہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء، ص ۳

۳۔ مقبول احمد، ملک، ''سفر جاری ہے''، باراول، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷، ۴۸، ۲۲۱

۴۔ اسدار یب، ڈاکٹر، ''بچوں کا ادب، تاریخ و تنقید''، باراول، ملتان، کاروان ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۹۳، ۹۴

۵۔ راقم الحروف، استفسار از نیاز احمد، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۸ جولائی ۲۰۰۷ء

۶۔ نیاز احمد، عرض ناشر، ''طلسم ہوش ربا''، جلد ہفتم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، سن اشاعت ندارد، ص الف

۷۔ راقم الحروف، استفسار از نیاز احمد، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۸ جولائی ۲۰۰۷ء

۸۔ ایضاً

۹۔ کشور ناہید، ''زم زم شخصیت۔ نیاز احمد''، مشمولہ شناسائیاں، رسوائیاں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۹

۱۰۔ راقم الحروف، استفسار از نیاز احمد، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۸ جولائی ۲۰۰۷ء

۱۱۔ مستنصر حسین تارڑ، ''کارواں سرائے'' (کالم)، مطبوعہ ہفت روزہ ''اخبار جہاں''، کراچی، ۲۶ جون تا ۲ جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۶

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ انتظار حسین، ''باتیں ملاقاتیں''، (کالم)، مطبوعہ روزنامہ مشرق لاہور، ۲۶ جون ۱۹۸۷ء، مشرق میگزین، ص ۴

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''پاکستان کا تخلیقی منظر نامہ ۱۹۸۴ء''، مشمولہ ''پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال'' (سالانہ ادبی جائزے۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۶

۱۵۔ شاہد حسن رضوی، ڈاکٹر، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۲۱۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۱۶۔ محمد خالد، پروفیسر، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۳۰۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۱۷۔ غلام حسین ساجد، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء

۱۸۔ کشور ناہید، ''شناسائیاں رسوائیاں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۳

۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''نشانِ جگر سوختہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۷

۲۰۔ عرفان احمد خان، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۲۱ ستمبر ۲۰۰۷ء

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ نیاز احمد، ''انٹرویو برائے ادبی صفحہ''، ہفت روزہ، دی پاکستان پوسٹ، لندن، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۲۳۔ راقم الحروف، استفسار از نیاز احمد، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء

۲۴۔ عمران اختر، پروفیسر، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۴۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۲۵۔ نیاز احمد، انٹرویو (برائے ادبی صفحہ)، مطبوعہ دی پاکستان پوسٹ، لندن، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۲۶۔ راقم الحروف، استفسار از نیاز احمد، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء

۲۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''ادب کا بارہ ماسہ''، (۱۹۸۷ء کا ادبی جائزہ)، مشمولہ ''پاکستان میں اردو ادب۔ سال بہ سال''، (سالانہ ادبی جائزے، ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۶

۲۸۔ ذوالفقار احمد تابش، ''مصنف اور ناشر کا رشتہ''، مطبوعہ ماہنامہ کتاب، لاہور، شمارہ ۱۱، جلد ۱۹، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۴، ۱۰

۲۹۔ نیاز احمد، ''مصنفین و ناشرین کے مابین ایک مکالمہ''، روزنامہ جنگ، لاہور ۱۵ جولائی ۱۹۸۷ء، مشمولہ ''اردو ادب۔ سال بہ سال''، از سلیم اختر، ڈاکٹر، ص ۱۸۱

۳۰۔ نیاز احمد، ''انٹرویو برائے ادبی صفحہ''، مطبوعہ دی پاکستان پوسٹ، لندن، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۳۱۔ راقم الحروف، استفسار از نیاز احمد، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء

۳۲۔ مستنصر حسین تارڑ، ''کارواں سرائے'' (کالم)، مطبوعہ ہفت روزہ اخبار جہاں، کراچی، ۳ جولائی تا ۹ جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۷

۳۳۔ کشور ناہید، ''شناسائیاں رسوائیاں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۰

۳۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''نشان جگر سوختہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۶

۳۵۔ آغا امیر حسین، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۵۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۳۶۔ مقبول احمد، ملک، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۱۵۔ نومبر ۲۰۰۷ء

۳۷۔ عمران اللہ، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۲۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۳۸۔ شاہد شیدائی، راقم کے مرتب کردہ سوالنامے کا تحریری جواب، محررہ: ۱۸۔ ستمبر ۲۰۰۷ء

۳۹۔ Nyla Daud, Sang-e-Meel........Preserving History through Business, Daily The Nation, Lahore, 8 June, 1994, P-3, Mid Week: P-3

تیسرا باب
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی تحقیقی وتنقیدی مطبوعات
توضیحی کتابیات

آفتاب احمد،ڈاکٹر،''محمد حسن عسکری ایک مطالعہ''(ذاتی خطوط کی روشنی میں)،صفحات: ۲۶۹،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

اس کتاب میں محمد حسن عسکری کے ذاتی خطوں اور ملاقاتوں کے حوالے سے عسکری کی شخصیت،فکر اور تنقیدی اسلوب کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کا تعارف انتظار حسین نے لکھا اور کتاب کی افادیت روشن کرنے کے ساتھ ساتھ عسکری کے ذہن اور مزاج کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ڈاکٹر آفتاب احمد نے ''کچھ اس کتاب کے بارے میں'' کے عنوان سے دیباچہ لکھا اور عسکری کے خطوط کی اشاعت کا جواز پیش کیا۔

کتاب میں آفتاب احمد کے نام عسکری کے ۸۸اردو خط اور ۶انگریزی خط موجود ہیں۔ایک خط کا ابتدائی حصہ اردو میں اور باقی انگریزی میں ہے۔آفتاب احمد نے اردو حصہ علیحدہ خط کے طور اور انگریزی حصہ الگ درج کیا ہے۔

اس کے علاوہ آفتاب احمد کے دو مضامین ''محمد حسن عسکری:شخص اور دوست''اور''محمد حسن عسکری اور خواجہ منظور حسین'' بھی شامل کتاب ہے۔آخر میں حسن عسکری کی''ساقی''میں چھپنے والی''جھلکیاں''میں سے ایک جھلک''ادب کی موت کا اعلان''اور اس کے ردِعمل میں آفتاب احمد کا ایک خط(جو ساقی میں ہی شائع ہوا تھا) بھی کتاب کی افادیت بڑھا رہے ہیں۔

آل احمد سرور،''ہمارا ادب''صفحات:۲۲۴،زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

ڈاکٹر صدیق جاوید اپنے پیش لفظ میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''زیرِنظر کتاب''ہمارا ادب''اردو نثر کا ایک ایسا....انتخاب ہے جو بنیادی طور پر ایک نصابی ضرورت سے مرتب کیا گیا تھا مگر اپنے مندرجات کے حوالے سے اپنی اصل ادبی حیثیت کو برقرار رکھتا ہے۔اس لیے ادب کی قدری اہمیت اور جمالیاتی افادیت کے اعتبار سے سدا بہار ہے''۔ (ص ۷)

آل احمد سرور نے''ہمارا ادب''میں اردو کی سدا بہار نثری تحریروں کا انتخاب'نثر نگاروں کے کوائف اور ان کی فکری و فنی خصوصیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس میں غالب،سرسید،آزاد،نذیر احمد،حالی،شرر،شبلی،سرشار،راشد الخیری،عبدالحق،حسن نظامی،پریم چند،یلدرم،نیاز فتح پوری،فرحت اللہ بیگ،رشید احمد صدیقی،پطرس،محمد مجیب بی اے کے نثر پارے شامل ہیں۔کتاب کے شروع میں''وجوہ انتخاب''کے تحت تمام نثر پاروں کو منتخب کرنے کی وجوہات کا باقاعدہ(اور شاید کسی نصابی انتخاب میں پہلی دفعہ)ذکر کیا گیا ہے۔اس انتخاب میں

اردو کے اٹھارہ نثر نگاروں کے فن پارے شامل کیے گئے ہیں۔

ابو محمد مصلح، ''قرآن اور اقبال''، صفحات ۲۰۰، زیرِ نظر ایڈیشن: سن اشاعت ندارد

اس کتاب میں قرآن کے حوالے سے علامہ اقبال کے احساسات اور خیالات کو ان کی نثر اور شاعری کے زاویے سے روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آغاز میں مصنف نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں اور اقبال کی قرآن سے عقیدت و محبت کا اختصار سے تذکرہ کیا ہے۔

قرآن سے اقبال کے فکری و قلبی تعلق کو واضح کرنے کے لیے حصہ نثر میں: تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، اسرارِ خودی کے متعلق ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط، پیام مشرق کے دیباچے اور اقبال کے ایک مختصر رسالے ختم نبوت اور قادیانیت سے مثالیں لی گئی ہیں؛ حصہ نظم میں: اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، مسافر، ارمغانِ حجاز، بال جبریل، ضرب کلیم، بانگ درا سے مدد لی گئی ہے۔ قرآن سے اقبال کے روحانی واسطے اور معاملے کو سامنے لانے کے لیے ان کی نثر و نظم سے مثالوں کے ساتھ ساتھ مصنف کے مختصر تبصرے بھی موضوع کو روشن کر رہے ہیں۔

اجمل نیازی، محمد، ڈاکٹر، ''بازگشت'' (میانوالی کا شعری منظر نامہ)، صفحات ۳۸۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے اپنی جنم بھوی میانوالی کا ''ادبی حق'' ادا کرنے کے لیے ''بازگشت'' کے عنوان سے ایک تنقیدی تذکرہ، مرتب کیا؛ اس میں انہوں نے ان تمام شعراء کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا جن کا میانوالی سے تعلق قائم رہا تھا۔ اس سے قبل اجمل نیازی نے ''جل تھل'' کے عنوان سے میانوالی کے بیس سے زائد شعراء کا تذکرہ لکھا تھا لیکن بقول ڈاکٹر سلیم اختر: ''بازگشت'' ''جل تھل'' پر استوار ہے لیکن اسے محض پہلی کتاب کی توسیع نہیں سمجھنا چاہیے''۔ (دیباچہ، ص۳)

میانوالی کے جن چند شعراء نے اردو ادب میں اہمیت و شہرت حاصل کی ان میں تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، کوثر نیازی، انجم نیازی، یحییٰ امجد، اور اجمل نیازی کے علاوہ اور بھی کئی اہم نام ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں مذکورہ بالا شاعروں کے علاوہ تقریباً (میانوالی) کے تمام اہم شاعروں کے تعارف و تجزیے کے ساتھ ان کے نمونہ ہائے کلام بھی موجود ہیں۔

اجمل خان نیازی، محمد، ڈاکٹر، ''فوق الکشمیر'' (محمد الدین فوق کشمیری کی علمی و ادبی خدمات)، صفحات ۶۷۲، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی نے محمد الدین فوق کشمیری کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا (جس پر انہیں ۱۹۸۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی) ''فوق الکشمیر'' اُسی تحقیقی مقالے کی کتابی صورت ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں فوق کے ''حالات زندگی اور شخصیت'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے میں انہیں ''مورخ کشمیر و لاہور اور سوانح نگار'' کی حیثیت سے اور تیسرے باب میں انہیں ''شاعر کشمیر'' کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ دیگر ابواب یہ ہیں:

فوق کا افسانوی ادب، کشمیری صحافت میں فوق کی خدمات، فوق اور تحریک حریت کشمیر، متفرقات فوق۔آخر میں کتابیات فوق اور کتابیات (عمومی) درج ہیں۔ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا:

''فوق الکشمیر'' کا مطالعہ کر کے معلوم ہوا کہ میرا علم فوق کے عہد اور کشمیر کے بارے میں پہلے سے بڑھ گیا ہے ..... یہ مقالہ تحقیق کا بہت اچھا نمونہ ہے۔اس میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کے عناصر نہایت تناسب کے ساتھ موجود ہیں''۔(ص ۸؍۷)

احسان الحق اختر، (مرتبہ) ''مثنوی سحر البیان۔ایک تہذیبی مطالعہ'' صفحات ۳۴۸، زیر نظر ایڈیشن ۱۹۶۷ء

''مثنوی سحر البیان۔ایک تہذیبی مطالعہ'' احسان الحق اختر نے مرتب کی ہے؛ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: مقالہ بعنوان مثنوی سحر البیان۔ایک تہذیبی مطالعہ از رضیہ سلطانہ (شعبہ اردو، دلی کالج، دہلی)

دوسرا حصہ: مثنوی سحر البیان (مکمل) از میر حسن

آغاز میں کتاب کے مرتب نے ''گزارش احوال واقعی'' میں ان امور کا ذکر کیا جو انہوں نے سحر البیان کی ترتیب و تدوین کے دوران اپنے پیش نظر رکھے تھے۔نیز رضیہ سلطانہ کے مقالے کو اپنی کتاب میں شامل کرنے کے اسباب بتانے کے علاوہ اس مقالے کی تعریف و توصیف بھی کی؛ البتہ ضرورت اس امر کی بھی تھی کہ رضیہ سلطانہ کے مقالے کو (جو کتاب کے تقریباً ۲۲۴ صفحات پر محیط ہے) اپنی مرتبہ کتاب میں شامل کرتے ہوئے سرورق یا اندرونِ سرورق پر مقالہ نگار کا نام ضرور دیا جاتا۔

مقالے کا مقدمہ تنویر احمد علوی نے تحریر کیا اور رضیہ سلطانہ کی کاوش کو سراہا؛ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''یہ مقالہ اس مثنوی پر لکھنوی تہذیب و زندگی کے ہمہ گیر اثرات کا ایک دلچسپ ادبی جائزہ اور تنقیدی تبصرہ ہے۔جس نے اس مثنوی کے مطالعہ کی اہمیت اور اس کی حدود کو کافی آگے بڑھا دیا ہے''۔(ص ۲۱)

کتاب کے دوسرے حصے میں مثنوی سحر البیان صحت متن کے اصولوں پر مرتب کر کے شامل کی گئی ہے۔کتاب ایم اے اردو کے طلبہ میں بالخصوص مقبول ہوئی تھی۔

احسان الحق، محمد، ''میر حسن۔عہد اور فن'' صفحات ۲۰۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۷۹ء

''میر حسن۔عہد اور فن'' میر حسن کی سوانح اور تہذیبی پس منظر، شعری سرمایے، سحر البیان کے تجزیاتی مطالعے اور میر حسن کی تذکرہ نویسی و تنقیدی نظریات کے جائزے پر مبنی کتاب ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کتاب کے حوالے سے رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''تنقیدی حوالے سے ''میر حسن۔عہد فن'' ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگی اور اس کے ساتھ

ساتھ مثنوی سحر البیان کے تجزیاتی وتنقیدی مطالعے کی نئی راہیں کھول دے گی'' (فلیپ)

کتاب کے آغاز میں مصنف کا دیباچہ ''حرفِ چند'' (مرقومہ: ۱۹۷۷ء) قدرے طویل ہے اور میر حسن کی سوانح اور زمانے کے اہم پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں میر حسن کا عہد زیرِ بحث آیا ہے اور دوسرا حصہ ان کے فن کے حوالے سے ہے؛ یہ حصہ تین ابواب پر مشتمل ہے' پہلے باب میں میر حسن کا تمام شعری سرمایہ تجزیے کے عمل سے گزرا ہے' دوسرا باب: مثنوی سحر البیان کے تحقیقی وتنقیدی مطالعے کے لیے مختص ہے اور تیسرے باب میں میر حسن کی تذکرہ نویسی کا جائزہ لے کر ان کی تنقیدی فکر تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔

ارم سلیم، ''اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت'' صفحات: ۳۰۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کی کتب میں مقدمہ، دیباچہ، پیش لفظ یا تقریظ کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں ایک تمہیدی، تعارفی، اور تجزیاتی تحریر ہوتی ہے؛ ارم سلیم نے اپنی زیرِ نظر کتاب میں ان ہی تحریروں کو موضوع بنایا ہے۔ کتاب کے ابواب کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پہلے باب: ''مقدمہ کیا ہے؟'' میں مقدمے کی اصطلاح، اصول اور اقسام کا ذکر ہے۔ دوسرے باب: ''مقدمہ کے مترادفات'' میں تقریظ، دیباچے اور پیش لفظ کے حوالے سے بحث ہے۔ تیسرا باب: ''مقدمہ شعر وشاعری'' اور چوتھا باب: ''سب سے بڑا مقدمہ باز'' مولوی عبدالحق کے لیے وقف ہے۔ پانچواں باب: ''تین اہم مقدمے''، ''محاسن کلام غالب'' (از بجنوری)' مقدمہ کلام آتش (از خلیل اعظمی) اور مقدمہ تاریخ زبان اردو (از مسعود حسین خان) کے حوالے سے ہے۔ آخری باب: ''چند ہنگامہ خیز مقدمے اور دیباچے'' میں باغ و بہار وفسانہ عجائب، مقدمہ شعر وشاعری اور ہماری شاعری، (گلزار نسیم کے حوالے سے) شرر وچکبست اور اسرار خودی اور اہل تصوف کی بحث اور معرکہ آرائی کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

حیرت اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ''اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت'' ایم۔ اے اردو کے تحقیقی مقالے کا کتابی روپ ہے جو ڈاکٹر ملک حسن اختر کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔

اسلم قریشی، محمد، ڈاکٹر، ''ڈرامہ نگاری کا فن'' صفحات: ۳۴۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

اردو میں ڈرامہ نگاری کے فن اور تکنیک کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کی زیرِ نظر تصنیف کو اولیت حاصل ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا؛ جبکہ مصنف کے پیش لفظ پر سنِ تحریر ۱۹۵۳ء درج ہے۔ (پہلے ایڈیشن کے صفحات ۳۴۴ تھے، قیمت ساڑھے پانچ روپے تھی)

کتاب کے حصہ اول میں ''ڈرامے کے مبادیات'' پیش کیے گئے ہیں اور ڈرامے کی تعریف، بنیادی عناصر، اسٹیج، تماشائی، اداکار

اور ڈرامائی مفاہمتیں، روایات، اقسام، تصادم کے عناصر زیر بحث لائے گئے ہیں۔حصہ دوم ''ڈرامائی تکنیک'' کے لیے وقف ہے اور اس میں کردار نگاری، پلاٹ، ابہام، تحیر اور آفاقی تاثر وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔حصہ سوم میں ''اصناف ڈراما (المیہ اور طربیہ) کا جائزہ'' لیا گیا ہے۔اس موضوع کے تفصیلی جائزے کے لیے مغربی ادب سے خاصا استفادہ کیا گیا ہے اور متعدد امور کی توضیح وتشریح کے لیے اردو ہی نہیں انگریزی ڈراموں سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں؛ یوں اس کتاب سے اردو کے ہی نہیں انگریزی ڈرامے کے طلبہ بھی بقول مصنف ''تھوڑا بہت استفادہ کر سکتے ہیں'' (ص ۵) (زیر نظر مقالہ پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے امتحان کی تکمیل کے لیے لکھا گیا تھا)

اسمٰعیل میرٹھی، محمد، مولوی، ''سفینہ اردو'' (شعری اور نثری ادب کے منتخبات) صفحات: ۱۹۰، زیر نظر ایڈیشن، ۲۰۰۲ء

''سفینہ اردو'' ماضی کی ایک نصابی کتاب ہے اور اسے مولوی محمد اسمعیل میرٹھی نے ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے مرتب کیا تھا۔زیر نظر ایڈیشن کے آغاز میں جس قدیم کتاب کے اندرون سرورق کا عکس چھاپا گیا ہے اس پر جولائی ۱۹۱۵ء کی تاریخ درج ہے۔

''سفینہ اردو'' میں نثر ونظم کا انتخاب، اس زمانے کی تدریس کے معیار، سکول کے طلبہ کی ذہنی سطح اور اساتذہ کے ذوقِ ادب پر روشنی ڈال رہا ہے۔تمام نثری وشعری اصناف کے نمائندہ فن پاروں کے ساتھ ساتھ بلحاظ مضمون اشعار کا انتخاب اور ایسے متفرق اشعار جو ضرب المثل کی طرح مشہور ہیں' کتاب میں شامل ہیں؛ یہ اہتمام آج کی درسی کتب میں مفقود ہے۔

اشفاق حسین، فیض حبیبِ عنبر دست''، صفحات: ۱٦۷' زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

فیض احمد فیض کے حوالے سے اس مجموعے میں دو تنقیدی مضامین، گیارہ تاثراتی اور واقعاتی تحریریں اور ایک فیض کے بارے میں طویل انٹرویو شامل ہیں۔مصنف پاکستان سے ٹورنٹو (کینیڈا) ہجرت کر گئے تھے؛ کتاب کا پہلا حصہ: ''فیض ٹورنٹو میں'' اسی پس منظر میں ہے' اس حصے کے گیارہ ذیلی ابواب میں مصنف کی وہ یادداشتیں' تاثرات اور واقعات ہیں جن کا تعلق فیض کے ٹورنٹو میں قیام، ملاقاتوں اور باتوں سے ہے۔دوسرے حصے میں دو تنقیدی مضامین ہیں: ۱۔اے شام مہرباں ہو (فیض کی سیاسی شاعری کا تجزیہ) ۲۔فیض کے آخری سات سال۔آخری حصہ ایک انٹرویو پر مشتمل ہے جو مصنف سے فیض کے بارے میں خالد سہیل نے لیا تھا۔اس انٹرویو میں فیض کے فن اور شخصیت پر مصنف کے خیالات صراحت سے سامنے آتے ہیں اس لیے اس مکالمے کی اہمیت بھی ایک تجزیاتی مطالعے کی سی ہے۔اپنے مختصر دیباچے میں مصنف نے (اس کتاب) ''فیض حبیبِ عنبر دست'' کو فیض سے اپنی محبتوں اور عقیدتوں کا اظہار قرار دیا ہے۔

اصغر علی شاہ جعفری، سید، (مرتب)، ''شعورِ تنقید''، صفحات: ۱۷۵، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹٦۸ء

تنقیدی مضامین کے اس مجموعے کے مرتب سید اصغر علی شاہ جعفری اپنے دیباچے (عرض حال) میں بتاتے ہیں:

''یہ مجموعہ مضامین زمانہ حاضرہ کے آئمہ ادب کے شہ پاروں پر مشتمل ہے۔ بالخصوص ایسے

مضامین لیے گئے ہیں جن سے فنِ تنقید اور اس کے ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے۔..... تنقید کے علاوہ اس میں ایسے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جن سے فنی طور پر ادبیت کے اصولوں کو واضح کیا گیا ہے۔ تخیل وادراک کے مسئلے کو باندازِ احسن حل کیا گیا ہے'' (ص ۴،۵) (مرقومہ یکم جنوری ۱۹۶۸ء)

مجموعے کے مشمولات درج ذیل ہیں:

عملی تنقید، پروفیسر سید احتشام حسین۔ تنقید کیا ہے؟ آل احمد سرور۔ جذبات کی اہمیت اور شعر کی افادیت' سید مسعود حسن رضوی۔ مغربی تنقید کا ارتقاء، محمد احسن فاروقی۔ شاعری، بت تراشی اور مصوری، حامد اللہ افسر۔ ارسطو کا نظریہ جمالیات، ممتاز حسین۔ سینٹ آگسٹائن کا نظریہ جمالیات، ممتاز حسین۔ اصول تنقید، سید احتشام حسین۔ شبلی بحیثیت مورخ ونقاد، حامد اللہ افسر۔ ترقی پسند ادب، مجنوں گورکھپوری۔ جدید اردو تنقید، آل احمد سرور۔ تنقید: اصول اور نظریے، حامد اللہ افسر۔ تخیل، مولانا عبدالرحمٰن۔

(یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز کے ابتدائی زمانے کی کتاب ہے۔ ضابطے کے صفحے پر طابع: منصور پریس، لاہور، پرنٹر: اعجاز احمد نیاز اور قیمت: پانچ روپے لکھا ہے۔)

اصغر ندیم سید، ''طرزِ احساس''، صفحات: ۱۸۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

مضامین کے اس مجموعے کے بارے میں اصغر ندیم سید کتاب کے فلیپ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ مضامین اردو میں جدید تر شعری اور ادبی رویوں کو سمجھنے کی ایک کوشش ہیں۔
یہ رویے ایک طرزِ احساس اور ایک تخلیقی مزاج کے بطن سے پھوٹتے ہیں..... یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں خود جس ادب کا مداح ہوں' اُسے میں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اسی سلسلے میں شاعروں اور ادیبوں کے شخصی رویوں کو بھی ایک اہم حوالہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ فرد کی ذات کے روزن سے اس زندگی کو دیکھنا زیادہ بامعنی عمل ہے جو ادب میں مختلف سطحوں پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے''۔

اس مجموعے میں شامل اکثر مضامین، بنیادی طور پر شخصی مضامین ہیں جن میں شخصیت کے فکری وفنی رویے بھی کبھی مفصل اور کبھی سرسری انداز میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ جن شخصیات کو موضوع بنایا گیا وہ یہ ہیں:

ظہور نظر، کشور ناہید، حبیب جالب، عرش صدیقی، منو بھائی، ہرچرن چاولہ، مجید امجد، انتظار حسین، انیس ناگی، منیر نیازی، انور سجاد، آفتاب اقبال شمیم، افضال احمد سید، انوار احمد، سمیع آہوجہ، افتخار عارف، جاوید شاہین، تبسم کاشمیری، اختر ممونکا، مظہر الاسلام۔

علاوہ ازیں درج ذیل علمی وادبی مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔

''الف کی بات'' (صوفیانہ شاعری کے حوالے سے)، ''ژاں ژینے۔۔۔منٹو اور صوفی''، ''معاصر نظم اور شعری آنکھ''، ''نثری نظم پر آدھی نظر''۔

اصغر ندیم سید/ افضال احمد (مرتبین)، ''نئے زمانے کی برہن''، صفحات:۲۹۱، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

''نئے زمانے کی برہن'' انتظار حسین نے کشور ناہید کو کہا تھا، زیرِنظر کتاب کشور ناہید کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے تیئیس اہل قلم کے مضامین پر مشتمل ہے؛ اس کے علاوہ آصف فرخی سے کشور ناہید کا ایک طویل مکالمہ اور خود اپنی شخصیت پر ''میں کون ہوں'' کے عنوان سے کشور ناہید کا ایک مختصر مضمون بھی شامل کتاب ہے۔ اصغر ندیم سید اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''میرے پاس اس کتاب کو مرتب کرنے کا جواز وہ نام ہیں جنھوں نے کبھی کوئی فرمائشی مضمون نہیں لکھا اور نہ ہی کوئی ان کی رائے پر اثر انداز ہوسکا ہے''۔ (ص ۵)

کتاب میں سید سبط حسن، مختار صدیقی، انتظار حسین، سلیم احمد، شہرت بخاری، باقر مہدی، شمیم حنفی، خالدہ حسین، سجاد باقر رضوی، محمد علی صدیقی، منیر احمد شیخ، حمایت علی شاعر، اختر جمال، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر سلیم اختر، رضی عابدی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، زبیر رضوی، رشید امجد، صبا حنفی، اصغر ندیم سید، فردوس حیدر، اور صغیر ملال کے مضامین شامل ہیں۔

افتخار حسین شاہ، ''اقبال اور پیروی شبلی''، صفحات:۱۸۴، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۳ء

کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر ڈاکٹر محمد الطاف علی قریشی (سابق وائس چانسلر ملتان یونیورسٹی) لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سید افتخار حسین شاہ نے گزشتہ بیس سالوں یا اس کے قریب کی مدت میں جو مضامین لکھے تھے، وہ ''اقبال اور پیروی شبلی'' کی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل چودہ مضامین جو مختلف مواقع پر معرضِ تحریر میں آئے، حیاتِ اقبال اور افکارِ اقبال کے سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں''۔
>
> (مرقومہ ۱۹۷۷ء) (ص ۵)

اس کتاب میں شامل مضامین یہ ہیں:

۱۔ اقبال اور پیروی شبلی۔ ۲۔ اقبال محقق اور نقاد کی حیثیت سے۔ ۳۔ اقبال کی قرآن دوستی کا جائزہ۔ ۴۔ ساقی نامہ کا فکری اور فنی جائزہ۔ ۵۔ اقبال، حضور رسالت مآب میں۔ ۶۔ اقبال کا نظریہ حیات ۷۔ اقبال پیام تسخیر فطرت۔ ۸۔ اقبال کی اپنی نظر میں کلام اقبال۔ ۹۔ اقبال کی اردو نثر

۱۰۔اقبال اور کشمیر۔۱۱۔کلام اقبال میں تلمیحات ۔۱۲۔کلام اقبال میں تشبیہات اور استعارے۔
۱۳۔اقبال کا ایک محبوب موضوع۔تعلیم و تربیت ۔۱۴۔اقبال دوستی کا ایک تقاضا۔خود احتساب
گوان تمام موضوعات پر مختلف اہل فکر کا مزید تحقیقی و تنقیدی کام سامنے آ چکا ہے لیکن ان مختصر مضامین (خصوصاً ''اقبال اور پیروی شبلی'') کی اہمیت وافادیت ختم نہیں ہوئی۔

الطاف گوہر، ''تحریریں چند''، صفحات: ۲۷۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

الطاف گوہر نے اپنے کیریئر کا آغاز تخلیق و تنقید سے کیا تھا، بعد میں وہ ملازمتوں کی دنیا میں چلے گئے۔ادب لکھنے پڑھنے سے تھوڑا بہت شغف قائم رکھا، اپنی تحریروں کے زیر نظر مجموعے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یہ تحریریں جمع کرتے ہوئے اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ کیا کچھ لکھنے کو جی چاہتا تھا اور کُل کیا لکھا۔ان میں سے بہت سے مضامین اور نظمیں ایسی ہیں جن کا تعلق ایک گزرے ہوئے زمانے سے ہے''۔(دیباچہ: ''ناگفتہ'' مرقومہ ۱۹۸۰ء)

اپنے غیر رسمی دیباچے ''ناگفتہ.....'' میں انہوں نے اپنی زندگی کے چند واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی ماحول پر اختصار سے اظہارِ خیال کیا ہے؛ اسی تحریر میں انہوں نے (اس مجموعے کے لیے) مختار صدیقی کے لکھے ہوئے پیش لفظ کو بھی شامل کر دیا ہے۔مقالات کے حصے میں درج ذیل عنوانات کے تحت کچھ مفصل، کچھ مختصر تحریریں ہیں:

نوجوان اسکول کا نظریہ شعر، نئی شاعری کی موت، قومی ادب، سرکاری ادب، میرا جی، میرا جی ایک تصویر، طرز اور صاحب ِطرز، طرز اور تجربہ، پاکستانی ادیب کا مسئلہ، ایک اور صنم (منٹو)، چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی (فیض)، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم، حرفِ سردار (حبیب جالب)، احمد ندیم قاسمی۔

مجموعے کا ایک حصہ الطاف گوہر کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے اور آخری حصے میں ان کی تین افسانوی اور طنزیہ تحریریں ہیں۔

امین راحت چغتائی، ''دلائل''، (ادبی، تنقیدی، تاریخی و تحقیقی مضامین)، صفحات: ۴۲۹، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

> ''امین راحت چغتائی کا یہ مجموعہ مضامین۔''دلائل''۔اپنے تنوع اور رنگا رنگی کی وجہ سے اتفاق و اختلاف کے باوجود، میری طرح آپ بھی دلچسپی سے پڑھیں گے اور ایک ایسے نقطہ نظر سے آشنا ہوں گے۔جو یقیناً الگ بھی ہے اور دلچسپ بھی اور جسے چغتائی صاحب نے پوری دیانت، یقین اور تنقیدی شعور کے ساتھ پیش کر دیا ہے'۔(جمیل جالبی، پیش لفظ، ص۸، تاریخ تحریر، ۱۹ مارچ ۱۹۸۹ء)

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں شامل مضامین یہ ہیں:

نظریاتی مملکت اور ادیب، ادیب اور فکر وعمل، ایک قرآنی علامت، حکومت الہیہ: اقبال کی نظر میں، خسروؒ خسرواں، ''اب وہی حرف جنوں.....'' (جدید غزل پہ ترقی پسند تحریک کے اثرات)، اردو مرثیہ، انیس و دبیر کے بعد، آرٹ اور جمالیاتی شعور، اردو ڈرامے کا ایک عہد، پوٹھوہار: تاریخ وثقافت، قدیم یونانی ڈراما، جاپانی شاعری کا مزاج اور ہائیکو، پہلے حصے میں ہی اختر ہوشیار پوری کے دو اور صادق نسیم کے ایک شعری مجموعے پر تبصرے؛ عصمت چغتائی، یوسف ظفر، عبدالعزیز فطرت اور نواب اشک رامپوری پر خاکے شامل ہیں۔

حصہ دوم میں مختلف موضوعاتی منظر نامہ ہے، حصہ دوم کا پیش لفظ ''قحط الکتاب'' کے نام سے ڈاکٹر احمد نبی خان نے لکھا ہے۔ اس حصے میں اسلامی طرز تعمیر کے حوالے سے آٹھ مضامین شامل ہیں؛ ایک مضمون بابل و نینوا کی تہذیب کو موضوع بناتا ہے۔ ایک تاثراتی مضمون داتا دربار کی پر رونق اور روحانی بالیدگی عطا کرنے والی راتوں کے حوالے سے ہے۔ دیگر مضامین کے عنوانات یہ ہیں: شیخ موسیٰ آہن گر، اکی بانا، خوشبو، لعل وجواہر، تصویری صحافت، یورپی مصوری کی نشاۃ الثانیہ۔ اس مجموعے میں تقریباً ہر مضمون کے آخر میں اس مجلّے/ اخبار کا نام مع تاریخ دیا گیا ہے جہاں قبل ازیں یہ مضمون شائع ہو چکا ہے۔

انتظار حسین، ''علامتوں کا زوال''صفحات: ۲۴۳، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

یہ انتظار حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انتظار حسین نے اس کا مختصر دیباچہ ''معذرت'' کے عنوان سے لکھا:

> ''یہ پھٹے ٹوٹے مضامین میری ایک بری عادت کا نتیجہ ہیں، میں ادبی معاملات میں چپ نہیں رہ سکتا۔ ذاتی معاملات میں بولنا، لڑنا بھڑنا مجھے بھلا نہیں لگتا جب ایسا کرتا ہوں تو بعد میں پچھتاتا ہوں مگر یہ میری ذات کا معاملہ ہے..... ٹھہریئے میں پہلے یہ اقرار کر کے اپنی پوزیشن صاف کر لوں کہ یہ کوئی باقاعدہ تنقیدی مقالات نہیں ہیں۔ باقاعدہ تنقیدی مقالہ لکھنے کا تو میں اہل ہی نہیں۔ یہ تو بس چیزوں کے بارے میں، تحریروں کے بارے میں، ادب کے سوالات کے بارے میں، تہذیب کے معاملات کے بارے میں ایک حقیر افسانہ نگار کے ردعمل ہیں''۔
>
> (ص ۵،۶)

انتظار حسین کی کسر نفسی اپنی جگہ لیکن ان کے تنقیدی مضامین مختصر، غیر رسمی اسلوب کے حامل اور تنقید کی ''محمد شاہی روشوں'' سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود ان کے مطالعے کی وسعت، فکر کی گہرائی، ذاتی نقطہ نظر کی ارتقائی تشکیل اور سب سے بڑھ کر زبان وادب کے ہر پہلو سے محبت کو سامنے لاتے ہیں۔

مضامین کی ترتیب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصے میں: اجتماعی تہذیب اور افسانہ، نیا ادب اور پرانی کہانیاں، افسانے

میں نیا طرزِ احساس، علامتوں کا زوال، رسم الخط اور پھول، ادب، گھوڑے سے گفتگو، لکھنا آج کے زمانے میں، ادب کی الف، ب، ت، ڈرامے میں قومی موضوعات، ادب اور تصوف، ہمارے عہد کا ادب، ادب اور عشق، ادب اور تقاضے، بکرم، بیتال اور افسانہ، افسانے میں چوتھا کھونٹ، اور دوسرے حصے میں: کچھ الف لیلہ کے بارے میں، سرشار کی الف لیلہ، شخص اور شاعر، سیتا ہرن، انیس کے مرثیے میں شہر، ناول، حقیقت نگاری اور غالب، گمشدہ امیر خسرو، احمد مشتاق کی غزل، گمشدہ کی واپسی، نئے زمانے کی برہمن، مادھو، اوبلوموف اور زاہد ڈار، خالدہ حسین کی پہچان، ڈیڑھ بات اپنے افسانے پر۔ شامل ہیں۔

''علامتوں کا زوال'' پہلی بار ۱۹۸۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز سے ہی شائع ہوئی تھی، بعد ازاں دسمبر ۱۹۸۳ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی (ہند) نے اسے شائع کیا تھا۔

انور سجاد، ڈاکٹر، ''تلاشِ وجود''، صفحات: ۲۹۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

تلاشِ وجود، معروف افسانہ نگار و ڈرامہ نگار انور سجاد کے فکری اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین میں تخلیقی، تاثراتی اور تنقیدی تینوں مزاج اور اسلوب موجود ہیں۔ فلیپ پر انور سجاد نے اس مجموعے کو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۵ء کے دوران میں لکھے گئے مضامین کا انتخاب کہا ہے۔ مجموعے کے مضامین چار حصوں میں منقسم ہیں:

پہلے حصے میں: انور سجاد نے اپنی افسانہ نگاری کے حوالے سے مضمون ''میں اور میرا فن'' کے علاوہ کشور ناہید، انتظار حسین، مسعود اشعر، مستنصر حسین تارڑ، محمد اختر ممونکا پر مضامین شامل کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں: مصوری ۶۲ء، شاکر علی، امیر احمد پرویز، استاد اللہ بخش، منٹو، چندرن، اسلم کمال پر مضامین ہیں۔ تیسرے حصے میں: پکاسو، ڈرامہ ۱۹۷۰ء اور بانو قدسیہ، ٹی وی ڈرامے کے بارے میں، ارسطو عیار اور جبر کی بوطیقا کے عنوانات کے تحت اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ چوتھے حصے کے عنوانات یہ ہیں: باادب با ملاحظہ ہوشیار، پندارے اور عہد نامہ، ادیب اور عصر، تخلیقی غلامی اور سیاسی اندیشیاں، قومی تشخص اور ثقافت کا مسئلہ اور حکمت بے عملی۔

انیس ناگی، ''تنقیدِ شعر''، صفحات: ۱۲۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

انیس ناگی اپنی دوٹوک رائے اور سخت تنقیدی فیصلوں کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ عموماً اپنے موضوع کے تمام اطراف کا جائزہ اپنے مخصوص نقطہ نظر سے لیتے ہیں اور بغیر کسی تکلف اور لحاظ کے اسے پیش کر دیتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب نظری تنقید کے زمرے میں آتی ہے لہٰذا انیس ناگی کی عملی تنقید کی طرح متنازع نہیں ہوئی البتہ اس کی اہمیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

اس میں شاعری کے مختلف نظریات، شاعرانہ خیال، تجربہ، ہیئت، آہنگ کے ساتھ لفظ و معنی کا رشتہ، متخیلہ کی کارکردگی، استعارہ کا پھیلاؤ، امیجری کی خوبی، اور علامت کے حسن کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ، سنجیدہ اور وضاحتی ہے، سمجھانے اور موضوع کو کھولنے کا انداز حاوی ہے لیکن اپنی رائے ٹھونسنے اور خطیبانہ طرز میں دلائل کی تکرار کا عمل نہیں ہے۔

انیس ناگی، ''غالب، ایک شاعر، ایک اداکار''، صفحات: ۱۱۰، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

انیس ناگی تنقید میں اپنی منفرد سوچ اور اپروچ کے حوالے سے معروف بھی ہیں اور متنازع بھی۔ معاصر ادب پر لکھنے کے ساتھ ساتھ وہ کلاسیکی ادب پر اپنے مخصوص نقطہ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں اور دوٹوک لہجے میں نتائج فکر پیش کر دیتے ہیں؛ زیرنظر کتاب اس اجمال کی تفصیل ہے۔ اس کتاب کے ابواب یہ ہیں:۔

غالب کا مطالعہ، غالب کا کلکتہ کا سفر، غالب کی علالت، غالب کی ازدواجی زندگی، غالب اور انگریز، غالب، ایک شاعر، ایک اداکار، غالب کی غزل، غالب کی نثر، غالب کی شاعری میں ابہام، غالب اور پنجاب آرکائیوز۔

کتاب کے دیباچے ''مطلع'' (مرقوم ۱۹۸۶ء) میں سعادت سعید لکھتے ہیں:

> ''انیس ناگی کے خیال میں غالب ایک **لیجنڈ** بن چکے ہیں اور ان کے بارے میں جس سطح کی تنقید کا اہتمام ہونا چاہیے تھا اس سے اردو ادبی تاریخ کے صفحات خالی ہیں..... انیس ناگی نے اپنی اس کتاب میں غالب کو اپنے معاصر عہد کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے..... انیس ناگی نے غالب کی ذات اور شاعری کو ایک کل میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے..... یہ کتاب غالب کی شخصیت اور فن کے بارے میں نزاعی مباحث کا ایک ہنگامہ پرور سلسلہ بھی رکھتی ہے''۔
> (ص ۷، ۸، ۱۲)

انیس ناگی، ''مذاکرات''، صفحات: ۱۲۶، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

یہ مجموعہ انیس ناگی کے تنقیدی مضامین، مراسلہ نما مضمون، انٹرویو اور دو کتابوں کے تجزیاتی مطالعوں پر مشتمل ہے۔

مندرجات کے عنوانات یہ ہیں:

ادب میں اجنبیت، ادب اور تعلقات عامہ، بابو گوپی ناتھ سے ملاقات، سارتر کے لیے، غالب، انور سجاد کے نام ایک غیر شخصی مراسلہ، نیا افسانہ اور معنی آفرینی، افسانہ: اینٹی افسانہ، ترجمے کی لہر، محمد حسن عسکری: تعزیت نامہ، ایک شخصی مکالمہ (انٹرویو)، نئے شاعر کے نام۔ مطالعے: کچھوے از انتظار حسین، پہچان از خالدہ حسین۔

اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر، ''کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار''، صفحات: ۱۷۶، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

زیرنظر مجموعے میں شامل مضامین مختلف وقتوں میں لکھے گئے، ان مضامین کی انفرادیت بقول مصنف کے یہ ہے:

''ان میں جن افسانہ نگاروں (ماسوائے ایک آدھ افسانہ نگار کے) کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ

اپنی بڑائی، مقبولیت اور شہرت کے باوجود نقادوں کی توجہ سے محروم رہے ہیں..... حالانکہ یہ سب
افسانہ نگار اردو افسانے کی روایت میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں''۔(ص ۷)

مجموعے میں درج ذیل افسانہ نگاروں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے:

پریم چند، حکیم احمد شجاع، نیاز فتح پوری، سعادت حسن منٹو، غلام الثقلین نقوی، عرش صدیقی، منصور قیصر، عذرا اصغر، انوار احمد، طارق محمود۔

اے۔بی اشرف نے اپنے دیباچے ''جواز'' میں تمام مضامین کے متعلق ان کی تنقیدی نوعیت، حیثیت اور کیفیت اختصار سے بیان کر دی ہے۔

اے۔بی اشرف، ڈاکٹر، ''کچھ نئے اور پرانے شاعر''، صفحات: ۲۴۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر اے۔بی اشرف نے اس کتاب میں اُنیس نئے اور پرانے شاعروں کا فکری اور فنی جائزہ لیا ہے۔ یہ مضامین مختلف وقتوں میں لکھے گئے اور متعدد مجلوں میں شائع ہوئے۔ ان مضامین میں شاعروں کے تنقیدی تجزیے کرتے ہوئے ان کے کلام کے منتخب نمونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے ہیں تا کہ بقول اے۔بی اشرف: ''ان کے مجموعہ ہائے کلام کا مطالعہ کئے بغیر بھی محض ان مضامین کے حوالے سے ان کے کلام سے لطف اور واقفیت حاصل ہو جائے''۔(ص ۸)

کتاب کے دیباچے ''جواز'' میں سنگ میل پبلی کیشنز کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اے۔بی اشرف کہتے ہیں:

> ''نیاز صاحب نے اپنی انتھک محنت، لگن اور انہماک سے اپنے اس ادارے کو پاکستان کے صف اول کے اشاعتی اداروں میں شامل کر دیا ہے۔ ماضی میں جو علمی و ادبی خدمات نولکشور کے ادارے نے انجام دیں، وہی حال میں سنگ میل پبلی کیشنز انجام دے رہا ہے۔''
> (ص ۷)(مرقومہ: ۱۹۸۸ء)

اے۔بی اشرف، ڈاکٹر، ''مسائلِ ادب۔ تنقید و تجزیہ''، صفحات: ۵۰۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

یہ مجموعہ ڈاکٹر اے۔بی اشرف کے مختلف اور متفرق موضوعات پر مضامین کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔ پہلے حصے ''مسائل ادب و شعر'' میں ادب کی ماہیت، اہمیت، اردو ادب کے مستقبل اور میتھو آرنلڈ، ٹی ایس ایلیٹ اور حالی کے تصور شعر کے حوالے سے نو مضامین ہیں۔ دوسرا حصہ ڈرامے کے لیے مختص ہے، تیسرے حصے میں میر، غالب اور اقبال کی شاعری پر سات مضامین ہیں؛ چوتھا حصہ: ''ناول اور افسانہ'' میں سرشار، پریم چند، رحیم گل، شوکت صدیقی، الطاف فاطمہ، انتظار حسین، طارق محمود اور منٹو کے فن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پانچواں حصہ: ''انشائیہ'' میں اقبال ساغر صدیقی، شمیم ترمذی اور شہزاد قیصر کے انشائیوں پر بحث کی گئی ہے۔ آخری حصے میں متفرق

موضوعات مثلاً جدید ادب میں تصورِ انساں، نثری نظم، توزک جہانگیری وغیرہ پر اظہار خیال ہے۔

اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر اے۔ بی اشرف نے تنقید کی اہمیت اور نقاد کے منصب پر اپنے خیالات اور احساسات کو پیش کیا ہے نیز اپنے تنقیدی مضامین کے حوالے سے کہا ہے کہ وہ معلم ہونے کے باعث اپنے طلبہ کی درسی ضروریات کو ضرور سامنے رکھتے ہیں اور انہیں مدرسانہ تنقید کی تہمت عائد ہونے پر کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔

بذلِ حق محمود، ''ایران کے عوامی گیت اور عوامی کہانیاں''، صفحات: ۱۸۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

زیرِ نظر کتاب کا تعارف مقبول بیگ بدخشانی ان الفاظ میں کراتے ہیں:

> ''مصنف نے محنت، لگن اور جستجو سے ترک فارسی، تاتاری، ماژندانی، گورانی، گیلی، لرُی اور دیگر بولیوں کے عوامی گیت منتخب کر کے یکجا کر دیئے ہیں..... ان گیتوں کا تاریخی پس منظر اور ان کی صوتی اہمیت بھی عالمانہ انداز میں واضح کی گئی ہے..... مصنف نے ان گیتوں کے شستہ اردو میں ترجمے کر کے اہل ذوق کی دلچسپی کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے۔ ترجموں کی خوبی یہ ہے کہ گیتوں کی معنویت، رعنائی اور دلچسپی جوں کی توں قائم ہے''۔ (پیش لفظ: ص: ۵)

کتاب میں بذلِ حق محمود (مرحوم) نے ایران کے عوامی گیتوں اور شاعروں کے تفصیلی جائزوں کے ساتھ عوامی گیتوں کے اوزان پر بھی روشنی ڈالی ہے؛ علاوہ ازیں ''عوامی گیت اور جدید فارسی شاعری'' اور ''عوامی موسیقی اور جدید فارسی شاعری'' دو ایسے مضامین ہیں جن کے ذریعے کتاب قدیم عوامی گیتوں سے اپنا سفر شروع کر کے جدید فارسی شاعری کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

آخر میں موجود ایک مبسوط اشاریہ کتاب کی افادیت بڑھا رہا ہے۔

تاج سعید (مرتب)، ''بنجارے کے خواب'' (ساحر لدھیانوی: شخصیت اور فن)، صفحات: ۳۹۶، سن اشاعت ندارد

''بنجارے کے خواب'' ساحر لدھیانوی کے شخصیت اور فن پر گیارہ مضامین اور ان کے تمام شعری کلام پر مشتمل مجموعہ ہے۔

اس مجموعے میں فارغ بخاری، فکر تونسوی، امرتا پریتم، زاہد عکاسی، اظہر جاوید، طاہر تونسوی، سعادت سعید، کرنل غلام سرور، یونس احمر اور محسن بھوپالی کے مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین (بقول مرتب) مطبوعہ ہیں اور کچھ پہلی بار شائع ہوئے ہیں۔

مجموعے کا دوسرا حصہ ساحر لدھیانوی کی شعری کلیات ہے جس میں ان کے درج ذیل شعری مجموعے (مع غیر مطبوعہ کلام) شامل ہیں۔ تلخیاں، پرچھائیاں، گا تا جائے بنجارا، آؤ کہ کوئی خواب بنیں، میں پل دو پل کا شاعر ہوں، غیر مطبوعہ کلام۔

تاج سعید (مرتب)، ''جہانِ فراق''، صفحات: ۳۹۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

اردو کے ممتاز شاعر اور رومانی نقاد و نثر نگار فراق گورکھپوری کی وفات پر تاج سعید نے ان کے فن و شخصیت کے عکس کو ایک کتاب میں منعکس کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ''جہانِ فراق'' مرتب ہوا۔ اس مجموعے میں فراق کی نظمیں، غزلیں، نثری مضامین اور تنقیدی مقالے موجود ہیں؛ اس کے علاوہ ان کے چار اہم انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ بقول مرتب: ''جن کے مطالعے سے ان کے نظریات و عقائد کو سمجھنے میں بے حد مدد ملے گی''۔ (پیش لفظ، مرقومہ: ۱۹۸۳ء، ص ۱۸)

آخری حصے میں فراق کی شخصیت اور فن پر محمد حسن عسکری کے تین اور مظفر علی سید اور فارغ بخاری کا ایک ایک مضمون شامل ہے۔

تاج سعید (مرتب)، ''کرشن نگر'' (کرشن چندر، فن اور شخصیت)، صفحات: ۲۸۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۱ء

اس مجموعے میں کرشن چندر کے حوالے سے مضامین، اور ان کے انٹرویو، منتخب افسانے، طنزیہ اور تمثیلی مضامین شامل ہیں۔ گویا کرشن چندر کے (بقول مرتب) ''سبھی رُخ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے'' (ص ۱۹) حرفِ آغاز میں تاج سعید نے کرشن چندر کی شخصیت اور افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ دیگر مضامین یہ ہیں: کرشن چندر کا مطالعہ (ظ۔ انصاری)، کرشن چندر، میرا یار (راجندر سنگھ بیدی) کرشن چندر، آدمی ہی آدمی (مجتبٰے حسین)، کرشن چندر سے انٹرویو (نریش کمار شاد) کہانی کی کہانی (کرشن چندر)، یادداشتیں (کرشن چندر کے حوالے سے چند سوانحی نکات)

کرشن چندر کے یہ افسانے، زیر نظر مجموعے کے لیے منتخب کیے گئے: بیوی کترا، بے داغ فولاد، لیڈر کی کرسی، تائی ایسری، کچرا بابا، ربڑ کی عورت، بند دروازے، مہالکشمی کا پل، پیاسا۔

طنز، انشاء، تمثیل کے تحت یہ تحریریں انتخاب کی گئیں: رونا، غسلیات، مس بیلا باٹلی والا۔

آخر میں ''روحِ افسانہ'' کے عنوان سے کرشن چندر کے افسانوں سے چند فکر انگیز اقتباسات یکجا کیے گئے ہیں۔

تبسم کاشمیری، (مرتب)، ''نقدِ سرشار''، صفحات: ۳۰۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۶۸ء (پہلی بار)

''نقدِ سرشار'' کا تعارف تبسم کاشمیری نے ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''سرشار پر مضامین کا یہ مجموعہ، ان مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے جو گذشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ میں سرشار کی زندگی اور فن کے مختلف گوشوں پر لکھے گئے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں سرشار پر جو تحقیقی کام ہوا ہے، اسے قابل قدر کہنا مشکل ہے...... میرے پیش نظر یہ اصول رہا کہ دستیاب شدہ مضامین سے چند ایسے نمائندہ معیاری مضامین منتخب کیے جائیں جو سرشار کے فن اور ان کی زندگی کے روشن اور تاریک گوشوں کو پیش کرتے ہوں''۔
>
> (پیش لفظ: ص: ۳، ۴، تاریخ تحریر: ۷ جنوری ۱۹۶۸ء)

تبسم کاشمیری نے اپنے مقدمے بعنوان ''سرشار۔تحقیقی جائزہ'' میں پنڈت رتن ناتھ سرشار پر ہونے والے تحقیقی وتنقیدی کام کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔مجموعے میں تبسم کاشمیری کے دیگر دو مضامین ''معارضہ سرشار اوراودھ پنچ'' اور'' دبدبہ آصفی اورسرشار'' بھی شامل ہیں۔

مجموعے کے دیگر قابل ذکر مضامین یہ ہیں: سرشار کی ظرافت (سید وقار عظیم)، خوجی (وزیر آغا) فسانہ آزاد (خورشید الاسلام)، لکھنوی تہذیب اور فسانہ آزاد (گوہر نوشاہی)، گورغریباں، سرشار کا ایک المیہ ناول (نادم سیتاپوری)۔علاوہ ازیں پریم پال اشک، احراز نقوی، شیخ عبدالقادر، چکبست، روف روفی، کشن پرشاد کول، رزاق فاروقی اور عظیم الشان صدیقی کے مضامین بھی شامل ہیں۔

سرشار کی ایک متنازعہ تصنیف ''چنچل نار'' کے حوالے سے ایک بحث بھی کتاب میں موجود ہے جس میں حکیم چند نیرّ، پریم پال اشک، نصیرالدین ہاشمی اور قمر رئیس نے حصہ لیا ہے۔

تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''نئے شعری تجزیے''، صفحات:۱۵۷، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۷۸ء

''نئے شعری تجزیے'' ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے تیرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں جدید شاعری کے حوالے سے نظری اور عملی تنقید پیش کی گئی ہے۔مجموعے میں شامل مضامین کے عنوان درج ذیل ہیں:

انجمن پنجاب کی شعری تحریک۔سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر، حالی اور تاریخ کا مادی شعور، میراجی۔جب اور اب، میراجی۔روپ بہروپ، راشد اور نیا آدمی، میرے بھی ہیں کچھ خواب۔راشد، مجید امجد۔آشوبِ زیست اور مقامی وجود کا مسئلہ، لامکاں تا مکاں۔ڈاکٹر تصدق حسین خالد، نوحے۔انیس ناگی، ان کہی باتوں کی تھکن۔سرمد صہبائی، نئی شاعری کا میتھڈ، نئی شاعری۔ماضی وحال، جدیدیت کیا ہے؟

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے درج بالا تنقیدی مطالعے نئی شاعری کی تفہیم کے لیے خاصی آسانیاں پیدا کرنے کے موجب بنے ہیں۔

جاوید اختر، سید، ڈاکٹر، ''اردو کی ناول نگار خواتین (ترقی پسند تحریک سے دورِ حاضر تک)''، صفحات:۲۴۸، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

ڈاکٹر سید جاوید اختر نے اس موضوع پر مقالہ لکھ کر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔(زیر نظر کتاب اسی تحقیقی وتنقیدی مقالے کا کتابی روپ ہے) ڈاکٹر سید جاوید اختر نے خواتین ناول نگاروں کا گہرا فنی مطالعہ پیش کر کے تاریخ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ (بقول ان کے) اس ادبی ناانصافی کا ازالہ ہو سکے جو خواتین ناول نگاروں سے اردو کی تاریخ وتنقید نے روا رکھی ہے۔وہ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''ناول نگار خواتین مرد اہل قلم کے مقابلے میں کم تر نہیں بلکہ بعض ناول نگار خواتین تو ایسی بھی ہیں جو اپنے فن کی پختگی اور انفرادی اسلوب کے اعتبار سے مرد ناول نگاروں پر سبقت رکھتی ہیں'' (ص۵)

مقالے کے ابواب کی ترتیب کچھ یوں ہے: ناول کی ابتداء میں خواتین کا حصہ، ترقی پسند تحریک کی رو، اردو ناول میں خیالی دنیا، تحت الشعور کی بازگشت، خواتین کے معاشرتی ناول اور سماجی رویے، ناول نگاروں پر ۴۷ء کے خونچکاں واقعات کا اثر، خاتون ادیبوں کے بنیادی رجحانات، اختتامیہ۔ آخر میں کتابیات اور حوالہ جات وحواشی درج ہیں۔

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''معاصر ادب''، صفحات:۴۶۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''معاصرِ ادب''، جمیل جالبی کے ادبی، تنقیدی اور فکری مضامین کا مجموعہ ہے، اس کا پیش لفظ ڈاکٹر قاضی عبدالقادر نے لکھا، ان کے بقول: ''اس مجموعے میں شامل مضامین متنوع ہونے کے باوجود ایک داخلی رشتے میں مربوط ہیں''۔ (ص۱۴)

کتاب میں مختلف ادبی شخصیات، فکری رویوں، تنقیدی زاویوں اور اہم تخلیقی کتابوں پر ناوے مضامین ہیں لیکن مختصر ہونے کے باعث فالتو الفاظ اور روایتی توصیفی کلمات کے بجائے زیر بحث موضوع کے چند اہم نکات روشن کرنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔

شخصیات میں عزیز احمد، میرا جی، حسن عسکری، ابوالفضل صدیقی، جمیلہ ہاشمی، عصمت چغتائی، رضیہ فصیح احمد، مشرف احمد، آصف فرخی، نذر الحسن نقوی، سرسید، شبلی، اکبر، نیاز، اشتیاق حسین قریشی، اقبال، جوش، فیض، فراق، غلام عباس، مجنوں، سید عبداللہ، اختر حسین رائے پوری، سہیل بخاری، رحمٰن بابا، شاہ عبداللطیف بھٹائی، حافظ شیرازی، نصرتی کے علاوہ اور بھی کئی اہم نام ہیں۔ جن پر اختصار سے مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں چند فکری، ادبی مضامین کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں:

ادب کی صورتحال، نئے لکھنے والوں سے، صحیح ادبی رویہ، شاعری اور مسائل حیات، ادب اور جمہوریت، فن تدوین، مشاعرے کی روایت۔ پاکستانی فکر کی اساس۔ اس مجموعے کے کم وبیش تمام مضامین کے آخر میں تاریخ تحریر بھی درج کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ مضامین ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء کے درمیان میں لکھے گئے۔

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''ایلیٹ کے مضامین''، صفحات:۳۱۹، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

تاریخ اور تنقیدی تراجم جمیل جالبی کا اختصاص ہے۔ ''ایلیٹ کے مضامین'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء اور دوسرا ایڈیشن (اضافہ شدہ) ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا اور آج تک اس کے پاکستان اور بھارت میں مختلف اور متعدد ایڈیشنز سامنے آچکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اس کتاب کے فلیپ میں کہا ہے کہ ''ہمارا تنقیدی طرز حالی کے مقدمے سے آگے بڑھتا ہوا اگر کہیں دکھائی دیتا ہے تو اس ترجمہ میں''۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں جمیل جالبی نے ٹی ایس ایلیٹ کا بحیثیت نقاد، شاعر، اور ڈراما نگار تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایلیٹ کے مضامین: شاعری کا سماجی منصب، شاعری کی تین آوازیں، شاعری کی موسیقی، شاعری اور ڈراما، شاعری اور پروپیگنڈا، بودلیئر، روایت اور انفرادی صلاحیت، کلاسیک کیا ہے؟، مذہب اور ادب، ادب اور عصر جدید، صحافت اور ادب، تنقید کا منصب، تجربہ اور تنقید، تنقید کے حدود، شامل ہیں۔ جمیل جالبی کا ترجمہ نہ تو خشک ہے، نہ ہی گنجلک، اصل عبارت کی تفہیم اور ترسیل قابل داد ہے۔

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''میرا جی۔ایک مطالعہ''، صفحات:۷۵۶، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جہاں ''کلیاتِ میراجی'' کی تدوین کا مشکل مرحلہ سر کیا، وہیں ''میرا جی۔ایک مطالعہ'' کے عنوان سے میرا جی شناسی کو آگے بڑھانے کے لیے ایک عظیم اور ضخیم دستاویز مرتب کر ڈالی۔

''میرا جی۔ایک مطالعہ'' میں جمیل جالبی نے میرا جی کے کوائف، اور ''میرا جی۔ایک مطالعہ'' کے عنوان سے اپنا ایک مبسوط مضمون بطور ''آغازیہ'' شامل کیا۔جمیل جالبی نے اردو میں اور میرا جی کی شخصیت و فن پر لکھے جانے والے ہر اہم اور قابل ذکر مضمون کو کتاب میں جگہ دی۔جمیل جالبی اپنے دیباچے ''اس کتاب کے بارے میں'' لکھتے ہیں: ''اس کتاب کی ترتیب کے دوران میری نظر سے کم و بیش وہ ساری تحریریں گزری ہیں جو اب تک میرا جی کے بارے میں لکھی گئی ہیں یا میرا جی نے لکھی ہیں'' (ص ۱۳)

اس مجموعے میں میرا جی کی شخصیت اور فن پر مختلف اہل قلم کے کل تیس مضامین موجود ہیں۔اس کے علاوہ میرا جی کی اٹھائیس نایاب تحریریں اور چار خطوط بھی شامل ہیں۔آخر میں ڈاکٹر صدیق جاوید کی مرتب کردہ منتخب کتابیات بھی اس مجموعے کی اہمیت کو بڑھا رہی ہے۔

جوش ملسیانی، ''شرحِ دیوانِ غالب''، صفحات:۴۳۰، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

''شرحِ دیوانِ غالب'' کے آغاز میں سابق اشاعتوں کے تین مختصر دیباچے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا؛ تب سے اب تک اس کے مختلف ایڈیشن طبع ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔

زیرِنظر شرح کے دیباچے میں جوش ملسیانی نے اپنی شرح کے امتیازات مختصراً بیان کیے ہیں۔ان کے بقول شرح میں پاک و ہند کے اردو خواں طالب علموں کی ضروریات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔غزلوں کی شرح سے پہلے غالب کی سوانح، نثر نگاری اور شعری خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ دیگر شاعروں سے غالب کا شعری موازنہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

حسن اختر، ڈاکٹر، ''تنقیدی اور تحقیقی جائزے''، صفحات:۲۳۱، زیرِنظر ایڈیشن ۱۹۸۳ء

''تنقیدی اور تحقیقی جائزے''، مختلف اور متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو بقول مصنف ''گذشتہ بیس برس کے دوران لکھے گئے'' (ص ۶)

اس مجموعے میں علامہ اقبال کے حوالے سے چار مضامین: بیاد سال اقبال، ہمارے آئینی مسائل اور اقبال، اقبال: شاعر عالم انسانی، اقبال اور نئی نسل، خاص توجہ کے لائق ہیں۔دیگر مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

عہد محمد شاہی کی لسانی خصوصیت، عہد محمد شاہ کا املا، مثنوی لعل و گوہر کا زمانہ تصنیف، میر کا سال پیدائش، دہلویت اور لکھنویت، غالب اور فرہاد، اکبر اور سرسید کی ذہنی مماثلتیں، حالی کی غزل گوئی، پریم چند کی ناول نگاری، شورش کاشمیری کی نثر، اداس نسلیں، اردو تنقید کا ارتقا۔

درج بالا میں سے پہلے چار مضامین میں: ''نئے حقائق کو دریافت کیا گیا ہے اور دوسروں میں ایک نئے زاویے سے مشاہیر کی

تخلیقات کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے''۔ (پیش لفظ: ص۶)

حسن رضوی، ڈاکٹر، ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' (ناصر کاظمی، شخصیت اور فن)، صفحات: ۵۹۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' اصل میں ڈاکٹر حسن رضوی کے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے ''ناصر کاظمی، شخصیت اور فن'' کی کتابی صورت ہے، جسے مقالے کی طوالت اور ضخامت کم کرنے کے لیے ایڈیٹ کر کے طبع کیا گیا ہے۔

اس کا پیش لفظ انتظار حسین نے لکھا ہے اور حسن رضوی کی تحقیق و تنقید کو سراہا ہے۔ انتظار حسین نے کچھ تنقیدی آرا سے اختلاف اور کچھ سوانحی بیانات کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ کسی بھی تخلیق کار (خصوصاً ناصر) کے شخصی، فکری اور گفتاری رویوں کو مزید سمجھنے پر اصرار کیا ہے۔ حسن رضوی کے دیباچے ''حرفِ آغاز'' میں تحقیقی سفر کی مشکلات اور محقق کی تگ و دو سامنے آتی ہے۔ حسن رضوی نے ناصر کاظمی کی سوانح کو تلاش اور مرتب کرنے میں خاصی کاوش کی ہے، ان کی شاعری اور نثر پر عمدگی سے اظہار خیال کیا ہے، اور ناصر کاظمی کی گفتگو، مکالمے اور غیر مطبوعہ ڈائریاں یکجا کر کے ان کی سوانح اور فن کی گمشدہ کڑیاں جوڑنے نیز ناصر کے تخلیقی بطون کو روشنی میں لانے کا بڑی خوبی سے اہتمام کیا ہے۔ ضمیمے کے طور پر ناصر کاظمی کی تحریروں کے عکس بھی شامل کتاب ہیں۔

حسن رضوی، (مرتب)، ''اقبال کے فکری آئینے''، صفحات: ۳۳۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

حسن رضوی کتاب کے مختصر دیباچے ''پہلا ورق'' میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال کی فکر کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان جہتوں کے حوالے سے اس کتاب میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے پاک و ہند کے ممتاز دانش وروں کے مضامین شامل کیے گئے ہیں تاکہ علامہ اقبال کے فن اور شخصیت کو مختلف حوالوں سے دیکھا جا سکے اور ان کی شاعری اور فکر کی مختلف پرتیں کھل کر سامنے آ سکیں''۔ (ص۱۰)

کتاب میں مضامین اور ان کے مصنفین کے نام درج ذیل ہیں:

اقبال اور پاکستان (ممتاز حسین)، اقبال کا نظریہ فن (سید وقار عظیم)، اقبال کا مقصد حیات (عبداللہ قریشی)، اقبال کا فلسفہ خودی (ڈاکٹر عندلیب شادانی)، اقبال کی شاعری کے انسانی پہلو (ڈاکٹر عبادت بریلوی)، اقبال اور عشق (سید عابد علی عابد)، اقبال اور صوفی / خودی سے بے خودی تک (ڈاکٹر سید عبداللہ)، ترمیمات اقبال کا تنقیدی جائزہ (جگن ناتھ آزاد)، اقبال بحیثیت مفکر (سید عبدالواحد)' اسلوبیات اقبال (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)، اقبال کی غزل (شمیم حنفی)، غزل کی نئی جہت اور اقبال (ڈاکٹر سلیم اختر)، اقبال اور نطشے (بشیر ڈار)، اقبال اور مغرب (سید عبدالواحد)، ادب اور فنون لطیفہ کے متعلق اقبال کا نظریہ (ڈاکٹر عندلیب شادانی)، اقبال کا تصور فقر (حسن رضوی)، اقبال کا نظریہ انسان کامل (ابوسعید نورالدین)، اقبال کا تدریجی ارتقا (یوسف ظفر)، اقبال کا نظریہ فن و ادب (ڈاکٹر محمد دین

تاثیر)، اقبال کا تصور خودی (ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی)، سکون و حرکت اقبال کی نظر میں (ممتاز حسین)، خضرِ راہ ایک مطالعہ (پروفیسر آل احمد سرور)، اقبال کی طویل نظموں کی باز آفرینی (مسعود حسین خان)، اسلامی ثقافت کی روح/ اقبال کا خطبہ پنجم (سعادت سعید)۔

حسن عسکری، محمد، ''عسکری نامہ'' (افسانے، مضامین)، صفحات: ۶۳۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

زیرِ نظر ضخیم مجموعے کے دو حصے ہیں: افسانے، مضامین، پہلا حصہ: حسن عسکری کے دو افسانوی مجموعوں: ''جزیرے'' اور ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' پر مشتمل ہے۔ مجموعہ ''جزیرے'' پہلی بار ۱۹۴۳ء اور ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' ۱۹۴۷ء میں ساقی بک ڈپو، دہلی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا؛ (محمد سہیل عمر کی مرتب کردہ) دونوں مجموعوں پر مشتمل کلیات ڈاکٹر جمیل جالبی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۸۷ء میں نفیس اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ پہلے مجموعے ''جزیرے'' میں شامل افسانے درج ذیل ہیں:

کالج سے گھر تک، پھسلن، حرام جادی، میلاد شریف، چائے کی پیالی، اندھیرے کے پیچھے، ایک معمولی خط، وہ تین۔

ان افسانوں کے بعد حسن عسکری کا لکھا ہوا اختتامیہ ہے جو اصل میں کتاب کا ابتدائیہ ہونا چاہیے تھا لیکن عسکری نے اسے آخر میں رکھنا پسند کیا، اختتامیہ پر تاریخ تحریر ۳ فروری، ۱۹۴۳ء درج ہے۔ ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے، میں شامل افسانے تین ہیں: ذکر انور، گٹھلیوں کے دام، قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے، ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کے افسانے جدید اردو افسانے کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ ''شعور کی رو'' وہ بنیادی تکنیک ہے جسے عسکری نے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ نہایت خوبی سے نبھا کر اردو فکشن کے لیے نیا راستہ کھولا اور اردو افسانے کو مغرب کے افسانے کے دائرے میں داخل کر دیا''۔ (ص ۱۳، تاریخ تحریر: ۳۰ مئی ۱۹۸۷ء)

''عسکری نامہ'' کے دوسرے حصے کا عنوان: ''تخلیقی عمل اور اسلوب'' ہے۔ اس حصے میں وہ ادبی و فکری مضامین شامل ہیں جو حسن عسکری نے ''جھلکیاں'' کے عنوان سے ماہنامہ ساقی کے لیے جنوری ۱۹۴۹ء سے نومبر ۱۹۵۷ء تک لکھے۔

حسن عسکری ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۷ء تک باقاعدگی سے ماہنامہ ساقی دہلی، (۴۷ء کے بعد) کراچی میں ''جھلکیاں'' کے عنوان سے مضامین لکھتے رہے لیکن ان مضامین پر مشتمل مجموعہ حسن عسکری کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۸۱ء میں جھلکیاں کے عنوان سے اس سلسلہ مضامین کی پہلی جلد (جسے محمد سہیل عمر نے مرتب کیا تھا) شائع ہوئی۔ پہلی جلد میں جنوری ۱۹۴۴ء سے دسمبر ۱۹۴۸ء تک کے مضامین شامل تھے؛ ۱۹۸۷ء میں دوسری جلد ''تخلیقی عمل اور اسلوب'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور اس میں جنوری ۱۹۴۹ء سے نومبر ۱۹۵۷ء تک کے مضامین شامل تھے۔ (اسے محمد سہیل عمر نے مرتب اور نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا تھا)

''عسکری نامہ'' میں جلد دوم کے تمام مضامین کو شریک کیا گیا ہے جو کہ تعداد میں ۶۷ ہیں؛ ان مضامین کے عنوان درج ذیل ہیں:

تاریخی شعور، ادبی روایت اور نئے ادیب، معروضیت اور ذمہ داری، قرار دادِ مقاصد اور پاکستان، استعجاب اور ادب، پاکستانی ادب، پاکستانی قوم ادب اور ادیب، جدیدیت، غالب اور میرجی، کچھ صوبہ سرحد کے بارے میں، تلفظ کا مسئلہ۔۔آزادی اظہار، آزادی رائے، ادبی تجزیے، غالب کی انفرادیت، نظریہ افادیت اور ادب، افادی ادب، کامیو اور مقصدی ادب، ہمارے شاعر اور اتباع میر، اتباع میر، خانخاناں اور درباری زندگی، منٹو کے افسانے، معاشرہ اور ادیب، ناپختہ ادب، تخلیق اور اسلوب، عشق، ادب اور معاشرہ، عشق اور زندگی، عشق اور شعور، انتظار حسین کے افسانے، بے تعلقی اور بے اعتنائی، خالص اسلام، میر، غالب اور چھوٹی بحر کا قصہ، نئی غزل، ادب' ادیب اور مسائل وقت، ۳۔تبصرے، ادب اور قارئین ادب، شاعری اور قدرت الفاظ، اردو ادب کی موت، ادیب، کچھ فراق صاحب کے بارے میں، اردو ادب میں ایک نیا رجحان، مولانا محمد حسین آزاد کا طرزِ نگارش، ادب اور قارئین ادب، قارئین ادب، مقدمہ شعر و شاعری، اردو زبان، سرکاری زبان، انگریزی زبان اور نصابِ تعلیم، ادب اور طالب علم، حلقہ ارباب ذوق، منٹو اور اردو ادب، ادب، ادیب اور طالب علم، سودا کی ہجویات، ۲۵ سال کے ادب کا جائزہ، قارئین ادب اور تخلیقی عمل، یونگ اور جعلی روحانیت، ٹامس مان، سرمایہ داری اور تنقید، ادب، آزادی رائے اور تہذیبی آزادی کی انجمن، زر پرستوں کی تنقیدِ ادب، جواب آں تنقید، فراق صاحب کی تنقیدِ غزل، مجاز کی موت پر، کہانی کے روپ، خواجہ منظور حسین اور نقدِ اقبال، ڑولیاں باندا، تھیٹر اور قومی تعمیر، زر پرستی اور شعورِ ذات، فراق اور ہجویاتِ اثر، کچھ ہجوگوئی کے بارے میں۔

''عسکری نامہ'' کی اشاعت سے حسن عسکری کے دو نایاب افسانوی مجموعے اور کمیاب ۶۷ تنقیدی مضامین دوبارہ منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔

حسن عسکری، محمد، ''مجموعہ محمد حسن عسکری''، صفحات: ۱۲۷۵، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''مجموعہ محمد حسن عسکری''۔۔محمد حسن عسکری کے درج ذیل پانچ تنقیدی مجموعوں پر مشتمل ہے:

انسان اور آدمی، ستارہ یا بادبان، وقت کی راگنی، جھلکیاں، جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ۔

مجموعہ ''انسان اور آدمی'' پہلی بار ۱۹۵۳ء میں مکتبہ جدید، لاہور، ''ستارہ یا بادبان'' ۱۹۶۳ء میں مکتبہ سات رنگ کراچی، ''وقت کی راگنی'' ۱۹۷۹ء میں مکتبہ محراب لاہور (ناشر: احمد مشتاق)، ''جھلکیاں'' ۱۹۸۱ء میں۔''جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کا خاکہ'' ۱۹۷۹ء میں آب حیات راولپنڈی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

زیرنظر ضخیم مجموعے (مجموعہ محمد حسن عسکری) کے فلیپ پر انتظار حسین کی رائے درج ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''عسکری صاحب کے مضامین کو ذرا شروع سے آخر تک دیکھیے۔''جھلکیاں'' اور ''انسان اور آدمی''
> کے مضامین سے چل کر ''جدیدیت'' تک آئیے۔مغرب سے مشرق تک کا کتنا لمبا ذہنی سفر ہے جو

یہاں طے ہوا ہے اور جو اپنے ہر مرحلے میں اردو تنقید کو تخلیقی فکر سے مالا مال کرتا نظر آتا ہے''۔

''مجموعہ محمد حسن عسکری''میں شریک مجموعے اور ان کے مشمولات درج ذیل ہیں:

مجموعہ''انسان اور آدمی'':

مضامین: ہیئت یا نیرنگ نظر؟، انسان اور آدمی، فن برائے فن، مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی، ادب اور انقلاب، ہمارا ادبی شعور اور مسلمان، فسادات اور ہمارا ادب، منٹو فسادات پر، غلام عباس کے افسانے، میر اور نئی غزل (نمبر۱)، میر اور نئی غزل (۲)، حالی کی مناجاتِ بیوہ، اردو شاعری میں فراق کی آواز، اسلامی فن تعمیر کی روح۔

(اس مجموعہ کا پیش لفظ حسن عسکری نے لکھا ہے)

مجموعہ:''ستارہ یا بادبان'':

مضامین: پہلا حصہ۔''ادبی مسائل'': ستارہ یا بادبان، استعارے کا خوف، ادب یا علاج الغرباء، فنی تخلیق اور درد، ادب اور جذبات، داخلیت پسندی، نفسیات اور تنقید، تنقید کا فریضہ، پیروئی مغربی کا انجام، قحط افعال۔ دوسرا حصہ۔''موجودہ اردو ادب'': محاورہ کا مسئلہ، کچھ اردو نثر کے بارے میں، گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، اسالیب نثر اور ہمارے ادیب، اردو میں طنز کے اسالیب، چھوٹی بحر، ہمارے ہاں ڈراما کیوں نہیں؟ تیسرا حصہ۔''مطالعے'': بھلا مانس غزل گو، مزے دار اشیاء، کچھ فراق صاحب کے بارے میں، محسن کا کوروی، منٹو۔ چوتھا حصہ۔''بیسوی صدی'': آدمی اور انسان، رومال کی زنجیر، حکایات نے، پانچواں حصہ۔''مصوری'': شاکر علی، روواؤ۔

مجموعہ:''وقت کی راگنی'':

مضامین: مشرق اور مغرب کی آویزش (اردو ادب میں)، ادب میں صفات کا استعمال، ایک تجرید سے دوسری تجرید تک، مغربی ادب کی آخری منزل، ابن عربی اور کیر کے گور، جدید عورت کی پرنانی، بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے، روایت کیا ہے؟ اردو ادب کی روایت کیا ہے؟، اردو ادب کی روایت: چند تصریحات، مغرب میں مسلمانوں کے تبلیغی وفود، وقت کی راگنی، اکبر الہ آبادی، میر جی، احمد علی کا ایک ناول، ایسی بلندی ایسی پستی۔

مجموعہ:''جھلکیاں'':

مضامین: جھلکیاں؟، ادب و فن میں فحش کا مسئلہ، جدید انگریزی شعرا، جدید شاعری (نمبر۱)، کچے پکے افسانے، ادب میں اخلاقی مطابقت (۱)، ادب میں اخلاقی مطابقت (۲)، غیر زبان کی تعلیم، انگریزی زبان نصاب تعلیم، ناول اور افسانہ، فراق صاحب کی تنقید، اشرف صبوحی اور ان کی نثر، ادب اور نئی دنیا، موجودہ انگریزی ادب، اکبر الہ آبادی (۱)، اکبر الہ آبادی (۲)، تحسین ناشناس، جزئیات نگاری، مصروفیت، جنگ عظیم دوم کے بعد برطانوی ادب، ادب اور حقیقت، دو تبصرے، فراق صاحب، جیمز جوئس، جوئیس کا طرزِ تحریر،

ہمارے ہاں مزاح کیوں نہیں، پاکستان، فرانس کے ادبی حلقوں کی دو بحثیں، فراق صاحب کی دو نظمیں، نیا افسانہ اور سماجی ذمہ داری، مصروفیت، ہندوستانی ادب کی پرکھ، بودیلیئر، ذہنی فرار، آنسوؤں سے زیادہ حسین، یورپ کے چند ذہنی رجحانات، ایک نئی جماعت، ژید کے روزنامے کا ایک ورق، مسلمان ادیب اور مسلمان قوم، پاکستانی حکومت اور ادیب، تقسیمِ ہند کے بعد، پاکستانی ادیب، قائداعظم کے بعد، جواب آں غزل۔

مجموعہ: ''جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ'':

مضامین: نئی اور پرانی گمراہیاں، یورپ کے ذہنی انحطاط کی تاریخ، یونانی دور، رومی دور، ازمنہ وسطی: عیسوی دور، نشاۃ ثانیہ: جدیدیت کا آغاز، عقلیت پرستی کا دور، انقلابِ فرانس، انیسویں صدی، بیسویں صدی، بیسویں صدی کی سائنس، نئے سائنس کے بنیادی نظریات کی فہرست، بیسویں صدی میں عیسوی کلیسیا، ان مغربی تصورات کی فہرست جن سے دین کے بارے میں غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں (موخرالذکر طویل ترین مضمون الگ سے ایک کتاب یا کتابچہ ہے؛ ڈاکٹر محمد اجمل نے زیرِنظر مجموعے کے پیش لفظ میں اسی حصے (یا کتاب) کو احتیاط سے پڑھنے پر زور دیا ہے۔ (ص ۸۔۱۱۷، تاریخ تحریر: ۳۱ مارچ ۱۹۷۹ء)

حمید اللہ، صاحبزادہ، ''فن اور تکنیک''، صفحات: ۲۳۰، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

اس کتاب میں ادبی اور تنقیدی مباحث، اردو کی نثری اور شعری اصناف کا فکری و فنی تجزیہ، اردو افسانے، ڈرامے اور ناول پر خصوصی بحث، اور ترقی پسند تحریک پر اظہارِ خیال موجود ہے۔ مولف نے اپنے دیباچے ''سخنِ اول'' میں بتایا:

> ''اس کتاب میں شامل تکنیکی مواد ایم اے اردو کی تیاری کے سلسلے میں ترتیب دیا گیا تھا پھر بعد میں اس میں فکر و فن کی رنگ آمیزی بھی کی گئی تاکہ اعلیٰ سطح پر ادب کا مطالعہ کرنے والوں کا وقت، دولت اور توانائی بچائی جا سکے''۔ (ص ۹)

حنیف شاہد، محمد، ''مفکرِ پاکستان''، صفحات: ۷۲۰، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۸۲ء

اس ضخیم کتاب میں علامہ اقبال کی سوانح کو تفصیل اور اسناد کے ساتھ پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

کتاب میں اقبال کے خاندان، تعلیم و تربیت، قیامِ یورپ، تعلیمی، قومی، سیاسی، تحریکی اور شعری خدمات، ازدواجی، سماجی اور مجلسی زندگی، تمام تصانیف اور دیگر مطبوعہ و غیر مطبوعہ ارشادات، فرمودات اور ملفوظات کو معتبر ذرائع اور عمدہ اسلوب میں سامنے لایا گیا ہے۔

اپنے پیش لفظ میں مصنف نے کہا ہے:

> ''یہ کتاب اس دعوے کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے کہ اب تک علامہ اقبال کی سوانح کے سلسلے میں جو کتابیں چھپی ہیں، ان میں واقعات و حالات کے اعتبار سے مستند ترین اور بالکل صحیح

ماخذوں کو پہلی بار اپنے جلو میں لے کر نمودار ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال کی زندگی کے وہ گوشے جو ابھی تک ماہ و سال کی گردشوں کے باعث پردہ اخفا میں تھے، ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے''۔ (ص ۱۴، ۱۵)

خاطر غزنوی، ''جدید اردو ادب''، صفحات: ۲۰۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

اردو نثر و نظم کی مختلف اصناف پر مختصر مضامین کے اس مجموعے کے ابتدائیہ میں خاطر غزنوی لکھتے ہیں:

''میرے نقاد دوست اس مجموعے کو میری طالب علمانہ کوشش سمجھیں اور اس بات کا لحاظ رکھیں کہ اس مجموعے کی تحریریں اردو ادب کی جدید اصناف کا محض ایک تعارف ہیں اور بس''۔ (ص ۷)

خاطر غزنوی نے اس مجموعے میں جدید ناول، ریڈیو، ڈراما، انشائیہ، رپورتاژ، افسانہ، تنقید، جدید نظم، نظم معرا، آزاد نظم، اوپیرا، کینٹو، ترتیل، سی حرفی، گیت، دوہے، لمرک اور رزمیہ شاعری کا مختصر تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔

خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، ''اکبر الہ آبادی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، صفحات: ۴۸۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

''اکبر الہ آبادی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی کتابی صورت ہے۔ اپنے پیش لفظ میں خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''اکبر جس قدر اہم اپنے دور میں تھا اتنا ہی اہم آج بھی ہے کیونکہ ہمارے قومی امراض اب تک وہی ہیں۔ مگر اکبر کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔ وہ اپنے دور کی تاریخ ہے..... میں نے اکبر کے پس منظر کے بعد ان کے نظریات کی تمام اہم کڑیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے میرا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اکبر کو صحیح تناظر میں رکھ کر سمجھا سمجھایا جائے''۔ (ص ۵، ۶)

زیر نظر کتاب میں اکبر الہ آبادی کی سوانح، سیاسی اور سماجی پس منظر، افکار، شعری اسالیب اور نثر نگاری کو تحقیقی سلیقے اور تنقیدی دیانت سے موضوع بنایا گیا ہے۔ ضمیموں میں اکبر کے عدالتی فیصلے، غیر مطبوعہ اردو اور انگریزی نثر اور غیر مدون کلام کے نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی قاری اور محقق کی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ ''اکبر الہ آبادی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' اپنے موضوع کے حوالے سے تا حال پاک و ہند میں سب سے زیادہ لائق اعتبار اور قابل ذکر کتاب ہے۔

یہ کتاب پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحات ۴۸۴ تھے۔ سنگ میل نے زیر نظر کتاب کا نیا ایڈیشن مشینی کتابت (کمپیوٹر کمپوزنگ) کے ساتھ ۲۰۰۳ء میں شائع کیا؛ نئے ایڈیشن کے صفحات ۳۹۱ ہیں۔

راحت سہیل، ''اردو اداریہ کا ارتقا''، صفحات:۳۰۸، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

بیگم راحت سہیل نے اردو اداریہ کے حوالے سے ایم اے صحافت کے دوران میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور بعدازاں اس میں ترامیم و اضافہ کر کے اسے کتابی صورت دے دی۔ ان کے استاد ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے کتاب کے دیباچے میں بتایا:

''اردو اداریہ کا ارتقا'' کے مطالعہ سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو اداریہ ہیئت، پیرایہ اظہار، زبان و اسلوب کے کن مراحل سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچا ہے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں اس کی معنوی صورت کیا رہی؟'' (ص ۹)

اس کتاب میں اردو صحافت کے آغاز سے لے کر تقریباً ستر کی دہائی کے آغاز تک: اخبارات کے اداریوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی، ''سرور اور فسانہ عجائب''، صفحات:۱۶۸، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

کتاب کے دیباچے پر ۱۹۷۱ء کی تاریخ لکھی ہے مگر ''پس نوشت'' میں رفیع الدین ہاشمی نے ۱۹۷۵ء میں پہلا ایڈیشن شائع ہونے کی اطلاع دی ہے۔ ''فسانہ عجائب'' پر عام تنقیدی رائے کے برعکس لکھی یہ کتاب بھی طلبا اور عام قارئین میں مقبول ہے۔ پروفیسر سہیل بخاری نے پیش لفظ میں لکھا ہے: ''بعض مقامات پر مصنف سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے خلوص اور محنت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کتاب میں سرور اور فسانہ عجائب کے تقریباً تمام ممکن پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے''۔ (ص ۱۴)

اردو کی تنقیدی دنیا میں ''فسانہ عجائب'' کو مشکل اور مصنوعی نثر قرار دے کر رد کرنے کے رویے میں، رفیع الدین ہاشمی کی زیرِ نظر کتاب سے کمی آئی ہے اور سنجیدہ ناقدین اور قارئین اس کلاسیکی کارنامے کی جانب از سرِ نو متوجہ ہوئے ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''اصنافِ ادب''، صفحات:۱۹۹، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''کتاب کے دیباچہ اول (جو ۱۹۷۵ء کا لکھا ہوا ہے) میں مصنف نے کہا ہے: ''بنیادی طور پر یہ کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے اس کے اسلوب، لب و لہجے اور مثالوں وغیرہ میں طلبہ کے مزاج اور ان کی ذہنی سطح کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے (ص ۶)'۔ دیباچہ طبع دوم، (مرقومہ ۱۹۷۹ء) میں متعدد ترامیم اور اضافوں کے علاوہ ''اقبالیات'' کے عنوان سے ایک نیا باب شامل ہونے کی اطلاع ہے۔ اس کتاب کو طلبہ اور عام قارئین میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن چھپے اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔

کتاب میں رفیع الدین ہاشمی نے بہت آسان اور دلآویز پیرائے میں فنِ شاعری کی اصطلاحات: وزن، بحر، تقطیع، قافیہ، ردیف، مطلع، مقطع، نظم کی اصناف: حمد، نعت، غزل، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب وغیرہ کو بہ لحاظ موضوع مثنوی، رباعی، قطعہ، مسمط وغیرہ کو بہ لحاظ ہیئت

اور نظم جدید میں پابند، معری، آزاد نظم اور سانیٹ وغیرہ اور اصناف نثر: داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، مضمون، مقالہ، انشائیہ، سوانح، آپ بیتی، خاکہ، طنز و مزاح، سفر نامہ وغیرہ کو پیش کیا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''اقبال کی طویل نظمیں''، صفحات:۲۵۴، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۱ء

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں سنگ میل کے ہی زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ اس میں رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی دس طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ، طلوع اسلام، ذوق وشوق، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ شامل ہیں۔

خواجہ محمد زکریا کتاب کے پیش لفظ میں رفیع الدین ہاشمی کی دقت نظری اور راست فکری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے ہر نظم کا پس منظر، پیش منظر اور فنی تجزیہ بڑی وضاحت اور جامعیت سے تحریر کیا ہے، اس طرح ایک ایسی کتاب وجود میں آئی ہے جو اقبالیات کے طلبہ کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے...... ہاشمی صاحب خوش قسمتی سے ایک باذوق اور محنتی محقق ہونے کے علاوہ ایک راست فکر نقاد بھی ہیں اس لیے انہوں نے ان نظموں کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے''۔(ص۸)

ریاض احمد، ''ریاضتیں''، صفحات:۳۰۳، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

ریاضتیں، ریاض احمد کی تنقیدی ریاضت کا ثمر ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کتاب کے فلیپ میں لکھا:

''عرصے کے بعد ریاض احمد کے تنقیدی مضامین کی اشاعت تنقید کے لیے نیک فال ہے...... وہ ان نفسیاتی ناقدین میں شامل نہیں جو چند اصطلاحات کو لے اُڑتے ہیں اور انہیں کی بنیاد پر تنقید کی سر بہ فلک عمارت بنا ڈالتے ہیں...... ان کے ہاں بصیرت افروزی اور بصیرت آموزی موجود ہے''۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے پیش لفظ میں کہا: ''ریاضتیں'' کی اشاعت سے ان کی تنقیدی کاوشوں کی تفہیم میں بھی آسانی ہوگی اور ایک خاص دور کے ادبی مباحث بھی دوبارہ ہمارے سامنے آئیں گے''۔(ص۱۱)

اس کتاب میں جدید نظم کا ارتقاء، اردو شاعری کی بعض خصوصیات، جدید شعراء کا پیش از وقت انحطاط، جدید شاعری اور روایات، اردو شاعری میں جنسیات، تنقید۔ سرسید کے دور میں، جدید اردو تنقید کا پس منظر، جدید اردو تنقید اور ترقی پسند تحریک، اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان، اقدار کا مسئلہ، وجودیت، کردار کی تخلیق، وقت کیا ہے؟ کے عنوان سے کل چودہ مضامین شامل ہیں اور ان کا تنقیدی اعتبار تا حال قائم ہے۔

زہرا معین، ''باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ''، صفحات: ۲۵۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

زہرا معین کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب ۱۹۷۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور موجودہ ایڈیشن دس سال کے بعد ضروری ترامیم اور نظرِ ثانی کے بعد سامنے لایا گیا۔ (ص ۹) کتاب کا پیش لفظ سید وقار عظیم نے لکھا ہے اور فلیپ پر محمد طاہر فاروقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مرزا ادیب اور ڈاکٹر انور سدید کی آرا ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ میر امن پر اب تک جو کام ہو چکا ہے، زہرا معین نے اس سب کو نظر میں رکھا ہے اور اس پر بیشتر عمدہ محاکمہ کر کے اپنی الگ رائے قائم کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ میر امن کے مطالعے کے کچھ نئے گوشے سامنے لاتی ہے۔ افسانے کی اہمیت کے اس دور میں یہ کتاب اہلِ ادب پر ''باغ و بہار'' کی نئی اہمیت بخوبی واضح کرے گی''۔ (فلیپ)

کتاب میں ''کردار نگاری کے فن'' اور ''باغ و بہار'' تک کردار نگاری کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر باغ و بہار کے مرد کردار اور نسوانی کرداروں کو الگ الگ موضوع بنا کر تنقیدی نتائج پیش کیے گئے ہیں۔

ساقی فاروقی، ''ہدایت نامہ شاعر''، صفحات: ۲۴۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

زیرِ نظر کتاب میں ساقی فاروقی کے وہ مضامین شامل ہیں جو انہوں نے خط کے انداز میں لکھے اور مختلف ہم عصر شعرا کی غزلوں اور نظموں میں اپنے فکری و شخصی نقطہ نظر اور شعری معیارات کے مطابق غلطیوں کی نشاندہی کی۔ کتاب سخت متنازع ثابت ہوئی۔ انتظار حسین کی یہ رائے کتاب کے آغاز میں موجود ہے: ''اگر علامہ اقبال بھی ساقی کے زمانے میں ہوتے تو یہ عزیز انہیں بھی اپنے قیمتی مشورے ضرور دیتا''۔ (ص ۵)

کتاب میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۴ء تک کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں اور ان میں وزیر آغا، مجاز، مخدوم، اطہر نفیس، سردار جعفری، فیض، میراجی، راشد، احمد ندیم قاسمی، سلیم احمد، شمس الرحمٰن فاروقی اور زہرا نگاہ کی شاعری پر کہیں دوستانہ اور کہیں جارحانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جارحانہ انداز: فکر و اسلوب دونوں پر حاوی ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''ادب اور کلچر''، صفحات: ۳۴۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''ادب اور کلچر'' کی پہلی اشاعت مکتبہ عالیہ، لاہور کے زیرِ اہتمام عمل میں آئی تھی (صفحات: ۲۲۴ تھے اور سن اشاعت درج نہیں تھا) متنوع تنقیدی مضامین پر مشتمل زیرِ نظر مجموعہ درج ذیل پانچ حصوں میں منقسم ہے:

ادب، شخصیات، تخلیقی رویئے، مباحث، کلچر۔

ادب کے حصے میں شامل مضامین: مسدس حالی (عوامل، مقاصد، نتائج)، اردو میں نوکلاسیکی تنقید کا احیاء، انارکلی ایک جائزہ، بچے، ادب اور بڑے، قومی ادب، جنگ اور ادب۔ شخصیات کے حصے میں: اکبرالہ آبادی، امیر مینائی، ن۔م۔راشد، فیض، شاد عارفی، ابن انشاء، سلیم احمد کے علاوہ حیات جاوید کا تنقیدی مطالعہ بھی شامل ہے۔ ''تخلیقی رویئے'' کے ذیل میں: غزل، سفرنامہ، نثری نظم اور ناول کے ساتھ موضوع اور تخلیقی رویئے کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ مباحث کے حصے میں: ترقی پسند کیا نہیں ہے؟، جدیدیت، ایک مطالعہ، لفظ کا سومنات، عصری تقاضے اور ادیب، گمشدہ استعارہ۔ کلچر کے ذیل میں: پاکستانی کلچر کا مسئلہ، کلچر کی لہریں، قوم، زبان اور کلچر، ڈگڈگی اور چنگیر کے عنوان سے مضامین شامل ہیں۔

اس مجموعے کے مکتبہ عالیہ کے شائع کردہ ایڈیشن میں درج ذیل مضامین شامل نہیں تھے:

کچھ امیر مینائی کے بارے میں، ن۔م راشد کا متروک کلام، تلخ پرچھائیاں، سلیم احمد: شخص اور نقاد، گمشدہ استعارہ۔

زیرنظر مجموعے میں مضامین کے تنوع کے باوجود تخلیقی رویوں اور ثقافتی لہروں کو اس طرح موضوع بنایا گیا ہے کہ مجموعے میں یک موضوعی کتاب کے ذائقے کا بھی احساس ہوتا ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، صفحات: ۳۷۱، زیرنظر ایڈیشن ۱۹۹۳ء (نظر ثانی شدہ)

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ایک نمایاں، معروف اور مقبول عام کتاب ہے۔ ''بیسٹ سیلر'' ہونے کے حوالے سے اردو میں تاریخ و تنقید کی کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ زیرنظر ایڈیشن کے شروع میں ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک مختصر شذرہ (۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کی تاریخ کے ساتھ) موجود ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۷۱ء میں ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کی اولین اشاعت سے لے کر ۱۹۹۳ء میں پندرھویں ایڈیشن تک یہ تاریخ سفر حیات میں شریک رہی...... اگرچہ مکمل نظر ثانی کے بعد کتاب ازسرنو تحریر کی خواہش کئی برس سے دل میں ہے اور اس ضمن میں خاصا کام بھی کرچکا ہوں مگر میری توقع کے برعکس کام پھیلتا ہی گیا۔ یوں نظر ثانی ایڈیشن کے برعکس یہ ایڈیشن ۱۹۹۲ء تک کی تخلیق شماری کے اضافے سے سال اشاعت تک مکمل ہوگیا ہے'' (ص ۴)

اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑی مہارت سے اردو ادب کی پھیلی ہوئی تاریخ کو تین سو اکہتر صفحات میں سمیٹا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا سبب، اختصار کے ساتھ ساتھ سلیم اختر کا ہلکا پھلکا اور شگفتہ اسلوب بھی ہے۔ چند مقامات پر پیرایہ اظہار شگفتہ کے بجائے طنز آمیز ہوگیا ہے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، میں سلیم اختر کی بعض آراء سخت نزاعی ثابت ہوئیں۔ اس کتاب کے مختلف ایڈیشنوں میں ہونے

والے ترمیم و اضافے پر بھی تحفظات کا اظہار کیا گیا۔ کچھ اصناف اور کچھ تخلیق کاروں کے بارے میں مختلف ایڈیشنوں میں ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم تجزیے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ مثلاً پانچویں اور چھٹے ایڈیشن میں صنفِ انشائیہ کے بارے میں آراء متضاد (بلکہ بر سرِ پیکار) ہیں۔

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، مجموعی طور پر اردو ادب کے طلبہ کی ابتدائی ضرورت پورا کرتی ہے، اس لیے اس کی نصابی اہمیت، پاکستان و ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ جہاں جہاں اردو ادب کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے، وہاں تا حال قائم ہے۔

۲۰۰۵ء میں ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا ستائیسواں ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے؛ اس ایڈیشن کے صفحات ۱۷ ۷ ہیں اور اس میں ایک مبسوط اشاریہ بھی موجود ہے۔ ستائیسواں ایڈیشن کے پیش لفظ میں ناشر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''آخر میں محبت بھرا شکریہ برادرم نیاز احمد کا...... جن کی ایمانداری کے باعث کتاب کے اتنے ایڈیشن چھپنے کا ریکارڈ بن سکا۔ یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس لاہور میں ایسے ناشر بھی ہیں جن کے پاس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی ۹۹۹ کا پیاں ہمیشہ موجود رہتی ہیں مگر نیاز احمد صاحب نے اپنے کاروبار کی بنیاد نیک نیتی، اصول پسندی اور دیانتداری پر استوار کی ہے اور اس لیے وہ اس وقت متعدد مصنفین کے لیے شجر سایہ دار کی صورت اختیار کر چکے ہیں''۔

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہونے والی ڈاکٹر سلیم اختر کی پہلی کتاب ہے، اس پس منظر کو انہوں نے اپنی آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' میں یوں روشن کیا ہے:

> ''لاہور آتے ہی میرا نیاز احمد سے تعارف ہو گیا۔ ان دنوں لوہاری کے باہر ان کی چھوٹی سی دکان تھی، لیکن دل بڑا تھا۔ وہ ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کی قسطیں ''ماہنامہ کتاب'' میں پڑھ چکے تھے۔ پہلی ملاقات ہی میں انہوں نے اسے شائع کرنے کی بات کی۔ میں نے کہا رسالے میں چھپی قسطیں تو بہت ہی مختصر ہیں کتاب کے نقطہ نظر سے میں دوبارہ لکھ دیتا ہوں۔ یوں ستمبر ۱۹۷۱ء میں مختصر ترین تاریخ کا پہلا ایڈیشن (سائز: 16=20x30 صفحات: 256) طبع ہوا....'' (سلیم اختر، ڈاکٹر، ''نشان جگر سوختہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۵)

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو کیا ہے''، صفحات: ۴۰۰، زیر نظر ایڈیشن ۱۹۹۹ء

زیر نظر کتاب اردو کا بحیثیت ''زبان'' مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس میں آوازوں، لفظوں، زبانوں کی ماہیت، اردو زبان کی تاریخ و ارتقا، اس کے بدلتے نام، رسم الخط، قواعد اور وضع اصطلات وغیرہ کے مسائل کے علاوہ اصلاح زبان، لغت نویسی، تراجم اور اردو لسانیات

کے دیگر مباحث پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات یہ ہیں: زبان کیا ہے؟ اردو زبان کے نام، اردو زبان کا آغاز، اصلاح زبان کی تحریکیں، اردو رسم الخط، اردو میں لغت نویسی، اردو میں قواعد نگاری، اردو میں تراجم اور وضع اصطلاحات، اردو لسانیات نگاہ باز گشت اور مستقبل۔ یہ کتاب اردو ادب اور لسانیات کے طلبہ کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا سامان اور معلومات کا ذخیرہ رکھتی ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''افسانہ اور افسانہ نگار۔ تنقیدی مطالعہ''، صفحات: ۲۴۰، زیر نظر ایڈیشن ۱۹۹۱ء

اس کتاب کے پہلے حصے کے طور پر جو کتاب شائع ہوئی وہ ''داستان اور ناول۔ تنقیدی مطالعہ'' تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر صنف افسانہ سے تخلیقی اور تنقیدی دونوں حوالوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے ''افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ'' کے نام سے نہ صرف ایک مقالہ شامل کیا ہے بلکہ کتاب میں موجود افسانہ نگاروں کی افسانوی تکنیک کو نفسیات کے حوالے سے اجاگر بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں منٹو، غلام عباس، خدیجہ مستور، آغا سہیل، مسعود اشعر، عرش صدیقی اور مرزا حامد بیگ کے افسانوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی اور ایرانی افسانے پر اظہار خیال کے ساتھ ساتھ ''اردو کا پہلا جنسی افسانہ'' بھی زیر بحث آیا ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''تین بڑے نفسیات دان''، صفحات: ۲۴۲، زیر نظر ایڈیشن ۱۹۹۴ء

فرائڈ، ژنگ اور ایڈلر عہد ساز نفسیات دان تھے، سلیم اختر نے ان تینوں کے ''حالات زندگی اور بنیادی تصورات کا مطالعہ'' پیش کیا ہے۔ فرائڈ کے حوالے سے شعور اور لاشعور کی کشمکش، جنس کی اہمیت، نظریہ خواب اور تحلیل نفسی پر عمدہ صراحت موجود ہے، اس کے علاوہ فرائڈ کے تصورات کی مدد سے ہی فرائڈ کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو بذاتِ خود ایک دلچسپ اور معلومات افزا باب ہے۔ ''کارل گستاو ژنگ،، کے زاویے سے نظریہ شعور، خواب، نفس اور ''الفریڈ ایڈلر'' کے حوالے سے شخصیت کی تشکیل اور نظریہ جنسی کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ نفسیات کے مغربی زاویوں کو عام قارئین کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی حلقوں تک پہنچانے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اقبال اور ہمارے فکری رویے''، صفحات: ۲۲۴، سن ندارد

علامہ اقبال کے حوالے سے اس کتاب کو ڈاکٹر سلیم اختر نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ پہلا حصہ مفکر عالم، دوسرا ممدوح عالم ہے۔

پہلے حصے میں چھ مضامین ہیں، پہلا مضمون: ''علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں'' ہے؛ جس میں فراق گورکھپوری کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اٹھائے تھے۔ اس حصے کے دیگر مضامین یہ ہیں:

اقبال کا لسانی شعور، جزو کل اور اقبال، اقبال اور ہمارے فکری رویے، اقبال کے اساتذہ، علامہ اقبال اور نیرنگ اقبال۔

دوسرے حصے ممدوح عالم میں بقول سلیم اختر: فکر اقبال کی تحسین کا بین الاقوامی تناظر'' اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے دیباچے (مرقومہ: ۱۹۸۲ء) میں سلیم اختر لکھتے ہیں:

''علامہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اتنے وقیع تھے کہ مواد کے لحاظ سے
محض قومی ثابت ہونے کے برعکس بین الاقوامی اہمیت کے حامل ثابت ہو رہے ہیں''۔ (ص ۱۰)

دوسرے حصے (ممدوح عالم) کے مقالات کے عنوانات درج ذیل ہیں:

عظمت اقبال کا معترف: ہربرٹ ریڈ، اقبال ممدوح عالم، ایران میں اقبال شناسی کی روایت، ایک فرانسیسی اقبال شناس (لوس کلوڑ،) اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت۔ آخر میں اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے حوالے سے ایک کتابیات بھی موجود ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۸۲ء میں داؤد ادبی انعام ملا تھا۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، (مرتب) ''ایران میں اقبال شناسی کی روایت''، صفحات: ۲۴۰، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۸۳ء (طبع اوّل)

ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتب کردہ یہ کتاب ایران میں اقبال شناسی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کاوش ہے۔ اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ایران اور پاکستان کے ثقافتی اور ادبی رشتوں اور اقبال سے اہل ایران کے والہانہ شغف کا ذکر کیا ہے۔ نیز زیرِ نظر کتاب کے اندراجات کے حوالے سے بتایا ہے:

> ''ہمارے جرائد میں ایرانی اقبال شناسوں کی کاوشوں کے بارے میں جائزے اور ایرانی فضلا کے مقالات کے تراجم چھپتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کڑے انتخاب کے بعد چند مقالات پر مشتمل مجموعہ، اس توقع پر پیش کیا جا رہا ہے کہ ایران میں علامہ اقبال پر کیے گئے کام کی رفتار، معیار اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے، برادر ملک ایران میں ہمارے قومی شاعر سے کتنی محبت کی جاتی ہے، اس کا اندازہ کرانے کے لیے ایران کے نامور شعراء کی وہ نظمیں بھی پیش ہیں جن میں اقبال ممدوح ہیں۔ کتاب کے اختتام پر ایران میں علامہ اقبال پر کیے گئے کام کا جائزہ ایک کتابیات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے''۔ (ص ۸)

کتاب میں ایرانی اہل قلم کے تراجم کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادیبوں کے مقالات بھی موجود ہیں جن میں ایران میں اقبال شناسی اور اقبال دوستی پر مفصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''انشائیہ کی بنیاد''، صفحات: ۳۸۲، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۸۶ء

اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے صنف انشائیہ کو موضوع بنایا ہے اور مغرب کے ''ایسے'' کے آغاز و ارتقاء، نیز اردو ایسے کی تاریخ اور انشائیے کے خدوخال کو اپنے نقطۂ نظر سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں ضمیمے کے طور پر انشائیے کے بارے میں چند اہل علم و ادب کی آراء بھی دی گئی ہے۔ کتاب سخت متنازع ثابت ہوئی اور تا حال اس کے حق اور مخالفت میں تحریری اور زبانی مباحث کا سلسلہ جاری ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال (سالانہ ادبی جائزے ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء)**''، صفحات:۲۱۶، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۸۸ء**

کتاب کے مقدمے میں (جس پر ۱۱ مارچ ۱۹۸۸ء کی تاریخ رقم ہے) سلیم اختر لکھتے ہیں:

''پاکستان کے تخلیقی منطقہ کا یہ گیارہ سالہ جائزہ کئی امور میں نامکمل ثابت ہو سکتا ہے لیکن اتنا ہے کہ محض اپنا نام تلاش کرنے کے بجائے ابتداء سے مطالعہ کیا جائے تو بعض ادبی میلانات اور تخلیقی رجحانات کی تبدیلی کے سراغ مل سکتے ہیں، اہم تخلیقات کی نشاندہی ہو سکتی ہے''۔ (ص ۲۰)

ڈاکٹر سلیم اختر کے سالانہ ادبی جائزے مختلف جگہوں پر شائع ہوتے رہے، انہیں کچھ ادبی حلقوں سے بے پناہ تحسین ملی اور کچھ حلقوں کی جانب سے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا، کتابی صورت میں یکجا ہونے اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان جائزوں کی متنازع حیثیت اور کیفیت قائم ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''پردہ غفلت اور اس کا تنقیدی جائزہ''، صفحات:۹۷، زیرِ نظر ایڈیشن ۲۰۰۱ء

''پردہ غفلت'' ڈاکٹر سید عابد حسین کا ڈراما ہے؛ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے تنقیدی تجزیے کے ساتھ اسے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''سید عابد حسین کا ڈرامہ ''پردہ غفلت'' مقصدی ڈرامہ ہے یعنی تعلیم نسواں اور عورتوں کے حقوق جیسے اہم معاشرتی مسائل کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ ساتھ ہی مسلم جاگیرداروں اور زمینداروں کی جہالت اور اسراف پر بھی روشنی ڈالتا ہے''۔ (ص ۹)

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''تخلیق اور لاشعوری محرکات''، صفحات:۲۳۶، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۸۳ء

کتاب، تخلیقی عمل، تخلیقات اور تخلیقی شخصیات کے نفسیاتی تجزیوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کا پیش لفظ سلیم اختر اور فلیپ سلیم احمد نے لکھا ہے۔ کتاب تین حصوں پر منقسم ہے: جڑ، شجر، ثمر۔ ''جڑ'' کے حصے میں: تخلیق میں لاشعوری محرکات، جنون، تخلیقی عمل اور وجدان کی کارفرمائی، نیز تخلیقی شخصیت میں نرگسیت اور ارتقاع کے عمل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''شجر'' کے حصے میں: مطالعہ ادب میں تحلیل نفسی کا کردار اور نفسیات کی روشنی میں علامت، تعلیٰ، بچہ اور کتاب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''ثمر'' کے حصے میں: میر کی شاعری، مثنوی زہر عشق، حسرت کی غزل، مجید امجد کی نظمیں اور کشور ناہید کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی زیرِ نظر کتاب نئے اور پرانے موضوعات کو تازہ فکر و اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کی ایک اہم کوشش ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''تنقیدی دبستان''، صفحات:۲۵۱، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۹۷ء (نظر ثانی اور اضافہ شدہ)

''تنقیدی دبستان'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن سامنے آ چکے ہیں۔ زیرِ نظر نسخہ نظر ثانی اور اضافہ شدہ ہے۔ یہ کتاب تنقید کے مختلف دبستانوں کے تعارف، تجزیے اور محاکے پر مشتمل ہے۔ مصنف نے دبستانوں کو موضوع بنانے سے پہلے تنقید کی حدود اور امکانات، اقسام اور اسالیب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ خود ڈاکٹر سلیم اختر اور دیباچہ پروفیسر حمید احمد خان نے لکھا ہے، پیش لفظ پر تاریخ ۱۱/اپریل ۱۹۹۶ء اور دیباچے پر ۳۰ نومبر ۱۹۷۳ء درج ہے۔ ''تنقیدی دبستان'' پاک و ہند میں (تا حال) اردو کی تنقیدی نصابات کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ کتاب کے ابواب یہ ہیں: تنقید: حدود اور امکانات، تنقید: اقسام اور اسالیب، تنقیدی دبستان، تشریحی تنقید، سائنٹیفک تنقید، تقابلی تنقید، رومانی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، تاریخی تنقید، عمرانی تنقید، نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، ہیئتی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید، امریکہ میں تنقیدی دبستان۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''داستان اور ناول۔ تنقیدی مطالعہ''، صفحات: ۱۶۳، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس تنقیدی مجموعے میں سب سے پہلے فکشن کی تنقید کے مسائل اور مشکلات کا جائزہ لیا اور اردو فکشن کی تنقید کے باب میں ہونے والے مختصر کام کی کتابیات مرتب کر کے اس تاسف کا اظہار کیا: ''۴۲ برس میں چھپنے والی سینکڑوں کتابوں کے مقابلے میں فکشن کے نام پر لکھی گئی کتابوں کی یہ قلیل تعداد کسی لحاظ سے بھی حوصلہ افزا نہیں''۔ (ص ۱۳) اس مجموعے میں شامل مضامین یہ ہیں:

فکشن کی تنقید، مسائل اور مشکلات۔ زیوس سے امیر حمزہ تک۔ باغ و بہار، تحقیق و تنقید، باغ و بہار کے درویش عاشق۔ کچھ نذیر احمد کے بارے میں۔ مرزا سودا کا نظریہ ناول نگاری۔ ناول: پس منظر اور پیش منظر۔ ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ۔ بے جڑ لوگوں کی بستی (انتظار حسین کے ناول بستی پر) جمیلہ ہاشمی رومان سے تصوف تک۔ زمین (خدیجہ مستور کا ناول)

اس کتاب کا دوسرا حصہ ''افسانہ اور افسانہ نگار۔ تنقیدی مطالعہ'' ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید''، صفحات: ۱۰۰۷، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۸۹ء

یہ ضخیم مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر کی چند کتابوں کے منتخب تنقیدی مقالات پر مبنی ہے۔ اس کے اڑتالیس مضامین کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱) ادب۔ ۲) تخلیق۔ ۳) صنف۔ ۴) افسانہ۔ ۵) تنقید۔ ۶) شخصیت۔ ۷) اقبال۔ ۸) غالب۔ ادب کے حصے میں شامل مضامین: ادب اور تخلیقی لاشعور، ادب نرگسیت کے آئینے میں، ادب اور فحاشی، ادب اور ابلاغ، ادب اور فنونِ لطیفہ ہیں۔ ''تخلیق'' کے حصے میں: تخلیق: تخلیق کار اور جنون، تخلیق: تخلیقی عمل اور وجدان، علامت کا جنم، دھرتی، برگد، آنچل موجود ہیں۔ صنف کے حصے میں: غزل: تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ، غزل اور رومانی طرزِ احساس، شاعری میں زنانہ پن کی مثال: مرثیہ اور کیتھارسس، افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ اور حصہ افسانہ میں:

زیوس سے امیر حمزہ تک، باغ و بہار کے درویش عاشق، اردو کا پہلا جنسی افسانہ، اردو افسانے میں عورت؛ افسانہ: حقیقت سے

علامت تک ہیں۔تنقید کے شعبے میں:عمرانی،رومانی،تاثراتی،جمالیاتی،مارکسی،نفسیاتی،ساختیاتی تنقید۔شخصیت کے حصے میں:مرزا رسوا کا نظریہ ناول نگاری،معتدل گرمی گفتار کا شاعر:فیض،شعر مرا ایران گیا(میر تقی میر کی شاعری کا جنسی مطالعہ)،جسم یار کی خوبی اور گناہ گار صالح۔اقبال کے حصے میں:اقبال کا نفسیاتی مطالعہ،اقبال کا تنقیدی شعور،اقبال کا لسانی شعور،تو شب آفریدی،چراغ آفریدم،حالی اور اقبال کے مقامات آہ وفغاں،غزل میں نئی جہت،اقبال،اقبال کی نثر کا مزاج،علم الاقتصاد(تجزیاتی مطالعہ)نقدِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ، اقبال اور ہمارے فکری رویے،اقبال:ممدوح عالم،عظمت اقبال کے معترف۔ہربرٹ ریڈ۔غالب کے حصے میں شامل مضامین:شعور اور لاشعور کا شاعر:غالب، غالب:خطوط کے آئینے میں،غالب کی نرگسیت،مرد عاشق کی مثال:غالب،غالب کی شاعری میں جنس،غالب: آتشِ زیرپا ہیں۔اسی مجموعے کی اشاعت سے ڈاکٹر سلیم اختر کے اہم،عمدہ اور قابل ذکر مقالے ایک جلد میں جمع ہو گئے ہیں۔

سلیم اختر،ڈاکٹر،(مرتب)''اقبال۔شاعرِ صد رنگ''،صفحات:۳۶۸،زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۷۸ء

اقبال شناسی کا آغاز اقبال کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا؛ ڈاکٹر سلیم اختر اقبال شناسی (اقبالیات) کو تین ادوار میں تقسیم کر کے، دورِ اوّل:ابتداء سے ۱۹۴۰ء تک کے عرصے کو قرار دیتے ہیں۔زیرِ نظر مجموعہ اقبال شناسی کے دور اول کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:''ان مقالات کے انتخاب کا صرف ایک جواز ہے کہ یہ دورِ اول کے فراموش کردہ مقالات ہیں۔آج شاید ان کی ادبی اہمیت نہ محسوس ہو،لیکن ان کی تاریخی اہمیت کو جھٹلانا ناممکن ہے''۔(ص۱۱)ان مقالات کو موضوعاتی آہنگ دینے کے لیے چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:شخصیت کی پہلوداری،فکر کے زاویے،شاعر بے مثال،شاعر اسلام،بچوں کا اقبال،فلسفیانہ مباحث۔

''شخصیت کی پہلوداری'' کے حوالے سے دیا نرائن نگم،پروفیسر عبدالحمید،مہاراجہ کشن پرشاد شاد،محمد جلال الدین اشک،محمد عمر نور الٰہی نے اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔اقبال کے ''فکر کے زاویے'' اسلوب احمد انصاری،بشیر احمد،مولانا سرور ہاشمی،رفعت، م۔م۔جوہر میرٹھی اور مرزا اصفدر بیگ نے اُبھارے ہیں۔تیسرے حصے ''شاعر بے مثال'' میں بشیر احمد،مخدوم محی الدین،لطیف النساء بیگم، شجاع الدین،اکرام قمر ہوشیار پوری،محمد احمد سبزواری،میر سراج الدین علی خان،میاں ارشد محمود،خواجہ حمید الدین شاہد،سید احمد جعفری،محمد اسماعیل مسلم،جہاں بانو اور ذکیہ احمد کے مضامین ہیں۔چوتھے حصے ''شاعر اسلام'' میں ایس ایم الٰہی،سید وحید اللہ وحید اور ظفر قریشی دہلوی اور پانچویں حصے ''بچوں کا اقبال'' میں ح۔انصاری اور عبدالسلام ذکی نے اپنے فکری نتائج پیش کیے ہیں۔آخری حصے ''فلسفیانہ مباحث'' میں م۔م جواہر میرٹھی،محمد عبدالقیوم خاں باقی،سید الطاف حسین اور میاں ارشد محمود کے مقالات ہیں۔

سلیم اختر،ڈاکٹر،(مترجم)''فکرِ اقبال کا تعارف''،صفحات:۱۱۰،سن اشاعت ندارد

''فکر اقبال کا تعارف'' فرانسیسی دانشور خاتون ''لوس کلوڈ میتخ'' کی کتاب کا ترجمہ ہے جو ۱۹۵۵ء میں پیرس سے شائع ہوئی تھی۔ مترجم نے اپنے پیش لفظ میں بتایا:

''اصل کتاب صرف ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے مگر اختصار کے باوجود مصنفہ نے فکر اقبال کے اہم ترین گوشے منور کیے ہیں اس کا انگریزی ترجمہ ملا عبدالمجید ڈار (مرحوم) نے کیا تھا۔ ۵۲ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ اقبال اکادمی پاکستان کراچی نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا اور اسی انگریزی ترجمہ کا یہ اردو روپ ہے''۔ (ص ۸)

کتاب کے ابواب یہ ہیں: اقبال۔ حیات و تصانیف، اقبال کا فلسفہ شخصیت، انسان کامل اور مثالی معاشرہ، اقبال کی مابعد الطبیعات اور فلسفہ مذہب، اقبال اور مشرقی فکر، اقبال اور مغربی فکر، اقبال بحیثیت شاعر، منتخب غزلیات (۱۲ اردو غزلیں) (اصل کتاب میں زیادہ تر منتخب فارسی غزلیں اور نظمیں ہیں۔)

کتاب اپنے مندرجات اور مصنفہ کے فکری نتائج کے حوالے سے خاصی اہم ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کا ایک اچھا اور رواں دواں اردو ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیش لفظ میں مصنفہ کی اقبال شناسی اور فلسفہ فہمی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، (مرتب) ''فکر اقبال کے منور گوشے'' صفحات: ۳۲۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۷۷ء

زیر نظر مجموعے میں اکیس اہل فکر و نظر نے علامہ اقبال کے افکار اور مختلف جہات کو دیکھنے، جانچنے اور نئے زاویے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت مرتب لکھتے ہیں:

''فکر اقبال کے منور گوشے'' کی ترتیب میں ان مقالات کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح سے فکر اقبال کے کسی نئے گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں...... ناقدین کے اسماء پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی اندازِ نظر میں تنوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فکر کے مختلف دبستانوں سے وابستہ حضرات کی ان تحریروں سے مطالعہ اقبال کا نیا پس منظر تشکیل پاتا ہے''۔ (دیباچہ: ص ۸)

مجموعہ چار حصوں میں تقسیم ہے: پہلے حصے ''فکر نو کی ضیاء'' میں شامل مقالات اور مصنفین یہ ہیں:

اقبال: ایک گفتگو۔ فیض احمد فیض، اقبال کے ساتھ انصاف کیجیے۔ احمد ندیم قاسمی، اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ۔ عزیز احمد، اقبال اور ہند اسلامی تہذیب۔ سلیم احمد، ترقی پسندی کی ایک جہت: اقبال۔ محمد علی صدیقی، اقبال وجودیوں کے درمیان۔ ضمیر علی بدایونی، اقبال کی مقصد پسندی۔ سلیم اختر۔

دوسرے حصے ''افکار کی حنابندی'' میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

اقبال۔۔ کرمکِ ناداں سے کرمکِ شب تاب تک۔ ڈاکٹر وزیر آغا، مرگِ مجازی اور علامہ اقبال۔ پروفیسر محمد منور، اقبال کا تصورِ مرگ۔ انور سدید، اقبال اور مسئلہ زمان و مکان۔ بشیر احمد ڈار، اقبال کا تصورِ مملکت۔ سحر انصاری۔

تیسرے حصے ''مطالعہ اقبال کی جہات'' میں شامل مقالات:

اقبال: خطوط کے آئینے میں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اقبال اور نذیر احمد کے فکری روابط۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، اکبر اور اقبال۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اقبال کی تلمیحات۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، اقبال کی شاعری۔ جگن ناتھ آزاد، اقبال اور مسجد قرطبہ۔ عمیق حنفی۔

چوتھے حصے ''اقبال: مفسر اسلام'' میں تین مقالے موجود ہیں۔ انسانی انا، اس کی بقا اور اختیار۔ پروفیسر محمد عثمان، بندگی نامہ: اقبال کا نئی نسلوں کے ساتھ تعارف۔ پروفیسر جیلانی کامران، اقبال کا مذہبی شعور، ڈاکٹر شوکت سبزواری۔

زیرِ نظر مجموعہ سالِ اقبال (۱۹۷۷ء) کی مناسبت سے شائع کیا گیا تھا۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''مغرب میں نفسیاتی تنقید''، صفحات: ۱۸۲، زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۹۸ء

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی تھی اور ان کا تحقیقی مقالہ مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا تھا؛ ضخامت میں کمی کی خاطر اصل مقالے سے کچھ حصے حذف کرنا پڑے تھے؛ ڈاکٹر سلیم اختر کے پیش لفظ کے مطابق:

> ''حذف شدہ اجزا جب مرتب کیے گئے تو یہ ایک ایسی کتاب کی صورت اختیار کر گئے جس میں مغرب میں نفسیاتی تنقید کے اساسی نقوش اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ بعض قدآور ناقدین کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے''۔ (ص ۸)

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں: فرائڈ اور ادب، تخلیق کی تحلیل نفسی اور مغرب کے نفسیاتی ناقدین کو موضوع بنایا گیا ہے؛ دوسرے حصے میں: ژونگ اور تحلیلی نفسیات اور تخستمثالی تنقید پر اظہارِ خیال ہے؛ تیسرے حصے میں علوم اور نفسیات اور گیسٹالٹ نفسیات اور تخلیق کے ابواب ہیں۔ آخر میں اصطلاحات کے تراجم کی فہرست دی گئی ہے۔

سمیع اللہ قریشی، ''افکارِ اقبال''، صفحات: ۱۸۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۷۷ء

یہ کتاب صد سالہ جشن اقبال کے موقع پر شائع ہونے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔

''افکارِ اقبال'' اقبال کے تمام افکار کا تو احاطہ نہیں کرتی البتہ درج ذیل چند موضوعات کو وضاحت سے ضرور سامنے لاتی ہے:

خطباتِ اقبال کا پس منظر، اقبال کے ہاں عبادات اور دعا کا مفہوم، اقبال کی فکر مذہبی، کلام اقبال میں حسین اور شہادت حسین کا مقام، اقبال اور نوجوان نسل، اقبال کا نظریہ آبادی، فلسفہ وجودیت اور اقبال۔

''گفتگو'' کے عنوان سے مصنف اپنے دیباچے میں اقبال کے افکار کو پرجوش انداز میں سراہتے ہوئے کہتے ہیں: ''برصغیر میں اسلامی فکر کا وقار شاہ ولی اللہ کے بعد اقبال کے دم قدم سے قائم ہوا، اقبال جو مسلمانوں کی نظریاتی سرحدوں کے محکم ترین حصار تھے''۔ (ص ۷)

سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، ''غالب کی نفسیاتِ غم''، صفحات:۱۱۱، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

یہ کتاب غالب کی باطنی شخصیت کو روشنی میں لانے کی کوشش ہے۔ کتاب کے چار ابواب افسردگی، رومانیت، غم دوراں اور تجریدیت ہیں۔ اصغر ندیم سید نے کتاب کے فلیپ میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا: ''اس کتاب میں نفسیات کے اصولوں کو سامنے رکھ کر غالب میں غم کی گہری پرتو کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے''۔ مصنف نے ''آئینہ خانہ'' کے عنوان سے اپنے پیش لفظ میں اپنے موضوع اور غالب کے نفسی مطالعے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

سویا مانے یاسر، ''غلام عباس۔ سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ''، صفحات:۲۹۵، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

سویا مانے یاسر جاپان کے ایک ایسے شخص ہیں جو اردو زبان، ادبیات اور برصغیر کی تہذیب و ثقافت سے بے انتہا محبت رکھتے ہیں۔ اُردو کی محبت میں اُنہوں نے ''اُوسا کا یونیورسٹی'' جاپان سے ایم۔اے اردو کیا اور اردو زبان و ادب کو مزید جاننے کے لیے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج آ گئے۔ یہیں پر انہوں نے ''غلام عباس۔ سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔

زیرِ نظر مقالہ تین ابواب میں تقسیم ہے، پہلے باب میں غلام عباس کی سوانح، افسانہ نگاری کے مختلف ادوار، غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں اور غلام عباس شناسی کو بڑی تفصیل اور تحقیقی دقت نظری کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں غلام عباس کے فن کے تحقیقی جائزے میں ان کے افسانوں کے پلاٹ، کردار نگاری، جزئیات نگاری، اسلوب اور مکالمہ نگاری کو پوری طرح روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں حوالہ جات، غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں کی فہرست، غلام عباس شناسی کے متعلق تحریروں کی فہرست اور ضمیمے میں غلام عباس کی تحریروں کے عکس موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس اپنے مسودوں حتیٰ کہ شائع شدہ تحریروں کو بھی کس طرح اصلاح کے عمل سے گزارتے رہتے تھے۔

سہیل احمد، ڈاکٹر، ''طرفیں''، صفحات:۱۷۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۸ء

معروف نقاد ڈاکٹر سہیل احمد کے مختلف تنقیدی مضامین کے اس مجموعے کا عنوان ''طرفیں'' میر کے ایک پرمعنی اور فنی تہہ داری کے ترجمان ایک مصرعے سے لیا گیا ہے: ع طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر

کتاب کے فلیپ پر ناشر کی جانب سے ایک تعارفی شذرے میں سہیل احمد کا امتیاز یہ بتایا گیا ہے:

> ''وہ نئی شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہیں اور مختلف شاعروں اور افسانہ نگاروں کے تخلیقی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کا دائرہ خاصا پھیلا ہوا ہے اور تنوع کا

مظہر ہے۔ تحقیقی مضامین، تبصرے، کتابوں کی تقریباتِ رُونمائی میں پڑھی جانے والی تحریریں اور
دیباچے، ان سب نے مل کر اس دائرے کو مکمل کیا ہے''۔

اس مجموعے میں غالب، اختر الایمان، ناصر کاظمی، منیر نیازی، انجم رومانی، شہزاد احمد، فاروق حسین، عزیز احمد، خالدہ حسین، صلاح الدین عادل، انتظار حسین، انور سجاد، منٹو، ریاض احمد، سلیم احمد کے فکر و فن پر (کچھ مفصل، کچھ مختصر) مضامین ہیں۔

اس کے علاوہ ''فنونِ لطیفہ اور انسانی تقدیر''، ''رباعی، سانیٹ اور چینی تہذیب''، ''فکشن، فن اور فلسفہ''، ''ہرمن ہیسے کے سدھارتھ کا اردو ترجمہ''، ''مارکسی تنقید دوراہے پر'' کے عنوانات سے پر مغز مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔

شاہین مفتی، ڈاکٹر، ''جدید اردو نظم میں وجودیت''، صفحات: ۵۱۲، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

زیر نظر کتاب ڈاکٹر شاہین مفتی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جس میں انہوں نے وجودیت کے حوالے سے جدید اردو نظم کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتی ہیں:

''موجودہ مقالے میں انسانی گمشدگی اور انسانی موجودگی کے چند مخصوص مظاہر کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی جو انفرادی سطح پر شخص کے بے پایاں یقین کا مظہر بھی ہیں اور سماجی سطح پر ایک نئی اخلاقیات کے علمبردار بھی''۔ (ص ۷)

پہلے باب میں وجودیت کے مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے؛ دیگر ابواب میں اقبال، ن۔م راشد، میرا جی، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، منیر نیازی، وزیر آغا، انیس ناگی، کشور ناہید اور دیگر شعراء کے ہاں: ''فکری اور شخصی سطح پر وجودیت کے جو مخصوص رجحانات دکھائی دیئے ہیں، صرف انہی کو حاصل مطالعہ بنایا گیا ہے''۔ (پیش لفظ، ص ۸) اس کتاب میں پیش کیے گئے کچھ نتائج فکر نزاعی بھی ثابت ہوئے۔

شیما مجید، (مرتب)، ''ادبی مذاکرے''، صفحات: ۷۴۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

اس ضخیم مجموعے میں ایسے مذاکرے، مکالمے اور مباحثے شامل کیے گئے ہیں جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے اور ان میں صاحبِ فکر ادبا و شعراء نے ادبی، تہذیبی، سیاسی، لسانی اور تحقیقی مسائل و مباحث پر اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا اور علمی مکالمے کے لیے ایک وسیع تر تناظر ادبی دنیا کو فراہم کیا۔ اس مجموعے میں ادبی مسائل، شاعری، افسانہ، چند فنکار، لسانی اور تحقیقی مسائل، مصوری اور متفرق (تہذیبی، ثقافتی اور فکری مسائل) کے عنوانات کے تحت پینتیس (۳۵) مذاکرے ہیں جو مختلف وقتوں میں: سویرا، نیا دور، ادب لطیف، ماہ نو، نقوش، نصرت، اوراق، تخلیق، آہنگ، پاکستانی ادب، صحیفہ، سیارہ، لفظ اور شعور میں شائع ہوئے تھے، علاوہ ازیں حلقہ اربابِ ذوق کے دو مذاکرے بھی شامل مجموعہ ہیں۔ مجموعے کے فلیپ پر انتظار حسین نے ان ادبی بحثوں کو ایک پورے زمانے کے دل و دماغ کا بیرومیٹر کہا ہے اور ان کی تدوین کو سراہا ہے۔

طاہر تونسوی، (مرتب)، ''اقبال اور مشاہیر'' صفحات: ۲۴۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۳ء

زیر نظر مجموعے میں مختلف اہل علم کے ایسے چودہ منتخب مضامین شامل ہیں جن میں اقبال کے حوالے سے مشرق و مغرب کے فلسفیوں اور تخلیق کاروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

کتاب کے مقدمے ''اقبال اور مشاہیر'' میں طاہر تونسوی نے اقبال اور مشرق و مغرب کے فلاسفہ کے درمیان اشتراک و اختلاف کی مختلف صورتوں کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے: اقبال اور عجم، اقبال اور مشرق، اقبال اور مغرب۔

حصہ ''اقبال اور عجم'' میں تین مقالات ہیں: اقبال اور حافظ، سید حامد قادری، اقبال اور رومی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، اقبال اور حلاج، بشیر احمد ڈار۔ ''اقبال اور مشرق'' کے حصے میں دراصل اقبال اور برصغیر کے مفکرین اور تخلیق کاروں کے مابین تعلق و تفاوت کو روشن کیا گیا ہے۔ اس حصے کے مشمولات: اقبال اور غالب۔ عبدالمغنی، اقبال اور چغتائی۔ ڈاکٹر وحید قریشی، اقبال اور بیدل۔ ڈاکٹر عبدالغنی، اقبال اور شبلی۔ ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اور سرسید۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اقبال اور حالی۔ پروفیسر سلیم اختر، اقبال اور اکبر۔ جعفر شاہ پھلواری ہیں۔

تیسرے حصے ''اقبال اور مغرب'' میں شامل مقالات یہ ہیں: اقبال اور برگساں۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور، اقبال اور نطشے، ڈاکٹر عشرت حسین انور، اقبال اور گوئٹے، ممتاز حسن، اقبال اور آرنلڈ۔ پروفیسر صدیق جاوید۔

آخر میں مختلف مجلوں میں شائع ہونے والے مضامین و مقالات کا ایک اشاریہ بھی موجود ہے۔

طاہر تونسوی، (مرتب)، ''طنز و مزاح۔ (تاریخ، تنقید، انتخاب)'' صفحات: ۵۶۷، زیر نظر انتخاب: ۱۹۸۹ء

اس مجموعے میں اردو طنز و مزاح کی تاریخ، روایت اور رجحانات پر مقالات اور طنزیہ و مزاحیہ شعر و نثر کا ایک بھرپور انتخاب شامل ہے۔

کتاب کا مقدمہ ''طنز و مزاح کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان ڈاکٹر طاہر تونسوی نے لکھا اور اختصار سے کام لیتے طنز و مزاح کی ماہیت اور روایت پر روشنی ڈالی۔ تاریخ و تنقید کے حصے میں شامل مقالات کے عنوان (اور مصنفین کے نام) درج ذیل ہیں:

طنز و ظرافت (ڈاکٹر خورشید الاسلام)، اردو ادب میں طنز و ظرافت (کلیم الدین احمد)، عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح (ڈاکٹر قمر رئیس)، اردو شاعری میں طنز (ڈاکٹر شوکت سبزواری)، اردو طنز و مزاح کے پچپیس سال (مجتبیٰ حسین)، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت (نثار احمد فاروقی)، نظم میں طنز و مزاح کے نئے رجحانات (سیدہ جعفر)، پیروڈی اردو ادب (ظفر احمد صدیقی)، ہمعصر تخلیقی رویے اور مزاح (ڈاکٹر سلیم اختر)

طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے حصے میں اردو کے تمام قابل ذکر ظریف شاعروں کا منتخب کلام موجود ہے، اسی طرح طنزیہ و مزاحیہ نثر کے انتخاب میں بھی تمام اہم طنز و مزاح لکھنے والے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں بقول مرتب: ''ایک جگہ پر اتنی ڈھیر ساری چیزوں کا اکٹھے ہو جانا اردو ادب کے طالبعلموں کے لیے افادیت کا باعث بھی ہے اور اہمیت کا بھی''۔ (ص ۱۲)

طاہر تونسوی، ڈاکٹر، (مرتب)، ''فیض کی تخلیقی شخصیت۔ تنقیدی مطالعہ''صفحات:۴۰۵، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

فیض احمد فیض کے فن و شخصیت پر مضامین اور فیض کے مختلف انٹرویوز پر مشتمل، زیر نظر مجموعہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں بکھرا ہوا مواد یکجا ہو گیا ہے اور فیض کے قارئین و مداحین اور اردو ادب کے طلبہ کے لیے (حصول مواد کے سلسلے میں) سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ مرتب کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مجموعے میں مطبوعہ مضامین کے ساتھ ساتھ نئے مضامین بھی لکھوا کر شامل کیے ہیں۔ حصہ مضامین میں فیض احمد فیض کے حوالے سے درج ذیل اہل نظر کی تحریریں موجود ہیں:

احمد ندیم قاسمی، کلیم الدین احمد، ممتاز حسین، عرش صدیقی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر عبدالمغنی، حرمت الاکرام، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، عتیق احمد، ڈاکٹر آغا سہیل، ریاض صدیقی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ علاوہ ازیں فیض سے لیے گئے چھ (انفرادی/ پینل) انٹرویوز بھی مجموعے میں شامل ہیں، جن میں دو انٹرویوز انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ طاہر تونسوی نے اپنے پیش لفظ میں ترتیب و تدوین کے کام کی اہمیت، افادیت اور مسائل و مشکلات پر بھی اختصار سے بات کی ہے۔

طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ''ہمسفر بگولوں کا'' (ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن کا مطالعہ) صفحات:۳۵۲، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۵ء

کتاب کے فلیپ پر عرش صدیقی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''ڈاکٹر طاہر تونسوی کی یہ تصنیف اردو کے ایک اہم نقاد اور افسانہ نگار کے فکری ارتقا اور اس کے افکار کی بنیاد کو سمجھنے اور ان افکار کی روشنی میں آج کے انسان، معاشرے اور عصر کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔ یہ تصنیف محبت اور عقیدت کا ثمر ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ مصنف کی بالغ نظری اور اس کے اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت بھی ہے''۔

زیر نظر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے حصے میں اان کی چند تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ پہلا حصہ نو ابواب پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر سلیم اختر کی سوانح، تاریخ نگاری، تنقیدی افکار، اقبال شناسی، افسانہ نگاری، طنز و مزاح، نفسیاتی تجزیے اور تراجم نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور آخری باب میں ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں مشاہیرِ ادب کی آرا اور رسائلِ ادب سے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں ایک تنقیدی مقالہ، چار افسانے، چار طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلیم اختر کے غیر مدون مضامین کی کتابیات بھی شامل ہے۔

عابد علی عابد، سید، ''اصول انتقادِ ادبیات''، صفحات:۵۹۴، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

معروف نقاد سید عابد علی عابد کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا اور طبع دوم ۱۹۶۶ء میں

سامنے آئی، اس کے صفحات ۵۹۴ تھے، سنگ میل کا موجودہ ایڈیشن اسی کا عکس ہے۔ کتاب کے مقدمے میں سید عابد علی عابد نے تنقید (جس کے لیے وہ انتقاد کا لفظ استعمال کرتے ہیں) اور اردو تنقید پر وضاحت سے نیز اپنے مقالات میں ذاتی رائے اور نجی تاثر کی موجودگی پر اختصار سے بات کی ہے؛ انہوں نے اپنے تنقیدی مسلک کو یوں واضح کیا ہے:

> ''مؤلف کو بھی آپ کی طرح کسی ادیب کو اچھا اور کسی کو برا سمجھنے کا حق حاصل ہے۔ بہ الفاظ دیگر انتقاد کے نتیجے کے طور پر دل آزاری ضرور ہوگی لیکن واضح رہے کہ دل آزاری نہ مقصود ہے نہ مطلوب و مرغوب کہ انتقاد کی ایسی کوئی شریفانہ اور معصوم صورت نہیں جو ذاتی تعصب اور تاثر سے بالکل خالی ہو۔ امریکہ کے ایک مشہور مصنف مینکن نے تو اپنے تنقیدی مقالات کے مجموعے کا نام ہی تعصّبات رکھا ہے''۔ (ص ۱۴، ۱۵)

کتاب کے گیارہ ابواب یہ ہیں: ادب اور اس کی اصناف، انتقادی مطالعے کے مباحث عمومی، یورپ میں انتقادِ ادبیات، مشرقی انتقاد کے اہم مسائل اور مغربی اسلوب کی تطبیق، اردو میں انتقاد کا ارتقاء، شعری تخلیقات کے اصول انتقاد، داستانیں، ناول، مختصر افسانہ، ڈراما، مرثیہ۔ کتاب کے آخر میں اشخاص، مقامات، کتب اور موضوعات و اصطلاحات کا ایک مبسوط اشاریہ شامل ہے جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

عابد علی عابد، ''البدیع''، صفحات: ۳۱۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''البدیع''۔ محسنات شعری کے تنقیدی جائزے پر مشتمل کتاب ہے؛ اسے عابد علی عابد کے اہم تحقیقی و تنقیدی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ''البدیع'' کی پہلی اشاعت مجلس ترقی ادب کے زیر اہتمام ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ (اس ایڈیشن کے کل صفحات ۳۶۷ تھے)
''البدیع'' تین ابواب پر مشتمل ہے۔ ۱۔ معانی، بیان اور بدیع کا باہمی رشتہ، ۲۔ علم بدیع کی تدوین کی تاریخ، ۳۔ صنائع و بدائع لفظی و معنوی۔
پہلے باب میں اظہار و ابلاغ، معانی، مترادف اور بدیع کی تفاصیل اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں فارسی زبان میں علم بدیع کی تاریخ اور اہم اردو تصانیف کے حوالے سے فارسی کے اثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں صنائع و بدائع کی تمام تر تفاصیل مثالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ البدیع ایک تکنیکی نوعیت کے موضوع پر نہایت وقیع کتاب ہے۔

عابد علی عابد، سید، ''انتقادِ ادبیات (مقالاتِ عابد)''، صفحات: ۳۰۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

کتاب کے درج ذیل مقالات تنوع اور گہرے تنقیدی تجزیے کے حامل ہیں۔
''غالب کی شخصیت اور فن''۔ ''شیر علی افسوس کی تالیف آرائش محفل کا ایک جائزہ'' ''تاثیر کے مجموعہ کلام آتش کدہ کا تنقیدی جائزہ''۔ ''سید امتیاز علی تاج۔ ملفوظات''۔ ''کلمہ آئینہ کی تحقیق''۔ ''خوب اور خوبی''۔ ''اعجازِ وفا (مرثیے پر)''۔ ''ادب اور روایت''۔

''عوامی صوفیانہ شاعری''۔''پاکستان میں شاعری کا مستقبل''۔''بول بالا رہے گا یگانہ کا''۔''طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض''۔
''خدا نصیب کرے''۔(کتاب کا فلیپ سید مینو چہر کا لکھا ہوا ہے۔)

عابد علی عابد، سید،''مقالاتِ عابد (انتقادِ شعر)''، صفحات: ۲۴۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

''مقالاتِ عابد'' سید عابد علی عابد کے اردو شاعری کے حوالے سے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے بیٹے سید مینو چہر نے سید سجاد رضوی کے تعاون سے مرتب کیا۔ اس مجموعے میں عابد علی عابد کے درج ذیل مضامین شامل ہیں:

> انتقادِ شعر۔ اردو غزل کے علائم و رموز، اس نے دیکھے ہی نہیں۔ اردو غزل کے علائم و رموز صنعت گری (۱)، (۲)۔ اردو غزل کے علائم و رموز، جلوہ۔ بہار۔ ہندو بڑھے۔ شعر میں تشبیہات۔ ذوق کی شعری تخلیقات۔ کچھ غالب کے بارے میں۔ داغ کے کلام پر انتقاد۔ اصغر علی نسیم دہلوی کی غزل۔ مومن کی ایک مثنوی۔

ان مضامین میں نہایت عمدہ درجے کی شعر فہمی کے ساتھ اردو کی کلاسیکی شاعری کے رنگ روپ اور معنوی گہرائی کو سطح پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عاشق حسین بٹالوی،''اقبال کے آخری دو سال''، صفحات: ۷۰۱، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

یہ کتاب پہلی بار اقبال اکادمی پاکستان، لاہور نے ۱۹۶۰ء میں شائع کی، اس کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بالترتیب ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۸ء میں طبع ہوئے۔ کتاب کے مقدمے (طبع اول) میں مصنف نے کتاب کے عنوان اور تناظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میں نے اقبال کی بیماری یا ان کی شاعری یا ان کی خانگی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اقبال نے اپنے آخری دو برسوں میں پنجاب مسلم لیگ کی تحریک کو فروغ دینے اور مسٹر جناح کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس کی ایک جامع اور مستند روئیداد مرتب کر دی جائے''۔(ص ۱۹، ۲۰)

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں برصغیر کا سیاسی اور تحریکی پس منظر اور دوسرے میں اقبال کے آخری دو سالوں کا سیاسی احوال اور قومی خدمات، اہم دستاویزات کی روشنی میں رقم کیے گئے ہیں۔(زیرِ نظر ایڈیشن، اقبال اکادمی کے ایڈیشن کا عکس ہے)

عبداللہ، سید، ڈاکٹر،''سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ''، صفحات: ۲۳۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

اردو تنقید کے قارئین خصوصاً ادب کے طلبہ میں مقبول یہ کتاب سب سے پہلے مکتبہ کارواں، لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔

اس کے مختصر سے دیباچے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کتاب کے معرضِ وجود میں آنے کی روداد لکھی ہے۔

کتاب میں سرسید احمد خان، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی کے نثری اسالیب کو خاصی صراحت اور گہرائی کے ساتھ جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادب کے طلبہ اس کتاب کے ذریعے نہ صرف اردو کے عظیم نثری اسالیب سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ان میں نثر کو پڑھنے، جاننے اور نثر نگاروں کے اسالیب میں امتیاز کرنے کا سلیقہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

کتاب کے آخر میں پانچ ضمیمے بھی شامل ہیں جو ہر طرح سے کتاب کے اصل موضوع کا حصہ ہیں۔

عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''اشاراتِ تنقید''، صفحات: ۳۱۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''اشاراتِ تنقید'' میں سید عبداللہ نے ''گزارش'' کے عنوان سے جو مختصر دیباچہ تحریر کیا اس پر ۱۹۶۶ء کا سن درج ہے۔ گویا تقریباً چار دہائیوں سے یہ کتاب ادب کے طلبہ اور نقد و نظر کے سنجیدہ قارئین کے لیے دلچسپی، تفہیم اور فکری اُفق کی توسیع کے سامان لیے ہوئے ہے۔ اس میں سید عبداللہ نے تنقید کے ڈھیروں موضوعات کو اپنا موضوع بنایا لیکن تفصیل سے گریز کیا اور اپنی تحریروں کو فقط اشارات کہہ کر آئندہ مفصل لکھنے کا ارادہ اپنے دیباچے میں ظاہر کیا۔

اس کتاب میں مغرب کے تقریباً تمام اہم اور اردو کے قیام پاکستان تک تمام قابل ذکر ناقدین کے تصورات کو آسان پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تنقید کے جدید دور، ادبی تنقید ایک سائنس، ذوقِ سخن اور تحسین سخن پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ متفرق موضوعات میں ادب کے قدیم تصور سے لے کر ادب شناسی کی تمام منزلوں تک تنقیدی بصیرت کا کچھ اس طرح اظہار کیا گیا ہے کہ قاری اور طالب علم تنقید کے کسی عمومی موضوع سے نامانوس نہیں رہتے۔

عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''وجہی سے عبدالحق تک''، صفحات: ۳۲۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

کتاب کے ''دیباچہ اشاعت ثانی'' سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی تھی۔ اس کے بعد اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور اردو نثری اسالیب کے مباحث کے حوالے سے یہ سب سے مقبول کتاب ثابت ہوئی۔ سید عبداللہ نے وجہی، شاہ عالم آفتاب، میر امن، مرزا غالب، ظہیر دہلوی، سرسید، حالی، نذیر احمد، محسن الملک، شبلی، محمد حسین آزاد، ابوالکلام، اقبال، عبدالحق، خلیفہ عبدالحکیم، احسان دانش، مجنوں گورکھپوری، شورش، کیانی کے نثری اسالیب کو بڑی گہرائی سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کے نثری اسالیب پر کام خاصا کم ہوا ہے، اس حوالے سے بھی اس کتاب کی اہمیت برقرار ہے، گو بعض موضوعات پر تشنگی اور تدریسی انداز کی تنقید کا بھی احساس ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود نثری تنقید کی دنیا میں اس کتاب کی اہمیت خاصے عرصے قائم رہے گی۔ (مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور نے بھی اس کتاب کا ایک ایڈیشن اضافوں اور نئی ترتیب کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں شائع کیا تھا۔)

عبداللہ،سید،ڈاکٹر،''ولی سے اقبال تک''،صفحات:۳۰۴،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

کتاب کا ابتدائیہ ۱۹۷۶ء کا لکھا ہوا ہے اوراس میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک تازہ اشاعت ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔''ولی سے اقبال تک''اصل میں ہماری کلاسیکی اور جدید شعری روایت کے محاسن و معائب کا مطالعہ ہے جو سید عبداللہ نے بڑی دلجمعی سے کیا ہے۔اس کتاب میں ولی کی جمال دوستی، اردو مثنوی کا دکنی دور، کلام میر میں فکر و نظر کا عنصر، سودا کی غزل، درد کا صوفیانہ لب و لہجہ، مثنوی خواب وخیال، گلزارنسیم، خواجہ آتش کی مرصع سازی، مصحفی کا کارنامہ خاص، ناسخ کی منسوخ شاعری، غالب کی غزل، مرزا غالب کا حاسہ انتقاد، مومن، داغ، حالی، اقبال کا کلام اور اردو نظم کے وضاحتی دور سے علامتی دور تک کی کیفیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔غلام حسین ذوالفقار نے کتاب کے فلیپ میں درست کہا ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ تالیف اردو شاعری پر بظاہر متفرق، مگر بہ باطن مربوط مضامین کا مجموعہ ہے۔

عطش دُرانی،''اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم''،صفحات:۱۳۶،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

یورپ کے اہلِ علم اور اہل قلم نے اردو زبان کے لغت، قواعد اور لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنے سیاسی، سماجی اور علمی مقاصد کے لیے جو کام کیا اس سے اردو زبان اور اس کے ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔عطش درانی نے اپنی زیرِنظر کتاب میں ایسے یورپی اہل قلم کی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔جنہوں نے لغات کی تدوین، قواعد کے مطالعے، لسانیاتی مباحث کے آغاز اور اردو نثر کے فروغ کے لیے کام کیا ہے۔کتاب کے ابواب یہ ہیں:ا۔''اردو اور اہل یورپ کا تعلق''۔۲۔''اردو لغات کی تدوین اور اہل یورپ''۔۳۔''اردو کے یورپی قواعد نویس''۔۴۔''اردو کے یورپی ماہرین لسانیات''۔۵۔''اردو نثر اور یورپی اہل قلم''۔۶۔''اردو ادب کے یورپی نقاد اور مترجمین''۔۷۔''اردو اصطلاحات کا ایک قدیم لغت''۔

عطش دُرانی،''تشکیلِ تمدن''،صفحات:۱۴۴،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

یہ کتاب انسانی تہذیب وتمدن کی کہانی ہے۔اس کہانی کی ابتداء انسان کی ابتداء سے ہوتی ہے اور قبل از اسلام کے تمام قدیم تمدنوں کے تشکیلی مراحل سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔البتہ اس جائزے میں چین، ہندوستان اور یونان کے تمدنوں کا ذکر نہیں ہے اور اس کی وجہ مصنف نے اپنے مقدمے میں یہ بتائی ہے:''یہ کتاب بنیادی طور پر تشکیل تمدن کے مراحل کا جائزہ لینے کے لیے پیش کی جارہی ہے۔چینی، ہندوستانی اور یونانی تمدن ان مراحل کا ثمر تھے''۔(ص ۸)

کتاب کے پہلے باب میں انسان کی ارتقائی تخلیق پر، دوسرے باب میں دجلہ وفرات کی تہذیبوں پر اور تیسرے میں کنعانیوں، آرامیوں، شامیوں اور فلسطینیوں کے تمدن پر روشنی ڈالی گئی ہے؛ چوتھا باب، ایران، ہندوستان اور یورپ میں داخل ہونے والی آریہ قوم کے

بارے میں ہے؛ پانچواں باب، مصراور فراعنہ مصراور چھٹا باب، یونانی جزیروں کے مینوئی یا آ ژی تمدن کے حوالے سے ہے، ساتواں باب آسٹریلیا کے اور آٹھواں باب امریکا (شمال مغربی میکسیکو) کے قدیم باشندوں کے تہذیب وتمدن پر ہے، نواں باب ایران اور روما اور دسواں باب قبل از اسلام عربوں کے تمدن پر روشنی ڈالتا ہے۔

عطیہ سید، ''اقبال۔ مسلم فکر کا ارتقاء'' صفحات: ۱۷۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

عطیہ سید، کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کراتی ہیں:

> ''یہ مسلم افکار، خاص طور پر فلسفیانہ افکار کی تاریخ ہے۔ لیکن اس تاریخ کو اقبال کے حوالے سے لکھا گیا ہے، یعنی یہ سمجھنے کی کوشش ہے کہ اقبال مختلف مسلم فلسفیانہ تحریکوں اور مفکرین کو کس نقطہ نظر سے دیکھتے تھے''۔ (ص ۷)

کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں یونانی فلسفہ اور دوسرے حصے میں (متکلمین) معتزلہ اور اشاعرہ زیر بحث آئے ہیں؛ حصہ سوم میں تصوف اور ''تصوف کی مابعد الطبیعات'' کا تجزیہ کیا گیا ہے؛ چوتھے حصے میں ابن مسکویہ، ابن سینا، الغزالی، ابن رُشد اور پانچویں حصے میں البیرونی، عراقی، ابن تیمیہ اور ابن خلدون کا مطالعہ (بحوالہ اقبال) کیا گیا ہے۔

> ''کتاب کے آخری باب (بعنوان حاصل بحث) میں ساری تاریخی تحقیق وتفتیش کا نچوڑ ہے جو اس باطنی تسلسل وارتقا کی نشاندہی کرتا ہے جو اقبال کو مسلم فلسفے اور افکار کی تاریخ میں مجموعی طور پر جاری وساری دکھائی دیتا ہے''۔ (ص ۱۲، تعارف)

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ''اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر'' صفحات: ۵۲۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

ممتاز محقق ونقاد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس کتاب میں اردو شاعری کو اس کے سیاسی اور سماجی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر ایڈیشن طبع ثانی ہے، اس کی تمہید (مرقوم: ۱۹۹۱ء) میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

> ''اس تالیف کا مسودہ پچاس کے عشرے میں تیار ہوا تھا اور ساٹھ کے عشرے میں کتابی صورت میں پہلی بار طبع ہوا...... اس تالیف میں اردو شاعری کی تاریخ بیان نہیں کی گئی البتہ شعری رجحانات کو زیر بحث لایا گیا اور شعرا کے اجتماعی شعور واحساس کا پتا لگانے کی کوشش کی گئی ہے؛ ضمناً جنوبی ایشیا کی چارصد سالہ تاریخ کے اہم رجحانات بھی سامنے آ گئے ہیں''۔ (ص د)

فہرست ابواب کچھ یوں ہے: ۱۔ شاعر اور معاشرہ ۲۔ سیاسی اور سماجی حالات کا مختصر جائزہ ۳۔ اردو شاعری کا دکنی دور ۴۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا دور اول (دبستان دلی ۱۷۰۷۔ ۱۸۰۳ء)۔ ۵۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری ۔ ۶۔ قدیم اردو شاعری کا دور آخر (فصل

اول: دبستان لکھنو، فصل دوم: دلی کی بزم آخر)۷۔اصلاحی دور کی شاعری (۱۸۵۷ء۔۱۹۰۰ء)۸۔اکبرالہ آبادی کی شاعری۔۹۔اردو شاعری، بیسویں صدی میں۔آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی موجود ہے۔کتاب ٹائپ (خط نسخ) میں چھپی ہے۔کتاب پہلی بار مطبع جامعہ پنجاب، لاہور نے ۱۹۶۶ء میں شائع کی تھی۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ''بزم اکبر'' (لسان العصر اکبر کے سو منتخب اشعار مع تجزیہ وتنقید)، صفحات:۲۰۴، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے کتاب کی تمہید میں بتایا ہے کہ:

> ''بزم اکبر میں لسان العصر اکبر کی مختلف ادوار کی غزلوں کے ایک سو اشعار کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔
> یہ انتخاب کسی خاص موضوع کے اعتبار سے نہیں بلکہ ردیف وار الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے اور
> ساتھ ساتھ ہر شعر کا تنقیدی تجزیہ سیاسی وتہذیبی پس منظر کے حوالے سے کیا گیا ہے''۔(ص۹)

کتاب میں اشعار کی تشریح وتوضیح مختصر اور مکمل ہے اور اکبر کے اشعار کی تہہ میں موجود سنجیدگی کو سطح پر لانے کی ایک عالمانہ کوشش ہے۔
آج کے مصروف ترین عام قارئین کے لیے اس نوعیت کی مختصر کتابوں کی ضرورت ہے تاکہ بھاری بھرکم کلیات، اور ضخیم تشریحات دیکھ کر شعر کی دنیا سے دور ہو جانے والوں کو واپس لانے کی سبیل پیدا ہو سکے۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، (مرتب) ''خاطرات'' (آپ بیتی: ظفر حسن آیبک)، صفحات:۵۵۸، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

''خاطرات'' ظفر حسن آیبک کی خودنوشت سوانح ہے جو پہلی بار ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی؛ اس کا دوسرا حصہ ۱۹۶۷ء اور تیسرا حصہ ۱۹۷۳ء میں طبع ہوا؛ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ۱۹۸۸ء میں سابق اشاعتوں کی اغلاط کی تصحیح، ابواب کی ترتیب نو اور آپ بیتی کے اسلوب کو واضح اور سلیس کرنے کا کام مکمل کیا؛ اس کام میں مرتب کو ظفر حسن آیبک کی معاونت اور مشاورت حاصل رہی تھی۔
ظفر حسن آیبک برصغیر کے ان نوجوانوں میں سے تھے جنھیں مولانا عبیداللہ سندھی کی رہبری میں آزادی اور انقلاب کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔انھوں نے مولانا سندھی کی معیت میں افغانستان، ترکی اور روس میں گیارہ برس سے زائد عرصہ گزارا (مقدمہ: شریف الحسن، ص۲۲) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''ظفر حسن آیبک کی یہ آپ بیتی جو درحقیقت جہاد حریت کی ایک روح پرور داستان بھی ہے اور
> محکومی سے آزادی تک ہمارے ملی سفر کی تاریخ کے بعض اہم اور گمشدہ اوراق کی بازیافت بھی....
> حقیقت پسندی اور حقائق نگاری میں ظفر حسن کی آپ بیتی اردو ادب میں بے مثال ہے....
> ظفر حسن نے نہایت سادگی اور راست گوئی سے جو کچھ ان کے حافظے میں محفوظ تھا، اس میں بیان
> کر دیا ہے''۔(ص:۱۴، ۱۵، ۱۷)

آخر میں اہم تصاویر اور قومی نوعیت کی دستاویزات (تاریخ تحریر:۲۹/اکتوبر ۱۹۸۸ء) کتاب کی تاریخی اہمیت کو مزید بڑھا رہی ہیں۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ''پنجاب۔ تحقیق کی روشنی میں''، صفحات:۲۹۵، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کتاب کے اندراجات کے حوالے سے کہتے ہیں:

''پنجاب۔ تحقیق کی روشنی میں' میرے چند متفرق تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر مضامین خطہ پنجاب سے متعلق ہیں۔ ان میں لسانی، ادبی، سیاسی، تہذیبی اور تاریخی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ چند دوسرے مضامین ہیں (جن میں) شعری وادبی مسائل کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے''۔ (پیش لفظ: ص ۷، تاریخ تحریر:۱۰/جنوری ۱۹۹۰ء)

اس مجموعے میں پنجاب کے حوالے سے درج ذیل مضامین ہیں:

۱۔ ''پنجاب میں اردو'(سب سے طویل مضمون ہے اور اس میں حافظ محمود شیرانی کی تالیف اور نظریئے ''پنجاب میں اردو' اور اس حوالے سے دیگر ماہرین لسانیات کے خیالات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے)

۲۔ ''یونیورسٹی اورینٹل کالج کی تصنیفی روایت'' (اس مضمون میں اورینٹل کالج لاہور کی تحقیقی وتصنیفی روایات کی تحسین کی گئی ہے)

۳۔ ''پنجاب کا سیاسی، تہذیبی وثقافتی ماحول۔ عہد اسلامی میں''

۴۔ ''پنجاب کا سیاسی، تہذیبی وثقافتی ماحول۔ عہد انگلیسی، وکٹورین دور میں''۔

دیگر مضامین کے عنوانات یہ ہیں: عہد محمد شاہی کا ادبی ماحول، شاہ حاتم اور اُن کا ''دیوان زادہ''، شاہ حاتم کی بہاریہ مثنوی ''بزم عشرت''، مثنوی ''لعل وگوہر'' کا زمانہ تصنیف، مولوی کریم الدین اور ''طبقات شعرائے ہند''۔

درج بالا مضامین کو بھی بقول غلام حسین ذوالفقار: ''پنجاب سے بھی ایک گونہ مناسبت ہے۔ کیونکہ بارہویں صدی ہجری میں دہلی اور لاہور کے ادبی ماحول میں بہت کم فرق تھا''۔ (پیش لفظ: ص ۷)

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، پروفیسر، ''گاندھی۔ لسان العصر کی نظر میں''، صفحات:۲۸۶، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''یہ تالیف... میرے ایک پرانے مضمون ''اکبر اور گاندھی'' کی توسیع شدہ صورت ہے..... اسی مضمون کی ترمیم شدہ صورت ''اکبر کا گاندھی نامہ'' میری تالیف ''مطالعہ اکبر'' میں شامل ہوا۔ ''گاندھی نامہ'' لسان العصر اکبر کا خود مرتب کردہ غیر مطبوعہ کلام تھا جو ان کی وفات کے تقریباً ستائیس سال بعد.... کتابستان الہ آباد نے شائع کیا تھا.... یہ تالیف تحریک خلافت اور ترک

موالات کی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی کے کردار وشخصیت کے حوالے سے متذکرہ
تحریکوں کا ایک اجمالی جائزہ ہے جو گاندھی نامہ کے سمجھنے میں ایک حد تک معاون ہوسکتا ہے''۔
(ص۵،۶،تاریخ تحریر:۲۳/ مارچ۱۹۹۱ء)

کتاب کی ''تمہید'' میں اکبرالہ آبادی اوران کے افکار پرایک نظر ڈالی گئی ہے۔ باقی کتاب دوحصوں ''پس منظر'' اور ''پیش منظر'' میں منقسم ہے۔ پس منظر کے چھ ابواب میں برطانوی استعمار کے خلاف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی جدوجہد، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے لیے راہ عمل کا مسئلہ، اکبرالہ آبادی کے تہذیبی وسیاسی افکار، جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا جذبہ حریت اوراتحاد اسلامی تحریک، تحریک خلافت، تحریک خلافت وترک موالات میں گاندھی کا کردار زیر بحث آئے ہیں۔ پیش منظر کے پانچ ابواب کے عنوانات یہ ہیں: ''مہاتما گاندھی۔ لسان العصر کی نظر میں''، ''اکبر کے چند شعر۔ وضاحت اور تجزیہ''، ''اکبر کا گاندھی نامہ (تمہید از محمد نعیم الرحمٰن)''، ''گاندھی نامہ (متن)، باقیات (گاندھی نامہ)''۔ آخر میں ایک مبسوط اشاریہ (شخصیات کے حوالے سے) موجود ہے۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، پروفیسر، (ترتیب ومقدمہ)، ''مضامین سرسید'' (منتخبات تہذیب الاخلاق)، صفحات: ۱۶۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے دیباچے (طبع ثالث) میں ''مضامین سرسید'' کے انتخاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق'' میں سے سرسید کے ایسے مضامین کا انتخاب کیا گیا جن میں ''تہذیب الاخلاق'' کے مقاصد، سرسید احمد خاں کے تنقیدی خیالات اور ان کے ''مقصدی'' اور ادبی مضامین کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا گیا جس کے مطالعے سے ہمارے طلبہ سرسید کے مقاصد اور ادبی نقطہ نگاہ سے آگاہی حاصل کرنے کے علاوہ ان کے ادبی اسلوب سے بھی بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ مضامین سرسید کے عنوان سے یہ کتاب پہلی بار جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی اور اسے بھی خاصی پذیرائی ہوئی''۔ (ص ندارد)

کتاب میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنے مبسوط اور عمدہ مقدمے میں مضمون نگاری کا ارتقاء اور سرسید کے مضامین کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا ہے۔ کتاب میں سرسید کے تمام اہم اور معروف مضامین کے ساتھ ساتھ ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء، مقاصد اور کارکردگی کے حوالے سے بھی سرسید کی تحریریں موجود ہیں۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ''مولانا ظفر علی خان، حیات، خدمات وآثار''، صفحات: ۸۲۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

مولانا ظفر علی خان کے حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی پہلی تالیف ظفر علی خان کے شعر وادب کا جائزہ تھی جو اصل میں ایم

اے اردو کے تحقیقی مقالے کے طور پر تیار کی گئی تھی۔ (دیباچے کے مطابق) ایک عرصہ یہ تالیف غیر مطبوعہ رہی، آخر آغا شورش کاشمیری اور احسان دانش کے اصرار سے ۱۹۶۸ء میں ''ظفر علی خان، ادیب و شاعر'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ (مکتبہ خیابان ادب، لاہور کے زیر اہتمام اس کتاب کی پہلی اشاعت پر ۱۹۶۷ء درج ہے)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی خواہش تھی کہ ایسی تصنیف سامنے آئے جو ظفر علی خان کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں کو بہ تمام و کمال سامنے لا سکے۔ اپنی پہلی تالیف کے بہت عرصے بعد آخر ڈاکٹر ذوالفقار کے خواب شرمندہ تعبیر ہوئے اور زیر نظر کتاب ظفر علی خان پر ایک دستاویز بن کر سامنے آ گئی۔ کتاب میں ''حیات ظفر'' کے عنوان سے سوانح، ''خدمات ظفر'' کے باب میں شخصیت و کردار اور سیاسی و صحافتی و دینی خدمات۔ ''آثارِ ظفر'' کے باب میں شعری و نثری آثار، ''خطبات ظفر'' میں خطبات اور ''زمیندار'' کے باب میں اخبار کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ آخر میں رجال و اماکن (شخصیات اور مقامات) کا ایک مبسوط اشاریہ بھی شامل کتاب ہے۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ''نقد اکبر''، صفحات: ۱۹۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۷۲ء

''نقد اکبر'' اکبر الہ آبادی کے حوالے سے لکھے گئے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اکبر الہ آبادی کے فکر و نظر، اسلوب شعر اور ادبی اثرات کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر مدلل لیکن اختصار سے پیش کیا ہے۔

اس مجموعے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

اکبر کا ذہنی ارتقا، اکبر کی ظرافت، قومی تہذیب و معاشرت اور اکبر، اکبر کا نظریہ تعلیم، اکبر کا سیاسی تفکر، شخصیات۔ کلام اکبر کے آئینے میں، اکبر اور اردو غزل، اکبر کا رنگ تغزل، اکبر پیش روِ اقبال۔

کتاب کی تمہید غلام حسین ذوالفقار نے خود لکھی ہے اور اس پر تاریخ تحریر ۲۱/ اپریل ۱۹۷۲ء درج ہے۔ طباعت کا معیار اچھا ہے جس سے سنگ میل کی پہلی دہائی (۱۹۶۲ء۔۱۹۷۲ء) کی اشاعتی کارکردگی ظاہر ہوتی ہے۔

فتح محمد ملک، ''اپنی آگ کی تلاش میں''، صفحات: ۱۹۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

فتح محمد ملک، تنقیدی مضامین کے اس مجموعے کے ابتدائیے میں کہتے ہیں:

> ''میں ادبی تنقید کے عنوان سے اب تک جو کچھ لکھتا آیا ہوں، اس کا اردو ادب میں تنقید کا دامن وسیع کرنے یا ادبی تنقید کو مزید پُرثروت بنانے کے جذبے سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ میرے ہاں تو لکھنا اپنی قومی و ملی خاکستر میں سے چنگاریاں ڈھونڈنے کا عمل ہے۔ یہ مضامین اسی عمل کا ثمر ہیں''۔ (ص ۷)

واقعی فتح محمد ملک کسی فن پارے کا جائزہ لیتے ہوئے قومی و ملی طور پر بے حد حساس نظر آتے ہیں لیکن فن کی جمالیاتی قدروں کا بھی

انہیں احساس ہے اور وہ اس پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ ''اپنی آگ کی تلاش میں'' درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔شاعر اور سیاستدان: فیض کی دو نظمیں ۔۲۔قرۃ العین حیدر: اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب ۔۳۔مستنصر حسین تارڑ: راکھ میں چنگاری کی تلاش ۔۴۔ایک غیر مطبوعہ صوفی شاعر (سید منظور حیدر) ۵۔سلیم احمد کی شاعری ۔۶۔ضیاء جالندھری کے خواب سراب ۔۷۔کشور ناہید کی داستانِ محبت ۔۸۔منصورہ احمد کی دنیا۔۹۔الطاف گوہر کی ادبی تحریریں ۔۱۰۔ظہیر بابر کے افسانے ۔۱۱۔نیلوفر اقبال کی تین کہانیاں ۔۱۲۔مستقبل کا ماضی ۔۱۳۔اپنی خودی کو پہچان: اقبال اور افغانستان۔

فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی۔شاعر اور افسانہ نگار''، صفحات: ۲۷۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

کتاب کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب احمد ندیم قاسمی کی پچھترویں سالگرہ پر ان کے فکر وفن کو ایک بھرپور خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے؛ اپنے ابتدائیے میں فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کے فکر وفن کو سمجھنے کی یہ ایک ابتدائی سی کوشش ہے۔ اپنی زندگی کے پچھترویں سال میں بھی ان کے ہاں تخلیق کا شعلہ بڑی آب وتاب کے ساتھ فروزاں ہے۔ جب تک یہ شعلہ تاباں ہے اس کی توانا اور متحرک روشنی سے کسب نور کرنے والے، مجھے ایسے قارئین ادب بھی اپنے تنقیدی تاثرات قلمبند کرتے رہیں گے اور یوں اس کتاب سے کہیں بہتر کتابیں وجود میں آتی رہیں گی''۔(ص ۷، تاریخ تحریر ۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۱ء)

کتاب چار حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں ''حسرت اظہار'' کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کی پچھترویں سالگرہ پر خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، ''افق فن'' میں فنی جہات کو موضوع بنایا گیا ہے، ''اپنی مٹی کی خوشبو'' کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کے کالموں کے مجموعے ''تہذیب وفن'' کو تجزیے اور تحسین کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

دوسرا حصہ: احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات میں درج ذیل موضوعات کے مطالعے کے لیے وقف ہے:

خواب اور شکستِ خواب، صدائے بے صدا، سوزِ وطن، روحِ عصر، جنگ نامہ، بچے اور مائیں، مظلومی نسواں۔

تیسرے حصے میں: حسن اور حسنِ عمل، قریہ محبت، آدمی اور انسان، خدا، انسان اور کائنات، فنا اور بقا کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی نثر ونظم کا جائزہ لیا گیا ہے؛ آخری حصے میں بطور ضمیمہ احمد ندیم قاسمی کے حالات وکوائف پیش کیے گئے ہیں۔

فتح محمد ملک، ''اقبال فراموشی''، صفحات: ۲۰۸، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

اقبال کے حوالے سے اس مجموعے کے مضامین متفرق ضرور ہیں مگر ان کا مرکزی موضوع ایک ہی ہے؛ فتح محمد ملک نے اقبال کے انقلابی تصورات کے عملی امکانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عنوانات کی درج ذیل فہرست بھی کتاب کے موضوع، ماہیت اور

اہمیت کوواضح کرتی ہے:

اقبال اور شیطان کا سیاسی منشور،نظم ''ذوق اورشوق'' کو سمجھنے کے لیے، اقبال، اسلام اور مذاہب فقہ، اقبال، قرآن اور پاکستان، اقبال، پاکستان اور سید علی میاں، اقبال، امام خمینی اور ترکِ فرنگ، اقبال اور آج کا ترکی، اقبال اور عبادت کا اسلامی تصور، خطبہ الہ آباد۔ ایک نئ تشکیل، اقبال اور اسلامی اتحاد کا جدید تصور، اقبال کی شاعری میں تصور پاکستان کا عکس، اقبال اور سلطانی جمہور کا اسلامی تصور، اقبال کی حکمت اور حکمت عملی، اقبال اور ہماراقومی مقدر، اقبال اور معاشی انصاف کی تلاش۔

کتاب سال اقبال (۲۰۰۲ء) کی مناسبت سے شائع ہوئی۔

فتح محمد ملک، ''اقبال۔فکروعمل''،صفحات:۱۵۹،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۵ء

علامہ اقبال کے حوالے سے مختلف مضامین کے اس مجموعے کو فتح محمد ملک نے ''فکر اقبال کے عملی مضمرات سے بصیرت اندوز ہونے کی ایک عاجزانہ سی کوشش'' قرار دیا ہے (ابتدائیہ،ص ۱۱) اور احمد ندیم قاسمی نے بھی اپنے پیش لفظ میں کتاب کی بنیادی خوبی یہی بتائی ہے:

> ''فتح محمد ملک نے تصورِ پاکستان کو اقبال کے نظام فکر سے مربوط کیا ہے اور بجا طور پر یہ فیصلہ سنایا ہے کہ پاکستان کی بقا اور ترقی فکر اقبال اور پیغام اقبال کی سچی اور دیانتدارانہ تعبیر پر منحصر ہے۔وہ فکر اقبال کو پاکستان کی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی پاکستان کی حفاظتی فصیل ہے''۔(ص ۸)

کتاب کے اندراجات یہ ہیں: اقبال۔مجموعہ اضداد یا دانائے راز؟، اقبال، اثبات نبوت اور تصور پاکستان، اقبال اور سرزمین پاکستان، پاکستان اور مشکلات لا الہ، اقبال اور ہماری ثقافتی تشکیل نو، اقبال اور ہماری ادبی تشکیل نو۔ضمیمے: اقبال اور سرزمین پاکستان (ایک مکالمہ) (یہ سلیم احمد سے ایک مراسلاتی مکالمہ ہے)، مسجد قرطبہ۔ایک سلسلہ خیال کے تعاقب میں۔

اسی کتاب (اقبال۔فکروعمل) کی توسیع شدہ صورت ،نئے نام؛ (اقبال کا فکری نظام اور پاکستان کا تصور، (صفحات: ۲۳۶) سنگ میل سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی ہے۔نئ کتاب میں تین مقالات: علامہ اقبال اور مولانا مدنی، علامہ اقبال اور پنڈت نہرو، علامہ اقبال اور مولانا آزاد شامل ہیں، ضمیمہ جات میں بھی ایک نیا مضمون جھلکیاں از سلیم احمد کا اضافہ کیا گیا ہے۔نئ کتاب کے آغاز میں مصنف کے ایک شذرے پر ۲۰۰۲ء کی تاریخ رقم ہے۔ یہ نئ کتاب سال اقبال کی مناسبت سے شائع کی گئی ہے۔اقبال۔فکروعمل، پہلی بار بزم اقبال لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔(اور بزم اقبال کی دیگر کتابوں کی طرح ٹائپ میں چھپی تھی)

فتح محمد ملک، ''اندازِ نظر''،صفحات:۱۷۸،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۹ء

اندازِ نظر پہلی بار ''التحریر'' لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ بقول مصنف: ''اس کتاب کے بیشتر مشمولات،

چاہے وہ مضمون کی صورت میں ہوں، شذرہ کے انداز میں ہوں یا تبصرہ کی شکل میں، اپنی اولین اشاعت پر ہنگامہ خیز ثابت ہوئے تھے''۔ (سرآغاز، ص ۷)

خصوصاً ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہونے والا مضمون ''تمیز دار بہو کی بدتمیزی'' خاصا موضوع بحث بنا اور مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' کا تجزیہ بے حد متنازع ثابت ہوا۔ مصنف کے دیباچے سرآغاز، (مرقوم: ۱۹۸۰ء) کے مطابق زیر نظر مجموعہ پندرہ برسوں کی مختلف اور منتشر تحریروں پر مشتمل ہے۔

کتاب کے پہلے حصے ''تہذیب و تخلیق'' میں: غالب اور ہمارا شعور قومیت، محمد حسین آزاد کا طرز احساس اور تمیز دار بہو کی بدتمیزی کے علاوہ قدرت اللہ شہاب کا افسانہ، محمد علی جوہر کی غزل، خلیفہ عبدالحکیم کا مطالعہ رومی، احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری اور باقی صدیقی کی غزل گوئی موضوع بنی ہے۔ دوسرے حصے ''مشرق اور مغرب کی ادبی رفاقت'' میں دانتے، اسلام اور یورپ کا ذہنی جمود کے علاوہ رالف رسل کی اردو نوازی، اینا میری شمل اور پاکستانی ادب اور سوویت یونین میں اقبال شناسی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے ''بین السطور'' میں مختار مسعود، سجاد ظہیر، سہیل بخاری اور عابد علی عابد پر مضامین کے علاوہ عصری ادب اور افریشائی شعور اور ملفوظاتِ فیض کے عنوان سے بھی دو مضمون ہیں۔ چوتھے حصے ''برسبیل تبصرہ'' میں فراق کی مکتوباتی تنقید، عبدالعزیز خالد کی تین کتابوں، احمد فراز کے ''دردآشوب''، حنیف رامے کے ''خواب و خیال''، ضمیر جعفری کے ''ماضی الضمیر'' ابن انشاء کے سفر نامہ چین اور اقبال کی نظموں (خضر راہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ) پر تبصرہ و تجزیہ موجود ہے۔

فتح محمد ملک، ''تحریک آزادی کشمیر۔ اردو ادب کے آئینے میں''، صفحات: ۳۱۲، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

یہ مجموعہ شعر و نثر اردو ادب کا کشمیر نامہ ہے۔

اس مجموعے کے باعث کشمیر سے اردو ادیبوں اور شاعروں کا تعلق اور لاتعلقی دونوں ہی واضح ہو رہی ہیں۔ لاتعلقی کے حوالے سے اشفاق احمد کا اس مجموعے میں شامل افسانہ ایک ''اقبالی گواہ'' بن کر سامنے آیا ہے؛ یہ افسانہ پاک و ہند کے معاصر ادب پر ایک تخلیقی نوعیت کا بھرپور طنز ہے۔ مجموعے میں کشمیر کے مصائب اور تحریک آزادی کی شدت وحدت کو فکری و فنی اظہار دینے والے مقالے، نظمیں، سفر نامے، افسانے اور طنزیہ مضامین شامل ہیں۔

مقالات میں فتح محمد کا مقالہ: ''تحریک آزادی کشمیر۔ اردو ادب کے آئینے میں'' اولین بھی ہے اور اہم بھی۔ اس کے علاوہ فتح محمد ملک کے تین اور مقالے: ''اقوام متحدہ بطور موضوع سخن۔ جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟''، ''فیض اور تحریک آزادی کشمیر'' اور ''راجندر سنگھ بیدی کی ایک کہانی'' بھی مجموعے میں شامل ہیں۔ غلام نبی خیال کا مقالہ ''اقبال اور تحریک آزادی کشمیر'' کہ مفصل بھی ہے اور مبسوط بھی، اس حصے کی توقیر ہے۔

طویل منظومات کے عنوان سے علامہ اقبال، صفدر میر اور اصغر عابد کی نظمیں ہیں جو کشمیر کا وسیع تناظر سامنے لاتی ہیں۔ سفرنامہ، آپ بیتی اور طنز و مزاح کے حصے میں قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، محمود ہاشمی اور سید محمد جعفری کی کشمیر کے حوالے سے تخلیقات موجود ہیں۔ افسانے: راجندر سنگھ بیدی، عطیہ سید، سعادت حسن منٹو، اشفاق احمد اور رشید امجد کے ہیں۔ نظموں کے باب میں درج ذیل شعرا کی نگارشات شامل ہیں:

جوش، حفیظ، ندیم قاسمی، مجید امجد، فراز، جالب، عزیز حاصل پوری، نعیم صدیقی، جعفر طاہر، انجم رومانی، شان الحق حقی، ظہیر کاشمیری، منظور عارف، افتخار عارف، امجد اسلام امجد، احمد شمیم، سید عارف، یونس متین، عائشہ مسعود ملک، جنید آذر، آل عمران۔

مصنف کے پیش لفظ پر ۵ فروری ۲۰۰۱ء ثبت ہے جو یوم یکجہتی کشمیر ہے۔

فتح محمد ملک، ''تحسین و تردید''، صفحات: ۳۰۳، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

اس مجموعے میں فتح محمد ملک کے مختلف موضوعات پر بتیس تنقیدی مضامین ہیں، اکثر کا تعلق عصری پاکستانی ادب سے ہے۔

اس مجموعے میں اقبال (مسجد قرطبہ)، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور (آنگن)، غلام عباس، انتظار حسین، مسعود مفتی (ریزے)، خالدہ حسین، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، منظور عارف، احمد فراز، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، راجندر سنگھ بیدی، صدیق سالک (میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، پریشر ککر)، صفدر میر، اختر حسین جعفری، منیر نیازی، محمد کاظم، محمد عمر میمن، عطاء الحق قاسمی، عزیز احمد اور فراق پر کچھ تفصیلی، کچھ مختصر مضامین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ''جدیدیت کا عصری روپ''، ''نیا طرز احساس''، ''مئی کا آن پہنچا مہینہ (سن ستاون کے حوالے سے)''، ''ادیب اور مملکت''، ''ایران: ادب کے آئینے میں''، ''فلسطین: اردو ادب میں''، ''منصور حلاج: ایک زندہ و منور استعارہ''، اور ''میہائی ایمی نیسکو: دنیائے مغرب کا مشرقی شاعر''، کے عنوان سے مبسوط اور فتح محمد ملک کے فکری ریاض اور مخصوص تنقیدی اسلوب کے حامل مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔

فتح محمد ملک، ''تعصّبات''، صفحات: ۳۵۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

یہ کتاب فتح محمد ملک کے قومی شعور اور ملی احساس کے تحت لکھے گئے ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ (''تعصّبات'' پہلی بار مکتبہ فنون کے زیر اہتمام ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی اور صفحات ۳۵۱ تھے)۔ کتاب کے ابتدائیے (مرقوم: ۱۹۷۳ء) میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب میں شامل مضامین جس زمانے میں (۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۳ء تک) وقتاً فوقتاً ضبطِ تحریر میں آتے رہے وہ زمانہ ہماری تہذیبی اور فنی زندگی میں سامراجی اور نوآبادیاتی مقاصد کے فروغ بے مثال کا منظر پیش کرتا ہے.... اس لیے ان مضامین میں ہمارے قومی مسائل اور ماضی قریب کی ادبی و فکری تحریکیں بار بار زیر بحث آئیں''۔ (ص ۱۰، ۱۱)

کتاب دوحصوں میں تقسیم ہے: پہلے حصے ''ادب، تہذیب اور آزادی'' کی فہرست ابواب یہ ہے: ہماری قومی زندگی اور ادیب، تحریک آزادی میں ادیب کا حصہ، خیال کا خوف، اقبال کے خلاف ردِعمل کیوں؟ نئی شاعری اور جدید شاعری، شاعری اور ناشاعری، غزل اور نئی غزل، افسانہ اور نیا افسانہ۔ دوسرے حصے کا عنوان ہے: ''غالب سے منیر نیازی تک'' اس میں غالب، اقبال، ندیم، فیض، میراجی، مختار صدیقی، ضیاء جالندھری اور منیر نیازی کی شاعری کا مختلف فکری حوالوں سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

فتح محمد ملک، ''فلسطین اردو ادب میں''، صفحات: ۲۵۵، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

اس کتاب میں اردو ادب سے ایسے مقالات، افسانے، سفرنامے اور نظمیں منتخب کر کے شامل کیے گئے ہیں جو مسئلہ فلسطین اور اہل فلسطین کے مصائب اور جدوجہد کے حوالے سے ہیں۔ ضمیمہ جات میں اسی مسئلے کے حوالے سے علامہ اقبال کا ایک بیان اور خط، کل ہند مسلم لیگ کی ۱۹۳۷ء کی ایک قرارداد اور ایک ۱۹۳۸ء کا میمورنڈم شامل ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار مطبوعات حرمت راولپنڈی سے فروری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ فتح محمد ملک نے اپنے دیباچے (حرفِ اول) میں بتایا:

> ''اس کتاب میں تحریک آزادی فلسطین کے ہر اہم مرحلے پر پیدا ہونے والا تخلیقی ادب موجود ہے.... فلسطینوں کی تحریک مزاحمت جاری ہے اور ہمارا ادیب اس تحریک میں تخلیقی سطح پر شریک ہے۔ سو تحریک کے ساتھ ساتھ تخلیق بھی لہر در لہر اپنا جلوہ دکھا رہی ہے''۔ (ص ۷)

مقالات کے باب میں: فیض، ڈاکٹر اسماء رشید، محمد کاظم اور فتح محمد ملک کے پرمغز مقالے موجود ہیں۔ (ڈاکٹر اسماء رشید کا مقالہ طبع اول میں شامل نہیں تھا)۔ افسانوں کے حصے میں: قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، قدرت اللہ شہاب، مظہر الاسلام اور سمیع آہوجہ شامل ہیں (قرۃ العین کا افسانہ پہلے ایڈیشن میں نہیں تھا)۔ سفرنامے: فیض اور مستنصر حسین تارڑ کے ہیں۔

شاعری کے باب میں: اقبال، راشد، فیض، ندیم قاسمی، ابن انشاء، یوسف ظفر، ادا جعفری، منظور عارف، حبیب جالب، فراز، ضمیر جعفری، خاطر غزنوی، شہزاد احمد، صلاح الدین پرویز، احمد شمیم، محمود شام، نذیر قیصر، صلاح الدین محمود، شورش ملک، حسن عباس رضا، سلطان رشک، صفدر ہمدانی، بلقیس محمود، طاہر حنفی، محمد فیروز شاہ، زاہد ملک، ڈاکٹر ایوب مرزا اور راشد حسن رانا کی پابند، آزاد اور نثری نظمیں شامل ہیں۔

اتنے ڈھیروں ناموں سے ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ تحریک فلسطین ہمارے تخلیق کاروں کا ذاتی، فکری، قلبی اور روحانی مسئلہ ہے اور ان کی تخلیقات میں کسی نہ کسی صورت ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

فتح محمد ملک، ''فیض۔ شاعری اور سیاست''، صفحات: ۱۸۷، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

ہر دل عزیز شاعر فیض احمد فیض کے سیاسی نظریات ہمیشہ زیر بحث رہے ہیں۔ فتح محمد ملک نے اپنی اس کتاب میں فیض کی ''شعری

ونثری تخلیقات اورفیض کے اپنے بیانات ومکالمات'' سے فیض کی سیاسی فکرکو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے دیباچہ (برسبیل تذکرہ) میں فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''یہ کتاب فیض کے شعری اور سیاسی مسلک کو سمجھنے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔ فیض شناسی کے اس عمل میں، میں نے فیض کے بارے میں ادبی اور سیاسی رائے عامہ سے کم سروکار رکھا ہے اور خود فیض کی شعری ونثری تخلیقات اور فیض کے اپنے بیانات ومکالمات سے زیادہ اعتنا کیا ہے''۔
(ص ۷)

فتح محمد ملک نے اس کتاب میں فیض کے دینی پس منظر، صوفیانہ مزاج اور پاکستان اور عالم اسلام کے حوالے سے اضطراب کو شعری، نثری اور تقریری حوالوں سے روشن کر کے یہ رائے قائم اورظاہر کی ہے۔

''درحقیقت فیض بھی مولانا حسرت موہانی کے انداز کے اشتراکی تھے۔ نہ تو ان کی اشتراکیت کا دہریت سے کوئی علاقہ تھا، نہ روایت شکنی سے کوئی نسبت اور نہ ہی اپنی اسلامی شناخت سے حجاب۔ اپنی منفرد دینی شناخت سے ہی فیض ''اصلی کامریڈ'' کا مقام پا سکے تھے۔ ایک ایسے اشتراکی کا مقام جس کا ذاتی نصب العین درویشی تھا تو اجتماعی مسلک انقلاب!'' (ص ۳۵)

کتاب کے ابواب یہ ہیں:۔ ۱۔صوفی مومن اور اشتراکی مسلم۔ ۲۔قصہ سازشِ اغیار (راولپنڈی سازش کیس) ۳۔لیلائے وطن۔(۱) ۴۔لیلائے وطن۔(۲)۔ ۵۔رزمیہ آہنگ۔ ۶۔دشتِ تنہائی۔ ۷۔اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو ۸۔حمد باری ''فیض۔شاعری اور سیاست'' سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

فرزانہ سید، ''نقوش ادب''، صفحات: ۵۰۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

کتاب کے تعارف (مرقومہ ۱۹۸۴ء) میں فرزانہ سید نے لکھا ہے کہ ''کتاب ہذا میں یہ انداز اور اسلوب اپنایا گیا ہے کہ ہر شاعر یا ہر ادیب کو ایک ہی طرح کے سانچوں سے نہ ماپا تولا جائے، بلکہ ہر شاعر اور ہر ادیب کے معیار مقرر کرنے کی غرض سے دیکھا جائے کہ اس کی تخلیقات اور نگارشات کے حوالے سے کون سا پیمانہ اور سانچہ صحیح معیار قائم کر سکے گا''۔ (ص ۷، ۸)

نقوش ادب میں اردو کے قدیم وجدید نثر نگار اور شعراء کے مختصر حالات زندگی، فکر واسلوب اور ادبی مقام ومرتبہ کو اختصار لیکن ضروری تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ اور پڑھے جانے کی خوبی سے متصف ہے۔ یہ کتاب مختلف درجوں کے طلبہ کی نصابی ضروریات اور قارئین ادب وتنقید کی ابتدائی طلب کو بہ خیر وخوبی پورا کرتی ہے۔ (کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہونا اس بات کا ثبوت ہے)

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر،''فن تاریخ گوئی اوراس کی روایت''، صفحات: ۱۶۷، سن اشاعت ندارد

کتاب کے مختصر دیباچے''کتاب سے پہلے'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں: ''تاریخ گوئی کا فن اوراس سے دلچسپی ہماری ادبی روایت کا اہم حصہ ہے۔ بیشتر اہم واقعات کی تاریخیں، ہمارے یہاں اسی فن کی معرفت محفوظ ہیں''۔(ص۴) فرمان فتح پوری نے اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ۱۹۸۲ء میں ''نگار'' کا فن تاریخ گوئی نمبر نکالا، بعدازاں اس نمبر کی نایابی کے سبب اسے کتابی شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ کتاب پر تاریخ اشاعت نہیں ہے البتہ فرمان فتح پوری کے دیباچے''کتاب سے پہلے'' کے آخر میں ۲۳/ مارچ ۱۹۸۴ء کی تاریخ رقم ہے۔ ضابطے کے صفحے پر لکھا ہے: ''سید اختر حسین نے ایجوکیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کی'' جبکہ اندرون سرورق پر ناشر کے طور پر سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کا نام درج ہے۔ فہرست مضامین یہ ہے: فن تاریخ گوئی، اصول ومسائل۔ تاریخ گوئی سے متعلق ذخیرہ کتاب۔ ہم عدد الفاظ۔ لغات الاسماع اعداد۔

فریدہ ناز، پروفیسر،''قدرت اللہ شہاب۔ زندگی اورادب''، صفحات: ۴۰۷، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

''قدرت اللہ شہاب۔ زندگی اورادب'' پروفیسر فریدہ ناز کا ایک مبسوط تحقیقی مطالعہ ہے اور قدرت اللہ شہاب کی سوانح، افسانہ نگاری اور خودنوشت''شہاب نامہ'' کا تنقیدی تجزیہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ پروفیسر فریدہ ناز نے نہایت دیانت سے اپنے فکری نتائج مرتب اور قرینے سے پیش کیے ہیں۔ اس مقالے کے پانچ ابواب ہیں جن کے عنوان یہ ہیں:

حالات زندگی، افسانوں کا تجزیہ، غیرافسانوی تحریروں کا جائزہ، شہاب نامہ، شخصیت اورادبی مقام۔

آخر میں تین ضمیمے ہیں: سرکاری دستاویزات، قدرت اللہ شہاب کے ایک انٹرویو سے اقتباسات اور چند رواتی کا قصہ۔

قدرت اللہ شہاب کی زندگی کے چند واقعات اور''شہاب نامہ'' کے متعدد حصے خاصے نزاعی ہیں۔ پروفیسر فریدہ ناز نے ان سب کا تجزیہ نہایت احتیاط سے کیا ہے؛ ان کے چند تحقیقی نتائج سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن ان کے جائزے اور معروضی اسلوب کی تحسین ضروری ہے۔

قاضی جاوید،''پاکستان میں فلسفیانہ رجحانات''، صفحات: ۲۶۳، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

قاضی جاوید برصغیر اور پاکستان کے فکری تسلسل پر نگاہ رکھنے والے دانشور ہیں انہوں نے پاکستان میں فلسفیانہ رجحانات کا نہایت منطقی اور تخلیقی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اس مجموعے میں درج ذیل عنوانات کے تحت تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ قومی مسائل کے بارے میں۔ ۲۔ پاکستان میں اشتراکی رجحانات۔ ۳۔ وجودیت اور پاکستانی دانشور۔
۴۔ نتائجیت اور پاکستانی فلسفہ۔ ۵۔ منطقی ایجابیت اوراس کے اثرات۔ ۶۔ تاریخ کی فکریات۔ ۷۔ جمالیات کے مسائل۔

۸۔علیت کا مسئلہ۔۹۔میاں محمد شریف۔۱۰۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔۱۱۔ڈاکٹر گوند چندر دیو۔۱۲۔فلسفے کی قومی روایت کا احیاء

اس کتاب میں زیر بحث مختلف تصورات اور رجحانات نے اردو کے تخلیقی اور تنقیدی ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں لیکن فاضل مصنف نے ان تصورات ور جحانات کو ادبی زاویے سے نہیں، زیادہ تر سیاسی وسماجی حوالے سے موضوع بنایا ہے۔

کشور ناہید، (مترجم)، ''باقی ماندہ خواب''، صفحات: ۳۴۴، سن اشاعت ندارد،

''باقی ماندہ خواب'' عالمی ادب کی نامور اور رجحان ساز شخصیات کے مضامین، لیکچرز، انٹرویوز، مختلف کتب کے ابواب اور تخلیقی مجموعوں کے ابتدائیوں کے تراجم پر مبنی ایک ضخیم اور اہم مجموعہ ہے۔کشور ناہید اپنے دیباچے (حرف بشارت) میں لکھتی ہیں: ''باقی ماندہ خواب'' میرے ہیں۔جو ادب کی نامور شخصیات کے حوالے سے میں نے اپنے ذہن میں بولتے محسوس کیے اور بحوالہ فن و ادب مرتسم کیے''۔ (ص ۶، تاریخ تحریر: ۱۸ جون ۱۹۸۲ء) کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے:

> ''اس کتاب کے حوالے بہت منتشر ہیں۔ بے شمار رسالوں، کتابوں، پمفلٹوں اور خودنوشتوں سے اس کتاب کا خمیر بنتا ہے.... مقصود یہ ہے کہ ان ادبا کے حوالے سے ہمارے اور ان کے عہد کا سماجی اور ادبی منظر نامہ مرتب ہو سکے''۔

کتاب میں شامل مضامین کے عنوان (اور مصنفین کے اسمائے گرامی) درج ذیل ہیں:

ادب میں متاثر ہونے سے کیا مراد ہے؟ (آندرے ژید)، ادبی شخصیات اور مناظر فطرت (لارنس ڈریل)، تنقید اور شاعری (کارل شاپیرو)، ذاتی واردات۔تسلیماتی شاعری (اینا سیکسٹن)، ضیافت انصاف (یوتے شنکو)، شعر میں نثر کی روایت (ایذرا پاؤنڈ)، الفاظ (ژین۔پال۔سارتر)، حکم بردار لڑکی کی یادداشتیں (سیمون۔ڈی۔بوار)، شاعری اور تاریخ (اکتاویو پاز)، ڈائری کے چند اوراق (یوجین آئنسکو)، تین آوازیں (البرٹ کامیو)، شعلہ فشاں دل کے ساتھ (رسول حمزہ)، پڑھنے کی آزادی کی مدافعت (ہنری ملر)، بری شاعری سے کیا مراد ہے؟ (ہرمن ہیسے)، شاعری کا فن (ڈیلن تھامس)، خیالات اور ناول (سال بیلو)، میں اور میرا فن (جارج لوئیس بورخس)، کشش جنس بمقابل خوبصورتی (ڈی۔ایچ۔لارنس)، فن اور تہذیبی ارتقا (آندرے مالرو)، فنکار اور دنیا (چنگیز اتماتوف)، افسانے کا فن (برنارڈ ملامود)، کچھ باتیں (پاسترناک)، شاعری میرا پیشہ ہے (پابلو نرودا)، فکشن کا فن (جین کوکتو)، ادیب کی ذمہ داری (ولیم فاکنر)، روایت اور انفرادی ذہانت (ٹی۔ایس۔ایلیٹ)، اور یہ میں ہوں (اینا اخماتووا)، میرا عہد اور میں (ولاڈی میر نابوکوف)، (۱) زندہ رہنے کا فن، (۲) آمر کی خصوصیات، (۳) آمر کی خصلت (سی۔جی۔یونگ)، خواب اور تخلیق کا رشتہ (انائس نن)، جب ہم مردے زندہ ہوتے ہیں (ایڈرن رچ)، پکاسو کے فن میں عورت (فرانسوئس جلٹ)، اعتراف کی شاعری یا خودکلامی (چارلس مولز ورتھ)، ادیب اور منفعت (رابرٹ گریوز)، شاعر اور زمانہ (آرکیبالڈ میکلیش)، تحریر (ڈبلیو۔ایچ۔آڈن)، فلم اور تخلیق (فرانسوا ساگاں)، جہاں

ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے (معین بسیسو)،تخلیقی فعالیت (ایریکا ژونگ)، شاعراورشاعری میری نظرمیں (رچرڈ ایب برٹ)، میری شاعری اپنے آپ کومنوالے گی (میرینا تسوناپاوا)، پاپا ہیمنگوے (جارج۔ ایچ۔ ہیمنگوے)۔

کلثوم نواز، ’’رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور‘‘، صفحات:۱۲۴، زیرنظر ایڈیشن:۱۹۸۵ء

زیرنظر کتاب ’’رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور‘‘ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تہذیب کی ماہیت اور دہلوی اور لکھنوی تہذیبوں کوموضوع بنایا گیا ہے اور رجب علی بیگ سرور کے تہذیبی شعور کی گہرائی اور وسعت کا تجزیہ کیا گیا ہے؛ دوسرے باب میں رجب علی بیگ سرور کے حالات زندگی پیش کیے گئے ہیں؛ تیسرے باب میں سرور کی تصانیف اوران میں موجود تہذیبی شعور کی جھلکیوں کوموضوع بنایا گیا ہے؛ چوتھا باب سرور کی مکتوب نویسی کے تجزیے کے لیے مختص ہے؛ پانچواں باب ’’اختتامیہ‘‘ ہے جو حاصل مطالعہ کونہایت اختصار سے پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے مقدمے میں زیرنظر تصنیف کوسراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’یہ کتاب اودھ اور خصوصاً لکھنو کے تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں لکھنو کے رہن سہن، آداب معاشرت اور ذہنی وفکری ماحول کی چلتی پھرتی تصویریں بے نقاب نظر آتی ہیں‘‘۔ (ص۱۲)

کلثوم نواز کے تحقیقی نتائج اہم اوران کی پیشکش کا انداز بہت موزوں ہے۔

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، (مرتب)، ’’ادب کا بدلتا منظر نامہ۔ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ‘‘، صفحات:۵۴۳، زیرنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

زیرنظر مجموعہ اردو اکادمی دلی کے کل ہند سیمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مبنی ہے۔ جس کا اہتمام گوپی چند نارنگ نے کیا تھا اور اس کا موضوع تھا ’’ادب کا بدلتا منظر نامہ: مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں‘‘۔ اس سیمینار میں ناقدین نے مابعد جدیدیت پر مقالے پڑھے اور تخلیق کاروں نے اپنے تخلیقی محرکات اور عمومی ادبی فضا پر اظہارِخیال کیا۔

کتاب کا پہلا حصہ ’’مابعد جدیدیت: فکریاتی مباحث‘‘ ہے اوراس میں گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، ستیندر سنگھ نور، دیوندر اسر، سدھیش پچوری، فہیم اعظمی، قمر جمیل، شکوہ محسن مرزا کے مقالات شامل ہیں۔ دوسرے حصے ’’مابعد جدید اردو غزل‘‘ میں سید محمد عقیل، عشرت ظفر، شہپر رسول، خالد عبادی، امتیاز احمد اور تیسرے حصے مابعد جدید اردو نظم میں حامدی کاشمیری، شاہد کلیم، شین کاف نظام، عزیز پریہار کے مقالات موجود ہیں۔ چوتھے حصے ’’مابعد جدید اردو ناول‘‘ میں بلراج کومل، انیس رفیع اور انور خان؛ پانچویں حصے ’’مابعد جدید اردو افسانہ‘‘ میں سید محمد اشرف، شوکت حیات، طارق چھتاری؛ چھٹے حصے مابعد جدید اردو تنقید میں ابوالکلام قاسمی، شافع قدوائی اور نظام صدیقی کے مقالات ہیں۔ ’’میرے تخلیقی محرکات اور آج کی ادبی فضا‘‘ کے عنوان کے تحت بائیس تخلیقی فنکاروں نے اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علاوہ ازیں کئی مشاہیر کے اقتباسات اور آرا شامل ہیں۔ ضمیمے کے طور پر سدھیش پچوری کا مقالہ ’’ہندی میں مابعد جدیدیت‘‘

بھی موجود ہے۔

گوپی چند نارنگ، ''ادبی تنقید اور اسلوبیات''، صفحات:۴۰۰، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

اسلوبیات کے حوالے سے نظری اور عملی تنقید، اس ضخیم مجموعے کی خصوصیت ہے۔ کتاب کے دیباچے (مرقوم:۱۹۸۹ء) میں گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''مجموعے میں صرف وہ مضامین شامل ہیں جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلوبیات سے مدد لی گئی ہے...... اسلوبیات سے ادب کی افہام و تفہیم اور تحسین کاری کے کام میں جو مدد مل سکتی ہے، وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں...... زیرِ نظر مجموعے میں...... بیس پچیس برس کے ذہنی سفر کے نشاناتِ راہ ملیں گے''۔ (ص ۵، ۶، ۷)

کتاب کا پہلا باب ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' ہے؛ اس میں بقول گوپی چند نارنگ اسلوبیات کے نظریاتی ماڈل کی وضاحت کی گئی ہے (ص ۶) دیگر ابواب میں میر تقی میر، میر انیس، اقبال، فیض، جمیل الدین عالی، شہریار، بانی، ساقی فاروقی، افتخار عارف کی شاعری اور خواجہ حسن نظامی اور ذاکر صاحب کی نثر کا اسلوبیات کی مدد سے تجزیہ کیا گیا ہے؛ ایک مضمون نثری نظم کی شناخت کے حوالے سے ہے۔

اسلوبیات اردو تنقید کے لیے ایک نیا زاویہ اور ایک نیا طریق ہے؛ گوپی چند نارنگ: نظری حوالے سے اس کی توضیح اور عملی حوالے سے اس کے اطلاق کی قابلِ ذکر مثالیں پیش کر چکے ہیں۔

گوپی چند نارنگ، پروفیسر، (مرتب)، ''اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل''، صفحات:۷۲۸، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

یہ ضخیم مجموعہ اردو افسانے کے حوالے سے ان مقالات پر مشتمل ہے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۰ء میں منعقدہ ہندو پاک اردو افسانہ سیمینار میں پڑھے گئے۔ اس مجموعے کو اردو افسانے پر ایک مکمل اور مبسوط کتاب بنانے کے لیے سیمینار کے علاوہ بھی دیگر منتخب مضامین (ماخذ کے حوالے کے ساتھ) شامل کر لیے گئے ہیں۔

مجموعے کا آغاز گوپی چند نارنگ کے ابتدائیے، انور جمال قدوائی (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے صدارتی کلمات اور راجندر سنگھ بیدی کے (بطور مہمان خصوصی) خطبے: ''افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل'' سے ہوتا ہے۔

باقی مجموعہ درج ذیل عنوانات کے تحت چار حصوں میں تقسیم ہے:

۱۔ اردو افسانہ۔ فن، تکنیک، روایت، ۲۔ پریم چند: فکر و فن ۳۔ عہد ساز افسانہ نگار: منٹو، کرشن، بیدی، عصمت، قرۃ العین حیدر۔ ۴۔ نیا افسانہ۔ مسائل اور تجزیہ۔

پہلے حصے ''اردو افسانہ۔ فن، تکنیک، روایت'' میں شامل مقالات یہ ہیں:

ناول اور افسانے میں تکنیک کا تنوع۔ ممتاز شیریں، اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر، ممتاز شیریں، اردو میں افسانہ نگاری، آل احمد سرور، افسانے کا فن، وزیر آغا، اردو افسانے کے تین دور۔ وزیر آغا، افسانے کی حمایت میں۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔

دوسرے حصے میں پریم چند کے فکر وفن کے حوالے سے درج ذیل ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے:

مسعود حسین، احتشام حسین، گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، شمیم حنفی۔

تیسرے حصے ''عہد ساز افسانہ نگار'' میں منٹو کے حوالے سے ممتاز شیریں، حسن عسکری، وارث علی اور محمد یوسف ٹینگ کے مقالات ہیں؛ کرشن چندر پر وارث علوی، حامدی کاشمیری اور عظیم الشان صدیقی نے روشنی ڈالی ہے؛ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر آل احمد سرور، باقر مہدی اور گوپی چند نارنگ نے اور عصمت چغتائی کے فن پر فضیل جعفری نے اپنے تنقیدی مطالعے پیش کیے ہیں؛ قرۃ العین حیدر کے فن افسانہ پر محمود ہاشمی اور وحید اختر کے مقالات ہیں۔

چوتھے حصے ''نیا افسانہ۔ مسائل اور تجزیہ'' میں مقالات کی فہرست کچھ یوں ہے: نیا ادب اور پرانی کہانیاں۔ انتظار حسین، تخلیقی افسانہ کا فن۔ محمود ہاشمی، اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ: بلراج منیرا، سریندر پرکاش۔ گوپی چند نارنگ، پاکستان میں اردو افسانہ۔ وزیر آغا، پاکستان میں ۷۰ء کے بعد نئی اردو کہانی۔ احمد ہمیش، انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر۔ گوپی چند نارنگ، انور سجاد: انہدام یا تعمیر نو۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ہندوستان میں اردو افسانہ، دیویندر اسر، نیا اردو افسانہ: تفہیم اور تجزیہ۔ شمس الحق، نیا اردو افسانہ: ارضیت اور سماجی معنویت۔ قمر احسن، نیا افسانہ: اظہار کے چند مسائل۔ مہدی جعفر، جدیدیت کی نئی نسل میں رومانیت۔ لنڈا وٹنگ، آٹھویں دہائی کا افسانہ۔ شمس الحق، افسانہ اور چوتھا کھونٹ۔ انتظار حسین، افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ۔ شمس الرحمٰن فاروقی، جدید اردو افسانے کا ڈائیلیما۔ باقر مہدی، شاعری اور فکشن کی ٹوٹتی حد بندیاں۔ بلراج کومل، نیا افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحہ فکریہ۔

زیر نظر مجموعہ ''اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل''، قبل ازیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔

گوپی چند نارنگ، ''امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اشپرنگر''، صفحات: ۲۳۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

فارسی کے عظیم اور اردو کے اولین شاعروں میں ایک امیر خسرو کا اردو (یا ہندوی) کلام مرتب صورت کے بجائے سنی سنائی روایت کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی مسئلے کو جاننے کی کاوش ہے کہ امیر خسرو سے منسوب کلام میں سے کون سا اُن کا ہے اور اس کی تحریری اور لسانی شہادت کیا ہے؟۔ کتاب میں مقدمہ اول ''امیر خسرو کا ہندوی کلام اور استناد کا مسئلہ'' ہے جو کہ بقول نارنگ صاحب: ''۱۹۷۴ء میں لکھا گیا اور ترقی اردو بورڈ (ہند) کی کتاب ''خسرو شناسی'' میں تقریباً بارہ برس پہلے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا''۔ (ص۷۳) مقدمہ دوم اشپرنگر کے نسخے کے تعارف اور دیگر مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ اشپرنگر ایک جرمن تھا اور مشرقی ادبیات میں دلچسپی رکھتا تھا، اسے شاہانہ اودھ کے ذخیرہ کتاب سے یہ نسخہ حاصل ہوا اور پھر بعد ازاں اس کے ہمراہ یہ نسخہ برلن جا پہنچا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے

اس نسخے تک رسائی حاصل کی اور تصحیح متن کے جدید اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اس نسخے کو تدوین اور اشاعت کا مرحلہ طے کیا۔ کتاب کے آخر میں چند ''اہل علم'' کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، صفحات: ۵۹۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

یہ کتاب ''نئی ادبی تھیوری'' کے مباحث کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ہے۔

نئی ادبی تھیوری کے مباحث میں ساختیات، پس ساختیات اور ردتشکیل نے زیادہ اہمیت حاصل کی ہے اور اردو تنقید کے سنجیدہ طالب علم ان تصورات کو سمجھنے کی کوشش میں ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے ان تصورات کو سمجھانے اور اردو کی عملی تنقید میں ان کی ترویج کے لیے اپنی مساعی جاری رکھی ہوئی ہے۔ کتاب کے پہلے حصے (ساختیات) میں درج ذیل ابواب ہیں:

۱۔ ساختیات اور ادب۔ ۲۔ ساختیات کی لسانیاتی بنیادیں۔ ۳۔ روسی ہیئت پسندی۔ ۴۔ فکشن کی شعریات اور ساختیات ۵۔ شعریات اور ساختیات۔

دوسرے حصے (پس ساختیات) میں:

۱۔ رولاں بارتھ: پس ساختیات کا پیش رو۔ ۲۔ پس ساختیات: لاکاں، فوکو اور کرسٹیوا۔ ۳۔ ژاک دریدا اور ردتشکیل۔ ۴۔ ردِتشکیل (۲) ۵۔ مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات۔ ۶۔ قاری اساس تنقید

تیسرے حصے (مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر) میں:

۱۔ سنسکرت شعریات اور ساختیاتی فکر۔ ۲۔ عربی فارسی شعریات اور ساختیاتی فکر، (اختتامیہ) صورتحال، مسائل اور امکانات۔ اور آخر میں ''فرہنگِ مصطلحات'' شامل ہے۔

گوپی چند نارنگ کا لکھا ہوا دیباچہ کتاب کے اندراجات کا تعارف اور نئی ادبی تھیوری پر مبسوط لیکن مختصر اظہار خیال ہے۔

گوپی چند نارنگ، ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ۔ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان''، صفحات: ۱۳۵، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

کتاب کے پیش گفتار (مرقومہ ۱۹۸۶ء) میں لکھا ہے کہ: ''زیر نظر تحریر کی نوعیت مذہبی نہیں ہے۔ میرا مسئلہ لسانی، ادبی اور تخلیقی ہے''۔ (ص ۱۵) گوپی چند نارنگ نے سانحہ کربلا کو بطور شعری استعارہ ایک تخلیقی رجحان جان کر نئے نتائج اردو تنقید کو دیئے ہیں اسی لیے وزیر آغا نے اپنے تاثرات میں لکھا کہ:

> ''ایک تو آپ نے ایک بالکل نئے میدان کو موضوع بنایا ہے، دوسرے تحقیق اور تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ نہ جانے آپ کی انگلیوں میں کیا جادو ہے کہ جس موضوع کو بھی چھیڑتے ہیں وہ پلک جھپکتے میں نغمہ سرا ہو جاتا ہے''۔ (ص ۱۳۱)

کتاب میں گوپی چند نارنگ نے رثائی ادب کی روایت اور واقعہ کربلا کے عظیم کرداروں پر روشنی ڈالنے کے بعد میر، غالب، جوہر، اقبال، جوش، فراق، یگانہ، فیض، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، مجید امجد، منیر نیازی، مصطفیٰ زیدی، جعفر طاہر، شہرت بخاری، احمد فراز، وزیر آغا، افتخار عارف، پروین شاکر، عرفان صدیقی وغیرہ کے ساتھ ہندوستان کے جدید شعراء کے ہاں سانحہ کربلا کے استعارے کی کارفرمائی کو موضوع بنایا ہے۔

محمد افضل، میاں، ''اقبال اور عالمی سیاسیات'' صفحات: ۱۶۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۷۸ء

کتاب کے موضوع اور مقصد کے بارے میں مصنف نے اپنے دیباچے میں لکھا:

''ہم نے اس کتاب میں، ہندوستان اور ہندو مسلم سیاست کے بارے میں اقبال کے موقف پر زیادہ بحث نہیں کی کیونکہ جیسا کہ کتاب کے موضوع سے واضح ہے، ہمارا مقصد صرف عالمی اور مشرق و مغرب کی سیاسیات کو فکرِ اقبال کی روشنی میں دیکھنا تھا''۔ (ص ۶)

کتاب کے ابواب کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے:

اقبال کا حقیقی پیام، اقبال کے ہاں اظہارِ خیال کا پیرایہ، اقبال کا سیاسی فلسفہ، دورِ اقبال میں عالمی سیاست، اقبال اور بین الاقوامی سیاست، چند عالمی سیاسی نظریات۔ فکرِ اقبال کے آئینے میں۔

محمد ریاض، ڈاکٹر، ''تقدیرِ اُمم اور اقبال'' صفحات: ۲۹۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۳ء

ڈاکٹر محمد ریاض کی زیرِ نظر کتاب علامہ اقبال کے حوالے سے ان کے سات مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے۔ مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

اقبال کی شاعری میں مکالماتی حسن، جاوید نامہ: شاعرِ مشرق کا شاہکار، تقدیرِ امم اور اقبال، خضر اور روایاتِ خضری۔ کلامِ اقبال میں، اقبال اور عاشقانِ رسولؐ، تصانیفِ اقبال کے دیباچے اور سرنامے، تلمیحاتِ انبیائے کرامؑ: تصانیفِ اقبال میں۔

ان تمام مضامین میں سب سے تفصیلی، پرمغز اور اہم ''جاوید نامہ: شاعرِ مشرق کا شاہکار'' ہے۔ مصنف، اقبال کی اردو شاعری کے ساتھ فارسی شاعری اور اسلامی تاریخ کے ساتھ تاریخ ہند پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

محمد ریاض، ڈاکٹر، صدیق شبلی، محمد، ڈاکٹر، ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' صفحات: ۲۵۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

یہ اردو میں فارسی ادب کی پہلی مختصر (لیکن معتبر) تاریخ ہے۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی کتاب کے ''پیش گفتار'' (مرقومہ ۱۹۷۴ء) میں لکھتے ہیں کہ:

''زیرِ نظر کتاب قدیم ترین ایام سے دورِ حاضر تک، ایران اور برصغیر پاک و ہند کے فارسی

ادبیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے مگر فارسی ادب کی قلمرو اس کتاب کے دائرہ کار سے کہیں زیادہ

وسیع ہے''۔(ص۹)

یہ کتاب ڈاکٹر محمد ریاض اور ڈاکٹر محمد صدیق شبلی کے اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہے اور فارسی زبان سے دلچسپی رکھنے والے اردو قارئین اور فارسی ادب کے طلبہ کے لیے ایک سودمند کوشش ہے۔

محمد سلیم، ڈاکٹر، ''علامہ اقبال کی سیاسی زندگی''، صفحات:۱۷۳، زیرنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

ڈاکٹر محمد سلیم بنیادی طور پر ماہر طبیعات ہیں اور قائداعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان سے فکری ربط اور قلبی تعلق رکھتے ہیں۔ ''داراشکوہ'' اور ''قائداعظم محمد علی جناح'' کے بعد انھوں نے زیرنظر کتاب تصنیف کی۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کے فکر اور شاعری پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جناب محمد احمد خان نے ایک ضخیم کتاب ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' کے نام سے لکھی ہے۔ مگر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی جو نہ صرف ان کی سیاسی زندگی پر ہو بلکہ جس سے ان کے سیاسی افکار، ان کا سیاسی عمل اور ان کا ویژن نکھر کر سامنے آ جائے۔ یہ کتاب اقبال کی سیاسی زندگی کے مطالعہ کی ایک ایسی ہی کاوش ہے'' (دیباچہ)

کتاب کے ابواب کی ترتیب یہ ہے:

ابتدائیہ، تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون، پنجاب کونسل کے انتخابات، جداگانہ انتخاب کا اصول، سائمن کمیشن، خطبہ الہ آباد، گول میز کانفرنسیں، تحریک کشمیر، ۱۹۳۷ء کے انتخابات اور اس کے بعد، برصغیر کے چند سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں۔

آخر میں کتابیات کے ساتھ ایک (شخصیات کے حوالے سے) اشاریہ بھی موجود ہے۔

محمد عثمان، پروفیسر، ''فکر اسلامی کی تشکیل نو''، (اقبال کے انگریزی خطبات کا ایک مطالعہ)، صفحات:۲۲۲، زیرنظر ایڈیشن ۱۹۸۵ء

''فکرِ اسلامی کی تشکیل نو'' علامہ اقبال کے شہرہ آفاق انگریزی خطبات کا ترجمہ بھی ہے اور تنقیدی مطالعہ بھی۔ اس کتاب سے اقبال کے بنیادی افکار کی تفہیم میں آسانی آئی ہے اور اردو کے قاری کے لیے، اقبال کے انگریزی خطبات کی گہرائی اور فکر انگیزی کو پورے طور پر محسوس کرنے کی ایک عرصے کے بعد سبیل پیدا ہوئی ہے۔ کتاب کے فلیپ پر صفدر میر کی رائے کچھ یوں ہے:

''اصل انگریزی کتاب جس قدر خیال انگیز ہے اسی قدر دقیق بھی۔ پروفیسر محمد عثمان کے اسلوب دلنشیں نے اقبال کے افکارِ عالیہ تک ایک عام پاکستانی اور اردو داں طبقے کی رسائی ممکن بنا دی ہے''۔

کتاب میں درج ذیل عنوانات کے تحت کل سات خطبے ہیں:

۱۔علم اور روحانی واردات ۔۲۔روحانی واردات کی فلسفیانہ پرکھ۔۳۔تصورِ باری تعالیٰ اور حقیقتِ نماز۔
۴۔انسانی انا: بقا اور اختیار، ۵۔اسلامی ثقافت کی روح، ۶۔اسلام میں اجتہاد، ۷۔کیا مذہب ممکن ہے؟
پروفیسر محمد عثمان نے حرف آغاز میں کہا ہے کہ ان موضوعات پر:

''جس علم وفضیلت، اعتماد ویقین، وسعت مطالعہ، گہرائی کی نظر اور قدرت بیان کے ساتھ علامہ نے گفتگو کی ہے، اس کی نظیر اسلامی لٹریچر کی گذشتہ کئی صدیوں میں نہیں ملتی''۔(ص۱۸)

محمود شیرانی، حافظ، ''سرمایہ اردو''، صفحات:۳۴۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''سرمایہ اردو'' ایک تاریخی حیثیت رکھنے والی نصابی کتاب ہے جسے حافظ محمود شیرانی نے میٹرک کے طلبہ کے لیے مرتب کیا تھا۔ اس میں شامل منتخب نثری اور شعری فن پارے حافظ محمود شیرانی کے ذوق نظر اور اس زمانے کے طلبہ کی ذہنی سطح کو واضح کرتے ہیں۔

زیرِ نظر ایڈیشن کے پیش لفظ میں ڈاکٹر صدیق جاوید نے بتایا کہ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام چھپی تھی اور اس کا آٹھواں ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں طبع ہوا تھا، وہی ایڈیشن اس تازہ ترین ایڈیشن کی بنیاد بنا ہے۔

مظفر عباس، ڈاکٹر، ''اردو کی زندہ داستانیں''، صفحات:۱۱۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

ڈاکٹر مظفر عباس کی زیرِ نظر مختصر تصنیف اردو میں داستان گوئی اور تین اہم داستانوں، ''سب رس''، ''باغ و بہار'' اور ''فسانہ عجائب'' کا تجزیاتی مطالعہ سامنے لاتی ہے۔ کتاب درج ذیل چار ابواب پر مشتمل ہے:

افسانوی نثر۔ پس منظر، پیش منظر، داستان کا فن اور اردو داستانیں، میر امن اور باغ و بہار، سرور اور فسانہ عجائب۔

کتاب کے پس سرورق پر ڈاکٹر روبینہ ترین اور ڈاکٹر سہیل احمد خان کی آرا درج ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ ترین لکھتی ہیں:

''اس کتاب میں ڈاکٹر مظفر عباس نے صرف اردو کی تین اہم داستانوں (سب رس، باغ و بہار، فسانہ عجائب) کو ہی اکٹھا نہیں کیا بلکہ دکن، دہلی اور لکھنو کے لسانی، تہذیبی و ثقافتی رنگوں کو بھی مجتمع کر دیا ہے''۔

کتاب کے آخر میں ایک مبسوط کتابیات بھی موجود ہے۔

معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر (مرتب)، ''بابائے اردو۔ احوال وافکار''، صفحات:۲۳۱، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۷۶ء

''بابائے اردو۔ احوال و افکار'' مختلف اہل نظر کے مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں مولوی عبدالحق کی زندگی، شخصیت، کار ہائے نمایاں، فکر وفن اور اردو زبان کی محبت وخدمت کو نہایت وضاحت اور گہرائی سے موضوع بنایا گیا ہے۔

بحیثیت مرتب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بتاتے ہیں:

''مولوی عبدالحق کی تیسری برسی کے موقع پر، اب سے گیارہ برس پہلے راقم الحروف نے بابائے اردو کے احوال وافکار کا ایک جائزہ مرتب کیا تھا جس میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء تک کے درمیان، مولوی عبدالحق کے بارے میں چھپنے والی کم وبیش سب سوانحی تحریریں اور تنقیدی آراسمٹ آئی ہیں...... ۱۹۶۴ء ہی میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کی طرف سے اس جائزے کی محدود کتابی اشاعت بھی عمل میں آئی...... بابائے اردو کی چودھویں برسی کے موقع پر جناب نیاز احمد کے زیراہتمام، اضافے اور ترمیم کے ساتھ کتاب کی دوسری اشاعت عمل میں آرہی ہے''۔

(حرفِ چند، ص۱۳، تاریخ تحریر: ۱۶۔اگست ۱۹۷۵ء)

اس مجموعے کے پہلے حصے ''حیات ومقصدِ حیات'' میں درج ذیل اہل قلم کے مضامین شامل ہیں:

پروفیسر سید محمد، شیخ چاند، مولانا سید عطاحسین، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ایم۔اے حفیظ گلشن آبادی، مولانا نصیرالدین ہاشمی، مولوی سید غلام ربانی۔

دوسرا حصہ مولوی عبدالحق کی سیرت وشخصیت کے حوالے سے وقف ہے اس میں درج ذیل اہل نظر کے مضامین شامل ہیں:

الیاس مجیبی، پنڈت ونشی دھرجی، سید احمد ندوی، محمود علی خاں جامعی، مولوی سید غلام ربانی، معین رزاق گوہر بخاری، پروفیسر ای۔ ای اسپیٹ، صدق جائسی، حکیم اسرار احمد کریوی، ڈاکٹر محمد داؤد رہبر، مولانا ارشد تھانوی، محمد احمد سبزواری

''شرف وافتخار''، ''فکر وفن'' اور ''ظن وتخمین'' کے عنوان سے تیسرے، چوتھے اور پانچویں حصے میں مولوی عبدالحق کے علمی، تحقیقی کارہائے نمایاں، فکری وفنی مقام اور اردو زبان کے لیے عظیم جدوجہد کے حوالے سے کئی مضامین شامل ہیں؛ چند ایک اہم لکھنے والوں کے نام ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

مولانا ہاشمی فرید آبادی، مولانا نصیرالدین ہاشمی، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، اسلوب احمد انصاری، سید عابد حسین، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر سیدہ جعفر، نواب منظور جنگ بہادر، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، جگن ناتھ آزاد، مرزا ادیب، سہیل عظیم آبادی، سید محمد تقی، رئیس امروہوی۔

چھٹے حصے میں درجنوں اہم سیاسی، علمی اور ادبی شخصیات کے تاثرات یکجا کیے گئے ہیں۔

مجموعے کا آخری حصہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی مرتب کردہ بابائے اردو کی ''آپ بیتی'' (مولوی عبدالحق کی کہانی، خود ان کی زبانی) پر مشتمل ہے۔''اشاریہ کتاب'' نہایت مفصل، مبسوط اور ہر طرح سے مکمل ہے۔

منیر احمد شیخ، ’’حرف بیاں‘‘، (مضامین، خاکے، ملاقاتیں)، صفحات: ۲۸۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

منیر احمد شیخ کی یہ کتاب ان کی تخلیقی، شگفتہ اور افسانوی نثر کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ اس کے پہلے حصے (زنجیر خیال) میں مضامین کہیں طنز و مزاح کے رنگوں سے عبارت ہیں اور کہیں واقعات کی دلچسپی لیے ہوئے ہیں؛ ان میں فکری عناصر اور ادب و ثقافت کے حالات حاضرہ بھی موجود ہیں۔ مضامین کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

موت، ادب اور دیو مالا، زیرو پوائنٹ، زخم کے بھرنے تلک، غالب نیشنل سنٹر میں، لاہور لیٹر، کیلنڈروں کی ایک نمائش پر، اقبال نمبر کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش پر، آپ سے کیا پردہ؟، تذکرہ دانش ورانِ عصر جدید۔

دوسرا حصہ خاکے/ ملاقاتیں کے عنوان سے ہے۔ اس میں اہل قلم، موسیقار اور ایک مصور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اہل قلم میں سے: منٹو، مختار صدیقی، ناصر کاظمی، فکر تونسوی، خوشونت سنگھ، موسیقاروں میں سے: روشن آرا بیگم، بھائی لال، رسولن بائی، امانت علی خاں، فتح علی خاں، زاہدہ پروین، منیر خاتون بیگم، غلام علی، سائیں مرنا اور مصور: صادقین پر کہیں خاکے، کہیں سوانح اور کہیں پر تجزیاتی مطالعے کے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخری حصہ ستمبر کا شہر تین مضامین: ’’نئیں ریساں شہر لہور دیاں‘‘، ’’ستمبر کا شہر‘‘ اور ’’سرخی شہر‘‘ پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے اپنے تاثرات، جذبات اور مختلف واقعات و شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ناہید قاسمی، ڈاکٹر، ’’ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ‘‘، صفحات: ۲۰۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

زیرِ نظر تجزیاتی مطالعے کے حوالے سے ڈاکٹر ناہید قاسمی لکھتی ہیں: ’’اس تجزیے سے میرا مقصد ندیم کی غزلیات میں افکار کے تنوع، احساسات کی رنگا رنگی اور منفرد، غیر پیچیدہ، پرکشش اسلوب اظہار کا اعتراف اور خوبیوں کی تحسین ہے‘‘۔ (پیش لفظ، ص ۱۱)

کتاب کے ابواب درج ذیل ہیں:

ندیم کی غزل میں خدا کا تصور، فلسفہ امید و جستجو، نظریہ شعر و فن، اردو غزل اور ندیم کی غزل، افکار و تصوراتِ کائنات و زمین، اسرارِ حیات، اظہارِ حالات و حقائق، تصور محبت، نظریہ انسانیت۔

تمام تجزیاتی مطالعوں میں مصنفہ نے اپنے موقف کی تائید میں احمد ندیم قاسمی کے اشعار بڑی تعداد میں درج کیے ہیں اور سلیس انداز میں ندیم کے فکر و فن کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

نفیس اقبال، ’’پاکستان میں اردو گیت نگاری‘‘، صفحات: ۳۴۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

زیرِ نظر کتاب نفیس اقبال کی اس تحقیق کا حاصل ہے جو انہوں نے گیت نگاری کے فن، اردو گیت کی روایت اور پاکستان میں اردو

گیت نگاری کے ارتقا کے حوالے سے کی ہے۔ کتاب درج ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

ا۔ گیت نگاری کا فن، موضوعات، روایات ۔۲۔ اردو میں گیت نگاری کی روایات ۔۳۔ پاکستان میں گیت نگاری کا دورِ اول۔

۴۔ پاکستان میں اردو گیت نگاری کا دورِ دوم ۔۵۔ پاکستانی گیتوں کا جائزہ اوران کی ادبی حیثیت۔

پاکستان میں دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں اردو گیتوں پر تحقیقی وتنقیدی کام کم ہوا ہے۔ نفیس اقبال کی کتاب نے اس کمی کو کسی حدتک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

نوید حسین، ڈاکٹر، (مرتب)، ''اقبال شناسی اور آغا صادق''، صفحات:۱۹۹، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''سرآغاز'' میں کتاب کے مرتب نے لکھا: ''آغا صادق کو علامہ اقبال سے کچھ اسی قسم کی نسبت تھی، جیسی حضرت علامہ کو مرشد رومی سے تھی''۔ (ص ۵) زیرِنظر ساری کتاب آغا صادق کی عقیدتوں کی شعری اور نثری تجسیم ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں: پہلے میں آغا صادق کے سات مضامین ہیں جو اقبال کے تصورات اور شاعرانہ حیثیت پر لکھے گئے۔ مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

انسان کامل اقبال کی نظر میں، فکر اقبال کے ماخذ، علامہ اقبال ایک فنکار کی حیثیت سے، اقبال کا مرکزی خیال۔ خودی، اقبال اور مناظر قدرت، اقبال کی شاعرانہ حیثیتیں، اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز۔

دوسرے حصے میں آغا صادق کی ایک پرانی شعری تصنیف ''زخمہ وساز'' مکمل صورت میں موجود ہے۔ ''زخمہ وساز''۔ اصل میں اقبال کی اہم نظموں اور غزلوں پر آغا صادق کی تضمینوں کا مجموعہ ہے۔

وحید عشرت، ڈاکٹر، (مرتب)، ''زمان ومکاں''، صفحات:۸۴۲، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

''زمان ومکاں'' مختلف اہم علم کے مقالات کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر منقسم ہے؛ پہلے حصے میں زمان ومکاں کے متعلق اردو زبان میں لکھے گئے یا ترجمہ کیے گئے مقالات ہیں؛ دوسرے حصے میں علامہ اقبال کے تصورِ زمان ومکاں پر مضامین ہیں۔

آغاز میں مرتب، ڈاکٹر وحید عشرت نے موضوع کا تفصیلی تعارف اور زمان ومکاں کے فلسفے پر اپنی رائے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اہم مقالات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ مجموعے کا دیباچہ فلسفے اور اقبالیات کے ممتاز استاد ڈاکٹر عبدالخالق نے لکھا ہے۔

حصہ اول۔ ''مباحث زمان'' میں درج ذیل اصحاب فکر ودانش کے مقالات شامل ہیں۔

پروفیسر ایم ایم شریف، امام فخر الدین رازی، عبدالحق خیر آبادی، علامہ حکیم سید محمد احمد مرحوم، علامہ سید برکات احمد، علامہ عزیز احمد، ملا صدرا، عبدالحمید کمال (۴ مقالات)، علامہ عتیق فکری، علامہ محمد اقبال، سید یحییٰ امجد۔

حصہ دوم۔ ''علامہ اقبال کا تصور زمان ومکاں'' میں مندرجہ ذیل دانشوروں کے مقالات موجود ہیں:

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر سید وحید اشرف، علی سردار جعفری، قاضی جاوید، سید بشیر الدین، عبدالرحمٰن طارق، اشفاق حسین، آ سی ضیائی، ایس ایم عمر فاروق، بشیر احمد ڈار، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر عالم خوندمیری۔

وحید قریشی، ڈاکٹر، ''باغ و بہار۔ایک تجزیہ''، صفحات:۱۱۴(دو صفحوں پر صحت نامہ)، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۶۸ء

''باغ و بہار۔ایک تجزیہ'' ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے میرامن کے فن اور باغ و بہار کے متن پر بڑی گہرائی سے نظر ڈالی ہے۔اپنے دیباچے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> ''میرامن کی شہرت کا مدار صرف اس کے اسلوب پر نہیں۔بعض دوسرے عناصر بھی اسے ایک اہم تصنیف بناتے ہیں...... رام بابو سکسینہ کی رائے میں بھی باغ و بہار کی مقبولیت کا اصل راز اس میں ہے کہ میرامن نے اس زمانے کے رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کے مرقعے نہایت وضاحت سے کھینچ دیئے ہیں۔باغ و بہار کی اس دو جہت اہمیت کی وضاحت کے لیے یہ کتابچہ تحریر کیا گیا ہے''۔(ص ۶، تاریخ تحریر: ۶ جنوری ۱۹۶۸ء)

''باغ و بہار۔ایک تجزیہ'' سنگ میل پبلی کیشنز کی اولین تحقیقی و تنقیدی اشاعتوں میں سے ایک ہے۔ضابطے کے صفحے پر ناشر کے طور پر نذیر حسین کا نام لکھا ہے۔کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

وحید قریشی، ڈاکٹر، ''پاکستانی قومیت کی تشکیل نو اور دوسرے مضامین''، صفحات:۱۸۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۴ء

ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر وحید قریشی نے پاکستانی قومیت، نظام تعلیم، اردو زبان اور اسلامی تصورات کے حوالے سے مختلف وقتوں میں جو مضامین لکھے وہ پاکستانی قومیت کی تشکیل نو کے عنوان سے سنگ میل پبلی کیشنز نے یکجا کر دیئے۔ڈاکٹر وحید قریشی نے ان مضامین میں مغربی تمدنی اقدار کے باعث پیدا ہونے والے پاکستانی تہذیبی مسائل اور اخلاقی و معاشرتی زندگی کو بڑی دردمندی سے سمجھنے اور اپنی تہذیبی و فکری شخصیت سے اُن کے حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔کتاب چار حصوں میں منقسم ہے، ابواب کے عنوانات درج ذیل ہیں:

پہلا حصہ: تعلیم۔قرآن حکیم کی روشنی میں، تعلیم میں آزادی رائے کا مسئلہ، ہمارا نظام تعلیم، مشرقی زبانیں اور تعلیمی اصلاحات، امدادی کتب کا مسئلہ۔دوسرا حصہ: پاکستانی قومیت کی تشکیل نو، اردو بہ حیثیت قومی زبان، اردو۔دفتری زبان، پنجابی اردو کے لسانی اور تہذیبی رابطے، رسم الخط کا مسئلہ۔تیسرا حصہ: اسلام میں قانون کے احترام کا تصور، ادیب اور ہمارا موجودہ معاشرہ، مصنف، تصنیف اور تحریر، چوتھا حصہ: پاکستان میں اردو نثر کے بیس برس، پاکستان میں طنز و مزاح کے بیس برس، پاکستان میں اردو ادب، فنون لطیفہ اور اسلام۔

کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی کا لکھا ہوا ہے اور اس پر ۲۶ جون ۱۹۸۱ء (تاریخ تحریر) درج ہے۔فلیپ پر ڈاکٹر سلیم اختر نے رائے دیتے ہوئے مضامین کے فکری و نظری تنوع کو سراہا ہے۔

یوسف کامران، ''قامت جاناناں''، صفحات: ۱۱۹، سن اشاعت ندارد

''قامت جاناناں'' یوسف کامران کے تاثراتی اور تنقیدی مضامین ہیں۔ جنہیں بغیر کسی ردوبدل کے کشور ناہید نے جمع اور مرتب کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے بعنوان ''تاثر'' میں درج ذیل شخصیات کے شخصی رویوں یا کتابوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

صوفی تبسم، شاکر علی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سجاد، جاوید شاہین، انیس ناگی، فہمیدہ ریاض، جمیل یوسف، محمود شام، اقبال ساجد۔

کتاب کے دوسرے حصے بعنوان ''تنقید'' میں تین مضامین شامل ہیں: نثری نظم۔ نیا شعری مزاج، ادب کے پروردگار، حلقہ ارباب ذوق اور سیاست۔ آخری حصے بعنوان ''ماں بولی'' میں ممتاز کنول کی پنجابی شاعری پر پنجابی زبان میں ایک مضمون ہے۔

یوسف کامران کی نثر میں بے ساختگی ہے اور ان کے تجزیوں میں تنقیدی شعور اور وسعتِ مطالعہ جھلکتے ہیں۔

چوتھا باب
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی تخلیقی مطبوعات
توضیحی کتابیات

داستان، ناول، افسانہ

آغا سہیل، ''تل برابر آسمان''، صفحات: ۱۱۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

''تل برابر آسمان'' ۔آغا سہیل کا افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

عہد زوال، جلا ہے جسم جہاں، حصار، کھڑکی، نوشتہ دیوار، تل برابر آسمان، تسمہ پا، لمن الملک الیوم، دابتہ الارض، روشنی، دروازہ بند ہے، بیعت، بے سمت راہیں، نظام۔

آغا سہیل کے یہاں موضوعات کی کمی ہے نہ پیش کش کے قرینوں کی۔آغا سہیل کے افسانے میں تاریخ، عصر اور فن کا شعور ہم آہنگ ہو کر اپنا اظہار کرتے ہیں؛ وہ پیچیدگی کے بجائے سادگی کے قائل ہیں لیکن کہانی اور کردار کے باطنی عمق میں اترنے کی کاوش ضرور کرتے ہیں۔

آغا سہیل، ''شہر نا پرساں''، صفحات: ۱۷۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۳ء

''شہر نا پرساں'' ۔آغا سہیل کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔اس سے پہلے ''بدلتا ہے رنگ آسماں'' کے نام سے افسانوی مجموعہ شائع ہوا تھا۔''شہر نا پرساں'' میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۱ء کے دوران میں لکھے گئے درج ذیل افسانے شامل ہیں:

فاصلہ، نئی بستی، جزاک اللہ، گیومی اے بے بی، پس دیوار، سہرا، ہاتھی کے دانت، سانچ کی آنچ، انا اللہ، گانٹھ، قرض، بڑا آدمی، کھویا ہوا بچہ، کارواں دل کا، اپنا آدمی، کہوں تو مکھ جر جائے، شہر نا پرساں، کروسٹوفر، لمن الملک الیوم، وقت اٹھے گا، کھڑکی۔

آغا سہیل کے یہاں موضوعات میں تنوع اور اسلوب میں سادگی ہے؛ وہ عموماً فکر، اقدار اور سماجی تعلقات میں آنے والی گراوٹ کو موضوع بناتے ہیں (اس حوالے سے افسانہ ''گانٹھ'' ایک خوبصورت اور دلچسپ افسانہ ہے، موضوع نیا اور پیش کش میں ڈرامائی عنصر موجود ہے)۔آغا سہیل کے افسانوں کے کردار عموماً وقت کی گرفت اور زوال کی کیفیت میں ہیں اور اپنے بچاؤ کے لیے مزید خطاؤں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، ''افسانے'' (خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے)، صفحات: ۶۳۲، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

احمد ندیم قاسمی اردو افسانے کا اہم حوالہ ہیں؛ خصوصاً پنجاب کے دیہات کے تناظر میں ان کے افسانوں کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں موضوع کے چناؤ اور پیش کش کے انداز پر ان کی حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کے اثرات خوشگوار کیفیت اور تخلیقی رنگ میں موجود ہیں۔مجموعے میں منتخب افسانوں کے عنوانات مع ماخذ درج ذیل ہیں:

غیر مطبوعہ افسانہ: بین، مجموعہ نیلا پتھر: احسان، جوتا، عالاں، مجموعہ کپاس کا پھول: سفارش، مشورہ، لارنس آف تھلیبیا، ماسی گل بانو، پہاڑوں کی برف، فیشن، مجموعہ گھر سے گھر تک: گھر سے گھر تک، سلطان، مجموعہ برگ حنا: جن وانس، وحشی، بیٹے بیٹیاں، مجموعہ بازار حیات: پرمیشر سنگھ، مخبر، بابا نور، موچی، ہیرا، مجموعہ سناٹا: رئیس خانہ، مامتا، الحمداللہ، گنڈاسا، سناٹا، مجموعہ درودیوار: جب بادل اُمڈے، کہانی لکھی جارہی ہے، مجموعہ آس پاس: ارتقاء، مجموعہ آبلے: ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد، مجموعہ آنچل: خربوزے، مہنگائی الاؤنس، مجموعہ سیلاب وگرداب: بڑھا، مجموعہ طلوع وغروب: کنگلے، جلسہ، مجموعہ بگولے: چوری، پاؤں کا کانٹا، قلی، السلام علیکم، سرخ ٹوپی، مجموعہ چوپال: مسافر۔

اشفاق احمد، ''اُجلے پھول''، صفحات: ۲۰۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

''اُجلے پھول''۔ اشفاق احمد کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، یہ پہلی بار ۱۹۵۳ء میں اُپل پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

اُجلے پھول، گل ٹریا، تنکہ، حقیقت نیوش، توشے بلے، صفدر ٹھیلا، گڈریا، برکھا، ایل ویرا۔

اس مجموعے کا افسانہ ''گڈریا'' اشفاق احمد کا معرکتہ الارا افسانہ ہے؛ ''گڈریا'' ایک ایسا شاہکار ہے جو صرف برصغیر کے تہذیبی ورق پر ہی لکھا جا سکتا تھا۔ ہندو مسلم تہذیب کی آمیزش نے گڈریے (داؤجی) کو تخلیق کیا لیکن ہندو و مسلم کی آویزش اس کردار کے المیے کا باعث بنی۔ اس مجموعے کا آخری افسانہ ''ایل ویرا'' اٹلی کے پس منظر میں لکھا گیا جہاں اشفاق احمد نے تقریباً دو سال قیام کیا تھا۔ سنگ میل نے زیرِ نظر مجموعے کو ۲۰۰۳ء میں ''گڈریا'' کے نام سے بھی شائع کیا ہے۔

قبل ازیں غالب پبلشرز لاہور نے اُجلے پھول کا ایک ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں نہایت اہتمام سے شائع کیا تھا۔ (۲۰۰ صفحے کی ساری کتاب آرٹ پیپر پر چھپی، مضبوط جلد اور خوبصورت سرورق کے حامل اس ایڈیشن کی قیمت فقط ۳۶ روپے تھی۔)

اشفاق احمد، ''ایک محبت سو افسانے''، صفحات: ۱۹۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۵ء

''ایک محبت سو افسانے'' اشفاق احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے؛ یہ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں مکتبہ جدید لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا۔

اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

توبہ، فہیم، رات بیت رہی ہے، تلاش، سنگ دل، مسکن، شب خون، توتا کہانی، عجیب بادشاہ، بندرابن کی کنج گلی میں، بابا، پناہیں، امی۔

پہلا افسانہ ''توبہ'' پہلی بار ۱۹۴۴ء میں مولانا صلاح الدین کے پرچے ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا تھا۔ اشفاق احمد نے اس افسانے کا نام ''جعفری'' رکھا تھا لیکن مولانا صلاح الدین احمد نے بدل کر ''توبہ'' کر دیا۔ اشفاق احمد نے یہ افسانہ پہلے شاہد احمد دہلوی کے پرچے

''ساقی'' میں بھجوایا تھا لیکن شاہد احمد دہلوی نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا (حامد بیگ مرزا، اردو افسانے کی روایت (۱۹۰۳ء سے ۱۹۹۰ء) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص:۸۴۲)

''ایک محبت سو افسانے'' کے افسانوں کا مرکزی موضوع محبت ہے، یہی موضوع آگے چل کر اشفاق احمد کی تمام تخلیقات اور فکری و قلبی زاویوں کا مرکزی موضوع ٹھہرا۔ ''ایک محبت سو افسانے'' کی ''سادہ و رنگین'' کہانیوں کا تناظر اور اشفاق احمد کا دلآویز اور اثر انگیز اسلوب ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ مجموعے کا ہر صفحہ قاری کے دیدہ و دل کو اپنی گرفت میں لینے کی انوکھی قوت سے ہمکنار ہو گیا ہے۔

کتاب کا انتساب ''صاحب جی'' کے نام ہے جس سے مراد بانو قدسیہ ہیں۔ (اس مجموعے کی اشاعت اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی شادی سے پہلے عمل میں آئی تھی)

اشفاق احمد، ''پھلکاری''، صفحات:۱۲۳، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

افسانوں کے اس مجموعے کا انتساب ملا وجہی اور قلی قطب شاہ ثانی سلطان کے نام ہے اور افسانوں کی زبان بھی دکنی اردو کی طرز پر ہے۔

کتاب کے دیباچے (معارفہ) میں اشفاق احمد نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اصلاح زبان کی تحریکوں کے باعث اردو زبان میں سے روزمرہ بول چال کے ایسے بہت سے الفاظ نکالنے کی کوشش کی گئی جن کا تعلق دکھنی، اودھی، باگڑی، برج بھاٹا اور پنجابی سے تھا؛ اشفاق احمد انہیں اردو کے خوابیدہ الفاظ کہتے ہیں، زیر نظر مجموعے کے افسانوں میں انہیں برتا گیا ہے۔ یہ افسانے ۵۲-1951 کی درمیانی مدت میں لکھے گئے تھے اور ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئے تھے۔ افسانوں کے عنوانات یہ ہیں:

رکی ہوئی عمر، ایک ہی بولی، کالا بدل، سلامتے کی مار، چل چلی، اپنی ذات، جنگ نامہ زیتون، ڈھیچک مال، ضابطے کی کاروائی، رشوت، داؤ کی تنگ ناموس، پچھیری، دوپہر ویلے، پھمن کہانی۔

''پھلکاری'' کو ہی ۲۰۰۲ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے ''ایک ہی بولی'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

مجموعے میں شامل ایک افسانہ ''داؤ'' کچھ عرصے پنجاب کے اردو میٹرک کورس میں بھی شامل رہا ہے۔

اشفاق احمد، ''سفر مینا''، صفحات:۳۹۵، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۳ء

تقریباً تیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں اشفاق احمد کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''سفر مینا'' منظر عام پر آیا۔

اس مجموعے میں گیارہ افسانوں کے ساتھ سات سفرنامے اور ایک ناولٹ ''مہمان بہار'' بھی شامل ہے۔ افسانوں اور سفرناموں کو یکجا شائع کرنے کا سبب اشفاق احمد نے اپنے مختصر دیباچے ''چند حرف'' میں یہ بیان کیا:

''ان دونوں صنفوں کو میں نے الگ شائع کرنے کا پروگرام وضع کیا تھا لیکن جب ان کی ترتیب و

تہذیب کے لیے مسودات کو دیکھنا شروع کیا تو یوں لگا کہ سفر نامے افسانوں کے رنگ میں پھیل
گئے ہیں اور افسانے اندرونی سفر کے مسافر بن گئے ہیں، چنانچہ جب ان کے رنگوں کی حدوں کو
ایک دوسری میں اترے دیکھا تو میں نے انہیں یکجا کر دیا''۔(ص ٦)

''سفر مینا'' کے افسانوں، سفر ناموں اور ناولٹ کو ایک حسین ربط باہم اشفاق احمد کے بات کرنے کے شوق اور بات بنانے کے ہنر نے عطا کیا ہے۔

اشفاق احمد، ''صبحانے فسانے''، صفحات:٢٧٩، زیر نظر ایڈیشن:١٩٩٧ء

''صبحانے فسانے'' اشفاق احمد کے بائیس افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔افسانوں کے عنوانات یہ ہیں:

اماں سردار بیگم، خود بدولت، آڑھت منڈی، بٹیر باز، ماسٹر، روشی، خانگی سیاست، مسرور مرثیہ، شازیہ کی رخصتی، بے غیرت مدت خاں، بندر لوگ، ڈھور ڈنگر کی واپسی، راز داں، پل صراط اور پاسپورٹ، وکھو وکھ، قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا، مہمان عزیز، بیک گراؤنڈ، زرناب گل، دم بخود، بدلی سے بدلی تک، چاند کا سفر، سہیل کی سالگرہ۔

ان میں کچھ افسانے خود نوشتی سوانح اور شخصیت نامے کا ذائقہ بھی رکھتے ہیں مثلاً ''اماں سردار بیگم'' اشفاق احمد نے اپنی والدہ اور ''چاند کا سفر'' اپنے مادر علمی (گورنمنٹ کالج لاہور) کے حوالے سے لکھا ہے۔افسانہ ''شازیہ کی رخصتی'' کشمیر کے مصائب کے حوالے سے پاک و ہند کے اہل قلم کی بے حسی اور ''بے غیرت مدت خان'' افغانستان پر روس کے حملے اور قبضے سے ہونے والی قومی، تہذیبی اور علمی بربادی کو موضوع بناتا ہے۔''صبحانے فسانے'' اشفاق احمد کے تیسرے افسانوی مجموعے ''سفر مینا'' کے ایک عرصے بعد شائع ہوا تھا۔

اشفاق احمد، ''طلسم ہوش افزا'' (سائنسی فکشن)، صفحات:١٧٥، زیر نظر ایڈیشن:١٩٩٨ء

''طلسم ہوش افزا'' کا انتساب اشفاق احمد نے ''طلسم ہوش ربا'' کے نام کیا ہے اور اسے اردو کی سب سے عظیم اور قدیم سائنس فکشن قرار دیا ہے۔

''طلسم ہوش افزا'' میں شامل افسانے بنیادی طور پر حیرت ناک افسانے ہیں جو اشفاق احمد کی ایک ٹی وی ڈراما سیریز ''حیرت کدہ'' کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ان میں دو افسانوں ''ملک مروت'' اور ''سوئی'' کو خاصی شہرت ملی ہے؛ دیگر افسانوں کے عنوانات یہ ہیں:

قصاص، چھے چھکا بتیس، سعید جونیئر، آخری حملہ، کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ، پوری جان کاری، قلارے، بدنی ضرورت، بولتا بندر، کوٹ ودو پاور ہاؤس۔تمام افسانے دلچسپ ہیں اور اشفاق احمد کے روایتی شگفتہ اسلوب کے حامل ہیں۔

اشفاق احمد (مترجم) ''وداع جنگ''، صفحات:٣٥٢، زیر نظر ایڈیشن:١٩٨٩ء

''وداعِ جنگ'' امریکی ناول نگار اور نوبل انعام یافتہ شخصیت ارنسٹ ہیمنگو کے معروف و مقبول ناول A FARE WELL TO ARMS کا اُردو ترجمہ ہے اس ناول پر ایک فلم بھی بن چکی ہے جو خاصی کامیاب رہی تھی۔ اشفاق احمد نے اس کا رواں دواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ تاریخ ترجمہ جنوری ۱۹۶۰ء درج ہے۔ قبل ازیں ''وداعِ جنگ'' یونائیٹڈ بک ڈپو لمیٹڈ نے جنوری ۱۹۶۰ء میں دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔

اصغر ندیم سید ''آدھے چاند کی رات''، صفحات: ۱۸۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

''آدھے چاند کی رات'' اصغر ندیم سید کا پہلا ناولٹ ہے جس میں ڈرامائی عنصر اور شعری آہنگ یکجا ہو کر ایک سادہ سی کہانی کو تہہ دار اور خوشگوار بنا رہے ہیں۔ کتاب میں ناشر کی جانب سے دیے گئے ایک نوٹ میں ناولٹ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

> ''آدھے چاند کی رات'' عورت اور مرد کے باطنی رشتے کو دریافت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ آج کے معاشرے میں گہرائی اور باریکی کے ساتھ اس رشتے کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اصغر ندیم سید کے مشاہدے اور نفسیاتی باریک بینی کا اظہار اس ناولٹ میں بے حد دل پذیر اُسلوب میں ہوا ہے۔ انسانی رشتوں کی نزاکت اور جذباتی کیفیات اس ناولٹ میں نئی حسیاتی سطح کو دریافت کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔''

اکرام اللہ ''بدلتے قالب''، صفحات: ۱۳۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

''بدلتے قالب'' اکرام اللہ کا معروف افسانوی مجموعہ ہے، جس میں درج ذیل آٹھ افسانے شامل ہیں:

سب راتوں جیسی رات، ماتارانی، سیاہ آسمان، دریائے سوات، کھیل اور کھلونے، اب جب اور تب، بدلتے قالب، آنکھ کھلی تو۔

ان افسانوں میں ''بدلتے قالب'' کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کی ڈرامائی تشکیل کر کے اسے ٹیلی ویژن پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ اکرام اللہ کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور حقائق کو پیش کرنے کا افسانوی سلیقہ بھی۔

اکرام اللہ کی کتابوں کی اشاعت سنگِ میل کے اشاعتی منصوبوں میں آغازِ کار سے ہی شامل رہی ہے۔

اکرام اللہ ''جنگل''، صفحات: ۱۵۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

اس مجموعے میں نو افسانے شامل ہیں ان کے حوالے سے محمد خالد اختر اپنی رائے کچھ یوں دیتے ہیں:

> ''یہ کتاب اُردو کے مختصر افسانوں کا ایک غیر معمولی اور چونکا دینے والا مجموعہ ہے.... اس تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب میں آٹھ افسانے ہیں اور ایک تمثیل۔ ''اُتم چند'' اور ''محتاج'' ایک طرح

سے رواجی مختصر افسانے ہیں.... ''احتیاج''، جنسی آگہی کی ایک اول درجے کی کہانی ہے.... ''
پل اور نقلی چوکیدار'' اور ''جنگل'' دونوں ایک طرح سے تجریدی افسانے ہیں۔ تنہا ہجوم اور تنہا فرد
کے المیے''۔ (پس سرورق)

افسانوں کی فہرست درج ذیل ہے:

اُتم چند محتاج، ایک دو پہر، احتیاج، پُل اور نقلی چوکیدار، جنگل، لے گئی پون اُڑا، راہ کا پتھر، پکنک۔

مجموعے کا دیباچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے اور فلیپ پر محمد کاظم کی رائے درج ہے۔

اکرام اللہ ''سوا نیزے پر سورج'' (چار ناولٹوں کا مجموعہ)، صفحات: ۳۱۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

''سوا نیزے پر سورج'' اکرام اللہ کے ناولٹوں کا کلیات ہے۔ اس مجموعے میں درج ذیل چار ناولٹ شامل ہیں:

کتنا پانی، پشیمانی، سوا نیزے پر سورج، ہونی۔

اکرام اللہ حقیقت پسند ناولٹ نگار ہیں لیکن ان کا اسلوب علامتی ابعاد کا بھی حامل ہے۔ اکرام اللہ کے مذکورہ بالا ناولٹ معاشری مسائل ومصائب کے ساتھ ساتھ انسان کی باطنی کشمکش کو بھی روشن کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اکرام اللہ کا سنگ میل سے اشاعتی تعلق بہت پرانا ہے۔ سنگ میل کی ابتدائی ادبی مطبوعات میں اکرام اللہ کی تصانیف بھی شامل ہیں۔

انتظار حسین، ''آخری آدمی''، صفحات: ۱۳۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

یہ افسانوی مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۷ء میں کتابیات لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس سے پہلے انتظار حسین کے دو افسانوں کے مجموعے (گلی کوچے، کنکری) ایک ناول (چاند گہن) اور ایک ناولٹ (دن اور داستان) شائع ہو چکے تھے۔ ''آخری آدمی'' کے دیباچے میں سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین پچھلی نسل کے افسانہ نگاروں سے موضوع، اسلوب اور زبان، تینوں اعتبار سے ممتاز ہیں.... انتظار حسین غالباً اُردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے انسانوں کے اخلاقی و روحانی زوال کی کہانی مختلف زاویوں سے لکھی ہے.... وہ تکنیک جو فی الاصل مغربی ہے ان کے یہاں مشرق کے مزاج سے ہم آہنگ ہے.... انتظار حسین کی کامیابی اس بات میں ہے کہ اُنھوں نے مغرب کی تکنیک سے اپنے مواد کو برتنے کی کوشش کی ہے.... انتظار حسین کی زبان پرانے عہد ناموں اور داستانوں کی سلیس وسادہ زبان ہے۔ (ص د، ہ، و)

اس مجموعے میں گیارہ افسانے اور انتظار کا ایک مضمون اپنے کرداروں کے بارے میں ہے؛ اس مضمون میں افسانے کا اُسلوب

اورانشائیے کی نکتہ رسی سرایت کیے ہوئے ہے۔ ''آخری آدمی'' کے افسانوں سے پوری طرح علامتی اور تمثیلی سفر شروع ہوتا ہے اور اُسلوب میں داستانی، اساطیری اور ملفوظاتی انداز، جدید تر طرزِ تحریر سے آمیز ہو جاتا ہے۔ مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

آخری آدمی، زرد کتا، پرچھائیں، ہڈیوں کا ڈھانچ، ہمسفر، کایا کلپ، ٹانگیں، سیکنڈ راؤنڈ، سوئیاں، شہادت سوت کے تار۔

انتظار حسین ''آگے سمندر ہے''، صفحات: ۳۲۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

''آگے سمندر ہے'' انتظار حسین کا ناول ہے۔ اس سے پہلے ''بستی''، ''تذکرہ'' اور ''چاند گہن'' سامنے آئے۔ انتظار حسین کے ناول اور افسانے اُن کی یادوں سے روشنی اور ان کی ہجرت کے تجربے سے تاثیر لے کر اپنے عصر کو اس طرح موضوع بناتے ہیں کہ ماضی کی کہانی، حال کے دوراہے پر اور حال کا قصہ، ماضی کے آنگن میں نئی معنویت کے پھول کھلانے لگتے ہیں۔

''آگے سمندر ہے'' کا بنیادی موضوع کراچی کا تہذیبی سناٹا اور سیاست و تشدد کا ہنگامہ محشر ہے۔ لیکن اس موضوع کے بطون میں اندلس کا المیہ، ہجرت کا کرب، زمین و زماں کا جبر اور انسان کا تہذیبی خسارہ بیک وقت رواں دواں ہیں۔

ناول کا مجموعی ماحول سوگوار ہے اور انجام روایتی ہے نہ رجائی بلکہ اصل میں آغاز ہے ایک نئی سوگواریت کا۔

انتظار حسین ''بستی''، صفحات: ۲۵۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''بستی'' فلسفیانہ ہونے کے باوجود مقبول عام ناول ثابت ہوا اور اس کے پاک و ہند میں متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔

انتظار حسین کا یہ ناول عام ڈگر سے ہٹ کر لکھا گیا ہے اور اس میں روایتی انداز کا پلاٹ اور سکہ بند قسم کی کردار نگاری نہیں ہے پھر بھی کہانی کا حسن اور کرداروں کا تشخص و ارتقاء ایک سنجیدہ قاری پر واضح ہو جاتا ہے اور ایک گہرا تاثر بھی مرتب کرتا ہے۔

انتظار حسین کا بنیادی مسئلہ ہجرت ہے اور ہجرت: بستیوں، رشتوں اور قدروں سے یک لخت کٹ جانے کا ایک اُداس استعارہ ہے لیکن یہ استعارہ معنی آفریں بھی ہے اور خرد افروز بھی؛ اس لیے تخلیق بھی کر سکتا ہے اور تاریخ بھی بنا سکتا ہے۔

انتظار حسین/آصف فرخی، انتخاب، ''پاکستانی کہانیاں'' (پاکستانی افسانے کے پچاس سال)، صفحات: ۳۲۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

پاکستانی کہانیاں پاکستان میں اُردو افسانوں کا ایک کڑا انتخاب ہے جو گزشتہ پچاس سالوں کا احاطہ کرتا ہے۔

انتظار حسین انتخاب کے حوالے سے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''کوشش یہ کی گئی ہے کہ ادبی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سب رنگوں کو سمیٹا جائے جو ان پچاس برسوں میں پاکستانی افسانے میں پروان چڑھے ہیں اور یہ کہ اُردو افسانے کے ساتھ پاکستان کی دوسری زبانوں میں افسانے نے جو شکل نکالی ہے اسے بھی ملحوظ رکھا جائے''۔ (ص ۱۰، ۱۱)

کتاب کا دوسرا دیباچہ ''سفید سناٹا'' کے عنوان سے آصف فرخی کا ہے۔ اس انتخاب میں تمام اہم پاکستانی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے ساتھ سندھی، پنجابی، سرائیکی، پشتو اور بلوچی کے افسانوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

مجموعے کے مرتبین نے طویل افسانوں کے بجائے مختصر افسانوں کو منتخب کیا ہے۔ یہ مجموعہ اردو افسانے کے حوالے سے دو اہم شخصیات کا مرتب کردہ ہے لہٰذا اسے خاصی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔

انتظار حسین، ''تذکرہ''، صفحات: ۲۹۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

''تذکرہ'' ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے جو متروکہ بستیوں، گزرے زمانوں، خواب گزیدہ تعبیروں یا تعبیر گزیدہ خوابوں میں رہنے کا ہنر جانتا ہے۔ نئی بستی، نئے زمانے، نئے خواب اور نئی تعبیریں اُسے گذشتہ سے مزید پیوست کر دیتی ہیں؛ اور یہی سب اُس کی زندگی، مسرت اور المیہ ہے۔

ناول میں داستانوں کی زبان بھی ہے اور جدید زمانے کی بولی بھی! وجہ اس کی یہ ہے ناول میں نہ ماضی خاموش اور نہ حال!

انتظار حسین، ''جنم کہانیاں''، صفحات: ۷۵۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''جنم کہانیاں'' اصل میں انتظار حسین کی افسانوی کلیات کی جلد اول ہے جس میں چار مجموعے شامل ہیں۔

گلی کوچے (۱۹۵۲ء)، کنکری (۱۹۵۵ء)، دن اور داستان (۱۹۲۶ء)، آخری آدمی (۱۹۶۷ء)۔

پیش لفظ میں انتظار حسین نے لکھا:

''کیا یہ سب اس لائق ہے کہ اسے اکٹھا کر کے اہتمام سے قارئین کی نذر کیا جائے۔ پتا نہیں۔ بہر حال نیاز احمد نے اصرار کیا اور میں تھوڑے تامل کے بعد یہ سوچ کر آمادہ ہو گیا کہ چلو جگر لخت لخت کو جمع کر کے دیکھیں تو سہی کہ اس میں سے کوئی بامعنی صورت برآمد ہوتی ہے یا نہیں''۔

جنم کہانیاں کا انتساب گمشدہ ہمسفروں کے نام ہے۔

انتظار حسین، ''چاند گرہن''، صفحات: ۱۶۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

''چاند گرہن'' انتظار حسین کا پہلا ناول ہے جو پہلی بار مکتبہ کارواں، لاہور سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔

''چاند گرہن'' ایسے کرداروں کی کہانی ہے جو تقسیم ہند کے اثرات کا تین طرح سے مشاہدہ کرتے ہیں: پہلے اپنی قدیمی بستی میں اپنے خلاف نفرت اور غصے کی فضا دیکھتے ہیں، پھر ہجرت کے مسائل و مصائب سے گزرتے ہیں اور پھر نئی بستی کی نہ سمجھ میں آنے والی صورتحال کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس مشاہدے اور تجربے کا حاصل: نا اُمیدی اور احساسِ محرومی کی صورت میں اُن کی

شخصیتوں پر حاوی ہو جاتا ہے؛ سواُن کی ہر تدبیر اُلٹی، ہر سمت کھوٹی اور ہر سوچ بے معنی نظر آتی ہے۔

''چاند گرہن'' پاکستان کے ابتدائی دنوں کا ایک ایسا ترجمان ہے جو اُس انتشار، اضطراب اور افتراق کو سامنے لاتا ہے جو خارج کے ساتھ ساتھ افراد کے داخل میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ ناول کے کردار بو جی، سبطین، فیاض، کالے خان اور دیگر اپنی اپنی شخصیتوں اور باطنی دُنیاؤں کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

انتظار حسین، ''خالی پنجرہ''، صفحات: ۱۹۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

اس افسانوی مجموعے میں نئے اور کچھ پرانے افسانے شامل ہیں۔ نئے وہ جو انتظار حسین کے مجموعے: ''خیمے سے دور'' کے بعد لکھے گئے، پرانے وہ جو بوجوہ کسی پرانے مجموعے میں شامل نہ ہو سکے۔ نئے افسانے یہ ہیں:

پچھتاوا، نرالا جانور، تعلق، خالی پنجرہ، اختر بھائی، مشکند، گونڈوں کا جنگل، بندر کہانی، طوطے مینا کی کہانی، بخت مارے، داغ اور درد، تذکرۂ رستخیز بے جا المعروف بہ فسانہ عبرت۔ پرانے افسانے یہ ہیں:

احسان منزل، مجید، بیریم کارونیٹ، سمجھوتہ، آخری خندق۔

ان میں سے ایک افسانے ''بیریم کاربونیٹ'' کو پچاس کی دہائی میں مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے انعام بھی ملا تھا۔

نئے افسانوں میں ایک افسانے بخت مارے، کی ٹیلی ویژن کے لیئے ڈرامائی تشکیل کی گئی اور اسے ٹیلی ویژن سکرین پر بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ افسانہ: ''پچھتاوا، نرالا جانور، بندر کہانی، اور طوطے مینا کی کہانی کی بنیاد: قدیم ہندوستان کی اساطیر ہیں۔

انتظار حسین، ''خیمے سے دور''، صفحات: ۲۱۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

کتاب کے پیش لفظ (مرقوم ۲۵/ اگست ۱۹۸۵ء) میں انتظار حسین نے بتایا ہے کہ اس چھٹے افسانوی مجموعے کی کہانیاں ۱۹۸۱ء کے بعد کی ہیں، البتہ تین کہانیاں خواب میں دھوپ، اجنبی پرندے اور حصار اس سے پہلے کی ہیں جو کسی مجموعے کا حصہ نہ بن سکیں۔ اس مجموعے میں کل سترہ افسانے ہیں، جن کے موضوعات مختلف اور انداز پیشکش متنوع ہیں۔ افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

خیمے سے دور، سفر منزل شب، حصار، نر ناری، پوار گیان، دُھوپ، برہ کی کہانی، اجنبی پرندے، برہمن بکرا، وقت انتظار، پلیٹ فارم چیلیں، پُرانی کہانی، دسواں قدم، خالی گھر، خواب میں دھوپ۔

یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۸۶ء میں سنگ میل نے ہی شائع کیا تھا۔

انتظار حسین، ''شہرِ افسوس''، صفحات: ۲۲۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

اس مجموعے میں سترہ افسانے اور ایک مضمون ''کہانی کی کہانی'' شامل ہے جس میں انتظار حسین نے اس مجموعے میں شامل ایک

افسانے ''کٹا ہوا ڈبا'' کا بڑے تخلیقی انداز میں تجزیہ کیا ہے(بقول انتظار ''کہانی کی کہانی'' فرمائشی طور پر سنائی گئی ہے)انتظار کے افسانے کے ہر قاری کو اس ''کہانی کی کہانی'' (یا تجزیاتی مطالعہ) کو ضرور پڑھنا چاہیے تا کہ انتظار کے افسانوں کی تفہیم میں جو اس کے لیے مشکلات ہوں، وہ قدرے دور ہو سکیں اور انتظار حسین کی تکنیک، سوچنے کا انداز محسوس کرنے کا سلیقہ، اس پر پوری طرح کھل سکے۔اس مجموعے کے ایک افسانے ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی اور یہ مختلف تعلیمی درجوں میں شامل نصاب بھی رہا۔

انتظار حسین، ''شہرزاد کے نام''، صفحات:۱۹۲، زیر نظر ایڈیشن:۲۰۰۲ء

سترہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ: تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے اس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

دائرہ، مورنامہ، شہرزاد کی موت، ریز رو سیٹ، وارد ہونا، شہزادہ تورج کا۔۔، ہم نوالہ، مانوس اجنبی، اللہ میاں، شہزادی، جبالا کا پوٹ کلیہ نے دمنہ سے کیا کہا، دمنہ کیوں ہنسا کلیہ کیوں رویا، کلیہ دمنہ ہٹ لسٹ پر، کلیہ چپ ہو گیا، چوہیا نے کیا کھویا کیا پایا، مہابن کے بندروں کا قصہ، میرے اور کہانی کے بیچ، شہرزاد کے نام۔

افسانہ ''میرے اور کہانی کے بیچ'' پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے پس منظر میں مضمون/ کالم کے انداز میں لکھا گیا افسانہ ہے۔

انتظار حسین، ''قصہ کہانیاں''، صفحات:٦١٦، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''قصہ کہانیاں (انتظار حسین کی افسانوی کلیات کی جلد دوم ہے، جلد اول ''جنم کہانیاں'' کے عنوان سے شائع ہوئی) زیر نظر جلد (دوم) میں انتظار حسین کے تین مجموعے شامل ہیں:'' کچھوے''، ''شہر افسوس''، ''خیمے سے دور''۔

قصہ کہانیاں کا دیباچہ انتظار حسین نے ''چولھے کے آس پاس'' کے عنوان سے لکھا جس میں انتظار نے بتایا کہ اُن کی پہلی کہانی جو مجموعہ گلی کوچے کی بھی پہلی کہانی ہے ۱۹۴۸ء کے شروع میں شائع ہوئی تھی اس لیے اُن کے مطابق:

> ''جنم کہانیاں اور ''قصہ کہانیاں'' کی شکل میں مختصر افسانوں کی حد تک میرا اڑتیس برس کا کچا چٹھا آپ کے سامنے ہی نہیں، میرے اپنے سامنے بھی.... یہ افسانے اپنی وکالت آپ کر سکتے ہیں تو کریں میں تو خود اپنا حساب کرنا چاہتا ہوں۔لیکن شاید اس حساب کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہو''۔(ص ۱۱،۱۲)

اس کتاب کا خوبصورت سرورق، انتظار کے کسی افسانے کا ورق ہے۔جس میں کئی روپ، کئی جنم، کئی زمان و مکاں یکجا ہو کر ایک نیا زمان و مکان تخلیق کر لیتے ہیں۔

انتظار حسین، '' کچھوے''، صفحات:۱۶۸، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

اس افسانوی مجموعے میں سترہ افسانے اور اپنے فن کے حوالے سے ایک خط نما مضمون ''نئے افسانہ نگار کے نام'' شامل ہے جس میں انتظار حسین نے نئے افسانے کے دعویداروں کے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جوان کے کچھ افسانوں کی زبان، نوسٹلجیا، کردار نگاری اور پرانے ملفوظات، اساطیر اور صحائف سے لسانی اور علامتی مواد حاصل کرنے کے سلسلے میں ان پر بڑے شدومد سے کیے گئے۔

ان افسانوں میں سے ''فراموش'' انٹرمیڈیٹ کے اُردو لازمی کے نصاب میں ایک عرصہ شامل رہا ہے۔ کتاب میں ''قدامت پسند لڑکی'' اور ''ہندوستان سے ایک خط'' دو ایسے افسانے ہیں جنہیں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ افسانوں کی ترتیب کچھ یوں ہے:

قدامت پسند لڑکی، ۳۱ مارچ، فراموش، بادل، اسیر، ہندوستان سے ایک خط، نیند، کچھوے، پتے، واپس، رات، دیوار، خواب اور تقدیر، شور، صبح کے خوش نصیب، بے سبب، کشتی۔

زیرِ نظر مجموعہ پہلی بار ۱۹۸۱ء میں مطبوعات، لاہور نے شائع کیا تھا (جس کے صفحات ۱۷۳ تھے)۔

انتظار حسین، ''کنکری''، صفحات: ۲۲۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

''کنکری'' انتظار حسین کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے؛ اسے پہلی بار مکتبہ جدید، لاہور نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا تھا۔

آغاز میں انتظار حسین نے ''انجہاری کی گھریا'' کے عنوان سے نہایت تخلیقی اور افسانوی انداز میں فنِ افسانہ کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر، سوچ اور احساس پیش کیا ہے۔ مجموعے میں درج ذیل چودہ افسانے شامل ہیں:

مجمع، اصلاح، محل والے، یاں آگے درد تھا، آخری موم بتی، دیولا، کیلا، ساتواں در، پٹ بیجنا، پسماندگان، ٹھنڈی آگ، جنگل، مایا، کنکری۔

''کنکری'' کے افسانوں میں خارج کا تذکرہ اس طرح ہے کہ مناظر جیتے جاگتے کردار بن جاتے ہیں اور کردار اپنی گفتگو سے اپنے آپ کو یوں منکشف کرتے ہیں کہ ان کے داخل کے مناظر خارج میں چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اجنبیت کے احساس اور یادوں کی یلغار کے ساتھ ساتھ خوف، وسوسے، واہمے کرداروں اور فضاؤں پر حاوی ہیں۔

اُسلوب میں انفرادیت، تاثیر اور بعض جگہ رقت ہے، اور آئندہ کے افسانوں کے لیے ایک نئے اسلوب کی پیش گوئی بھی ہے۔

انتظار حسین، ''گلی کوچے''، صفحات: ۱۹۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

''گلی کوچے'' انتظار حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے؛ اس کے مختصر دیباچے (استفسار) میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعہ میں ۵۰ء کے آخر تک کے افسانے شامل ہیں۔ رہا آخری افسانہ تو یہ دراصل تقسیم سے پہلے میرٹھ میں لکھا گیا تھا۔ مگر میں نے نومبر ۵۱ء میں اسے پھر لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ باقی سب افسانے لاہور میں بیٹھ کر لکھے گئے''۔ (ص۴، تاریخ تحریر: یکم جنوری ۱۹۵۲ء)

مجموعے میں شامل افسانے:

قیوما کی دوکان، خرید وحلوابیسن کا، چوک، فجا کی آپ بیتی، اجودھیا، رہ گیا شوق منزل مقصود، پھر آئے گی، عقیلہ خالہ، روپ نگر کی سواریاں، ایک بن لکھی رزمیہ، سانجھ بھئی چہندیس (رپورتاژ)، استاد۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ: ''قیوما کی دوکان'' انتظار کا اولین مطبوعہ افسانہ تھا جو ''ادب لطیف'' لاہور میں دسمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ مجموعہ ''گلی کوچے'' پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شاہین پبلشرز، لاہور نے شائع کیا تھا۔ مجموعے میں شامل افسانے ''ایک بن لکھی رزمیہ'' کو قارئین وناقدین میں بے حد اہمیت حاصل ہوئی۔

انوار احمد، ''ایک ہی کہانی''، صفحات: ۱۱۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

''ایک ہی کہانی'' ڈاکٹر انوار احمد کے تیئس افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے؛ یہ افسانے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران میں لکھے گئے تھے۔

افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

نوں جی، چرم ہائے قربانی، آسٹروٹرف، ایک بے ضرر کہانی، کہانی لکھنے والا، شہر کا پہلا محبّ وطن بچہ، گونگی غراہٹ، درداں دی ماری دلڑی علیل اے، ایک ہی کہانی، بچھوؤں کے ساتھ رات، محبت کی سیکنڈ ہینڈ کہانی، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، انتظار میں ڈوبا ہوا گھر، نئی دُنیا کی تلاش، کھڑکی کھلی رکھنا، قومی مفاد میں مرتب کی جانے والی ایک رپورٹ، کہانی کون لکھے، بیچ والا آدمی، دعا کی لاش، کہانی اور کہر، شہید کا خواب، حلفیہ بیان، آخرت ایکسپریس۔

مجموعے کے دیباچے (کہانی کی کہانی) میں اصغر ندیم سید لکھتے ہیں:

> ''آج کی ماڈل کہانی کے خدوخال مجھے انوار احمد کے افسانوں میں مکمل شکل میں دکھائی دیئے ہیں.... ان افسانوں میں جذبے اور شعور کی سرگرمی کا اندازہ لگانے کی لیے انوار احمد کو اس کے مقدر کے آئینے اور قومی سانحوں کی گونج میں دیکھنا ضروری ہے.... انوار احمد نے اصل زندگی سے بے دخلی کا تجربہ کیا ہے اس لیے ان افسانوں کا مرکزی تار ردعمل کی تیوری سے بل دے کر مضبوط کیا گیا ہے۔ ہمارا جدید افسانہ آرائشی اظہار کی بجائے تجربے کی کوکھ سے جنم لینے والے اسلوب کا حامل دکھائی دیتا ہے.... انوار احمد اپنی شخصیت کے اسرار سمیت کہانی کے تاروپود میں موجود ہے.... انوار احمد نے اپنے تجربے کو ہمیشہ تکنیک پر فوقیت دی ہے''۔ (ص ۶، ۷، ۹، ۱۰، ۱۱)

انور سجاد، ''پہلی کہانیاں''، صفحات: ۲۸۳، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

''پہلی کہانیاں''۔ انور سجاد کے اولین افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے؛ یہ افسانے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء کے دوران میں لکھے گئے تھے۔

کتاب کے فلیپ پر انور سجاد لکھتے ہیں:

''یہ میری پہلی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ روایت کے مطابق اسے میرے دوسرے مجموعوں سے پہلے شائع ہونا چاہیے تھا۔ میرا پہلا انتخاب ''چوراہا'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دراصل ہمارے والی نسل کو اپنے کام کی نوک پلک سنوارنے کا جنون سا تھا، تشفی نہیں ہوتی تھی.... ہم ہمیشہ اپنے ''امکانات کی دریافت'' میں سرگرداں رہے۔ پہلی کہانیاں اسی عمل کے آغاز کی کوششوں میں سے ہیں''۔ (تاریخ تحریر: ۱۳/ اکتوبر ۱۹۹۰ء)۔

''پہلی کہانیاں'' انور سجاد کے چوتھے مجموعے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

ہوا کے دوش پر (پہلی مطبوعہ کہانی) کپاس کا دل، پیارے جمی، بندرابن، چیری، منوجی، کاکا، پرتو، رشتے، اجنبی، جنم دن، ہتک، صلیب کے سائے میں، تیسری لکیر، زرد کونپل، سیاہ جھنڈا۔

انور سجاد، ''چوراہا''، (افسانے ۶۴ـ۱۹۵۸ء)، صفحات: ۱۷۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

''چوراہا'' انور سجاد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۶۴ء میں نئی مطبوعات، لاہور نے شائع کیا تھا۔ انور سجاد زیر نظر ایڈیشن کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:

''چوراہا (انتخاب ۶۴ـ۱۹۵۸) میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ پہلے ایڈیشن میں چار افسانے مرگی، گائے، کیکر اور صدا بہ صحرا شامل تھے جو میں نے بعد میں اپنے دوسرے مجموعے ''استعارے'' (۱۹۷۰) میں شامل کر لئے تھے، اس لئے دوسرے ایڈیشن میں ان افسانوں کے بجائے اسی زمانے کے تین اور افسانے پیپل سے محبت کے ساتھ، رتا پر چھانواں اور وادیوں کی دھوپ شامل کر لیے گئے ہیں جو میں نے اپنے غیر مطبوعہ انتخاب (پہلی کہانیاں ۸۳ـ۱۹۵۳) سے لئے ہیں''۔ (فلیپ)

''چوراہا'' میں شامل افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

پیپل سے محبت کیساتھ، وادیوں کی دھوپ، رتا پر چھانواں، نہ مرنے والا، دیوار اور دروازہ، سب سے پرانی کہانی، سونے کی تلاش، آنکھ اور سایہ، ۱۳، چوراہا۔

انور سجاد کے افسانوں کا موضوع ان کے عہد اور ماحول ہے۔ عموماً ہر افسانہ ایک نقش فریادی ہے جس کا کاغذی پیرہن بھی جبر و جور کی زد پر ہے۔ شروع کے افسانے عمومی اور روایتی نوعیت کے تھے۔ لیکن بعد میں علامتی اور تجریدی رنگ بڑھتا چلا گیا۔

''چوراہا'' کے افسانوں میں وجودیت کی لہریں کہیں زیریں اور کہیں بالائی سطح پر اپنی موجودگی ظاہر کر رہی ہیں۔

انور سجاد، ''خوشیوں کا باغ''، صفحات:۱۹۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

انور سجاد نے اس ناول میں پاکستانی معاشرے میں فکر، معیشت، خودمختاری اور اقدار کے زوال کو اس طرح موضوع بنایا ہے کہ ساری تیسری دُنیا کے مصائب و مظالم اس میں سمٹ آئے ہیں۔ بظاہر اس ناول کا مرکزی کردار ایک چیف اکاؤنٹنٹ ہے لیکن بباطن تیسری دُنیا کا وہ ''اجتماعی ماحول'' ہے جو انصاف و آزادی، ترقی و منزلت اور فکر و فلسفہ سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ خوشیوں کا باغ تیسری دُنیا کا نوحہ ہے۔

ناول کے آغاز میں ہالینڈ کے ممتاز مصور ''ہائرانیمیس بوش'' کے حوالے سے انور سجاد کی تحریر ایک اعتبار سے ناول کا دیباچہ ہے؛ اس میں مذکورہ مصور کی ایک مشہور پینٹنگ کا ذکر ہے: ''یہ پینٹنگ تین حصوں (پینل) پر مشتمل ہے۔ پہلا پینل ہے حوا کی تخلیق، دوسرا پینل خوشیوں کا باغ ہے۔ اور تیسرے پینل کا نام ہے۔ موسیقی کا جہنم''۔ (ص۔۱۳) انور سجاد کا خیال ہے، تیسرا پینل واقعاتی لحاظ سے ناول کے سیاق و سباق میں جذب ہو گیا ہے۔ ناول کے آغاز میں بوش کے تیسرے پینل (موسیقی کا جہنم) کو تیسری دنیا کہا گیا ہے۔

''خوشیوں کا باغ'' ایک غیر روایتی اور تجرباتی ناول ہے؛ فنی حوالے سے یہ ناول کئی اعتراضات کی زد پر رہا ہے؛ خصوصاً ناول میں کہانی کی کمی اور ناول نگار کے بیانات کی افراط خاصی موضوعِ بحث بنی ہے۔

آخر میں ''اختتامیہ'' کے طور پر شمیم حنفی کا مضمون بعنوان ''ایک مکان کی بشارت'' بھی شاملِ کتاب ہے۔

انوار سجاد، ''رگِ سنگ''، صفحات:۱۶۰، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

''رگِ سنگ'' انور سجاد کا اولین ناولٹ ہے جو پہلی بار ۱۹۵۶ء میں گوشہ ادب لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس ناولٹ کے (مختصر) مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں اس ناولٹ کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس میں اونچے متوسط طبقے کی زندگی کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں موجودہ زندگی کی کشمکش کو پوری طرح محسوس کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے..... البتہ ان باتوں کو پیش کرتے ہوئے زندگی کے متعلق کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں اُبھرتا''۔ (ص۷،۸، تاریخ تحریر:۱۰/اکتوبر۱۹۵۶ء)

انیس ناگی، ''دیوار کے پیچھے''، صفحات:۳۰۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

ناول ''دیوار کے پیچھے''۔ جدید ناول نگاری کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس ناول نے اپنے زمانے کی باطنی سرگذشت کو صداقت سے پیش کیا ہے۔ قاضی جاوید ناول کے آخر میں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

''اس ناول کو پڑھنا عصری زندگی کے پورے کرب سے گزرنا ہے۔ یہی وجودی بحران کا نقطۂ آغاز ہے۔انیس ناگی کے اس ناول کا ہمارے عہد سے وہی تعلق ہے جو شاہ حسین اور بلھے شاہ کی شاعری کا اُن کے زمانے سے تھا..... انیس ناگی کا پروفیسر لایعنی کائنات میں بلا جواز پھینکا ہوا اینٹی ،ہیرو ہے وہ برگشتگی کی تجسیم ہے.... انیس ناگی کی تکنیک نے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھر پور ساتھ دیا ہے۔اس کا ناول تعجب انگیز حد تک فطری واقعات کے سلسلے پر مبنی ہے۔تمام کردار جانے پہچانے ہیں حالانکہ موضوع اور اسلوب دونوں حوالوں سے یہ ناول ہماری ادبی روایت میں ایک بے مثل تجربہ ہے.... ''دیوار کے پیچھے'' نئے انسان کے وجودی کرب کا ایک تخلیقی بیان ہے۔''(ص:۲۹۵،۲۹۶،۳۰۱،۳۰۴،تاریخ تحریر:۱۹۸۱ء)

ناول کے فلیپ پر انور سجاد کی رائے درج ہے جس میں اُنہوں نے ''دیوار کے پیچھے'' کو اردو ناول میں ایک عظیم روایت کا آغاز قرار دیا ہے۔ یہ ناول ''عصر کی تباہی'' اور ''نئی دانش کی ضرورت'' کا اعتراف اور اظہار ہے۔

اے حمید،''خزاں کا گیت''،صفحات:۱۲۴،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

''خزاں کے گیت'' اے حمید کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو مکتبہ اردو لاہور سے ۱۹۵۱ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔مجموعے میں شامل افسانے یہ ہیں: شاہدرہ کی ایک شام،شنوائی، بہار سے پہلے، بہار کے بعد، برف گرنے تک،قصہ حاتم طائی کے لاہور آنے کا۔صحرا،صحرا، واپسی،خزاں کا گیت۔

اس افسانوی مجموعے کے موضوعات متنوع،اندازنظر رومانی اور اسلوب رنگین ہے۔افسانہ ''قصہ حاتم طائی کے لاہور آنے کا،طنز ومزاح کا حامل ہے اور اے حمید کے روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔خزاں کا گیت۔اے حمید کے دیگر افسانوی مجموعوں کی طرح اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اے حمید،'' کچھ یادیں کچھ آنسو''صفحات:۲۱۰،زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

'' کچھ یادیں کچھ آنسو''۔اے حمید کا تیسرا مجموعہ ہے جو مکتبہ پاکستان،لاہور نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا تھا۔

مجموعے میں شامل افسانے درج ذیل ہیں:

چاندنی اور جزیرے، پیارے دوست، وہ ڈالیاں چمن کی ، ناریل کے سائے، سہیلی کے نام، پھول گرتے ہیں، کچھ یادیں کچھ آنسو،سماوار،ڈاچی والیا۔

اس مجموعے کے افسانوں کی بنیادی خوبی رومان اور حسین مناظر کی جیتی جاگتی پیش کش ہے۔

''ڈاچی والیا''۔اے حمید کا قدرے مختلف اسلوب میں لکھا جانے والا ایک تجزیاتی افسانہ ہے۔

اے حمید،''مٹی کی مونالیزا''،صفحات:۲۲۴،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''مٹی کی مونالیزا''۔اے حمید کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے اور اسے ادارۂ فروغ اردو نے ۱۹۶۰ء میں پہلی بار شائع کیا تھا۔

مجموعے میں شریک افسانے: یروشلم یروشلم، تاریک صلیب اور زرد چاند، آلیو! آلیو، رات کا داغ، سورج بھی تماشائی، ویران گلیوں میں بارش، عذرا کی واپسی، اے راوی کے پانی، طوفانی رات کے ملاح، باغ جناح کی ایک دوپہر، پت جھڑ کی نشانیاں، سردی بارش اور رات، اندھیری رات کی ہوا، کافور کے پھول، شریف آدمی، مٹی کی مونالیزا اور پُل ٹوٹ گیا۔

اس مجموعے کے افسانوں میں ماضی ایک تخلیقی قوت کے طور پر جمالیاتی بنت کاری میں مصروف نظر آتا ہے۔

فطرت پسندی اور مناظر کشی حسب معمول ہر افسانے کی عبارت واشارت پر حاوی ہیں۔

اے حمید،''منزل منزل''،صفحات:۱۷۰،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

''منزل منزل''۔اے حمید کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار نیا ادارہ لاہور کی جانب سے ۱۹۵۰ میں شائع ہوا تھا۔

مجموعے میں شامل افسانے یہ ہیں: تعریف اس خدا کی، ایک کہانی، خلیج، اور آواز آئی، ایک رات، راون کے دیس میں، گولڈ فلیک اور بیڑی، منزل منزل، ایک لڑکی۔کئی لڑکیاں، حسن اور روٹی۔مجموعے کے اکثر افسانے رومانیت میں لپٹی ہوئی حقیقت کو چھونے کی کوشش میں ہیں۔افسانہ''ایک رات''اور''ایک لڑکی۔کئی لڑکیاں''۴۷ء کے فسادات کے موضوع پر ہیں۔

بانو قدسیہ،''آتش زیرپا''،صفحات:۲۵۴،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

افسانوی مجموعہ''آتش زیرپا''سنگ میل پبلی کیشنز نے پہلی بار ۱۹۸۸ء میں شائع کیا تھا۔

اس میں سولہ افسانے شامل ہیں: ذات کا محاسبہ، خوردسال، ہزار پایہ، اقبال جرم، الزام سے الزام تک، بہوا، پہلا پتھر، خودشناس، چھمو، واماندگی شوق، مات، حسن خاتمہ، توبہ شکن، پسپائی، پیا نام کا دیا، ہوتے ہواتے۔

اس مجموعے میں شامل''واماندگی شوق''بانو قدسیہ کا پہلا افسانہ تھا۔جو ادب لطیف میں ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔''واماندگی شوق'' کی کہانی ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے مختلف معاشی اور مذہبی طبقے ایک دوسرے سے تعلق تو ضرور رکھتے ہیں لیکن دل کے معاملے اور محبت کے مسئلے میں ان کی عصبتیں بڑی شدید ہیں لہذا محبت کرنے والے اپنے المناک انجام کو تو پہنچ سکتے ہیں لیکن ان طبقوں کے مابین کسی نوعیت کا پل نہیں بن سکتے۔بانو قدسیہ کے ہاں ارضی محبت صداقتوں کے ساتھ ہویدا ہوتی ہے۔مثلاً افسانہ''توبہ شکن''آئیڈیل پرست لڑکیوں کے مصائب نامے کی فقط ایک جھلک سامنے لاتا ہے لیکن اس جھلک کا مقصد آئیڈیل اور آدرش کے مرتبے کو کم کرنا نہیں ہے بلکہ آدرش

پسندوں کو زمینی حقائق کا تجزیہ کرنے کی جانب راغب کرنا ہے۔

بانو قدسیہ، ''توجہ کی طالب'' (افسانوی کلیات)، صفحات: ۷۹۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

تین افسانوی مجموعوں پر مشتمل کلیات ''توجہ کی طالب''، پہلی بار سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا گیا تھا۔

''توجہ کی طالب'' شامل مجموعے یہ ہیں: امر بیل، بازگشت، کچھ اور نہیں۔

''کچھ اور نہیں'' بانو قدسیہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار مکتبہ اردو لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ (اور صفحات کی تعداد ۳۵۳ تھی) سنگ میل پبلی کیشنز نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں شائع کیا تھا (اور صفحات کی تعداد ۲۴۷ تھی)

اس مجموعے میں شامل نو افسانوں کی سابق ترتیب کچھ یوں تھی:

توجہ کی طالب، یہ رشتہ و پیوند، کال کلیجی، بکری اور چرواہا، ایک اور ایک، کرکل، انتر ہوت اداسی، کلو، مراجعت۔

زیر نظر افسانوی کلیات ''توجہ کی طالب'' میں مجموعہ ''کچھ اور نہیں'' کے افسانوں کی ترتیب اس طرح ہے:

توجہ کی طالب، کلو، کال کلیجی، یہ رشتہ و پیوند، بکری اور چرواہا، انتر ہوت اداسی، کرکل، مراجعت، ایک اور ایک۔

اس مجموعے کے افسانوں میں ''انتر ہوت اداسی'' اور ''کلو'' کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی؛ ''کلو'' پاکستان ٹیلی ویژن پر ڈرامائی تشکیل کے بعد نشر ہوا تو اسے قارئین کے ساتھ ساتھ ناظرین کا وسیع حلقہ بھی میسر آ گیا۔ افسانہ انتر ہوت اُداسی کو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اُردو افسانے کی روایت (مطبوعہ ۱۹۹۱ء ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد) میں بانو قدسیہ کے بہترین افسانے کے طور پر شامل کیا ہے۔

کلیات ''توجہ کی طالب'' میں شامل افسانوی مجموعہ ''بازگشت'' پہلی بار شیش محل کتاب گھر لاہور سے شائع ہوا تھا (سن اشاعت ندارد) سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام مجموعہ بازگشت ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل افسانوں کے عنوان یہ ہیں:

مجازی خدا، باپ پرست، دانت کا دستہ، کاغذی ہے پیرہن، بیوگی کا داغ، بازگشت، جٹ، بکرا فقیرا، چابی، فلورہ اور فریدہ، نیلوفر۔

اس مجموعے کے افسانے محبت کے متنوع روپ، عورت کے مختلف مصائب اور جذبات کی ترسیل، تحلیل اور تطہیر کی متعدد ابعاد کو سامنے لاتے ہیں۔

کلیات میں شامل مجموعہ ''امر بیل'' پہلی بار مکتبہ اردو، لاہور نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا تھا، سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام یہ مجموعہ ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا (اور صفحات کی تعداد ۲۴۷ تھی) اس مجموعے کے افسانے درج ذیل ہیں:

ہو نقش اگر باطل، سوغات، کتنے سو سال، سامان شیون، پریم جل، موج محیط آب میں، سمجھوتہ، ناخواندہ، امر بیل۔

آخری افسانہ ''امر بیل'' ایک طویل افسانہ ہے جو محبت کے اس روپ کو سامنے لاتا ہے جب وہ امر بیل بن کر پورے وجود کی شادابی کو کھا جاتی ہے۔ (گویا محبت کے ہاتھوں خودکشی کرنے والا اپنا قاتل نہیں بلکہ مقتول ہے، امر بیل نے اسے مارا ہے۔)

افسانے کتنے سوسال: ''پرانے مسلمانوں'' کا ''نئے مسلمانوں'' کے ساتھ منفی اور متعصّبانہ رویہ سامنے لاتا ہے؛ اس افسانے کا موضوع بانو قدسیہ کے عمومی افسانوی موضوعات سے مختلف ہے۔

سنگ میل کے زیر اہتمام مذکورہ کلیات میں شامل تینوں مجموعے الگ الگ کتابی صورتوں میں بھی متعدد بار شائع ہو چکے ہیں۔

بانو قدسیہ، ''چہار چمن''، صفحات: ۵۹۹، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

مجموعہ ''چہار چمن'' سنگ میل نے پہلی بار ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں بانو قدسیہ کے چار ناول/ ناولٹ: ایک دن، پروا ،موم کی گلیاں اور شہر بے مثال شامل ہیں۔

''شہر بے مثال'' بانو قدسیہ کا پہلا ناول ہے جسے پہلی بار الحمرا پبلشرز لاہور نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا (اور اس کے کل صفحات ۳۴۲ تھے) ''شہر بے مثال'' بنیادی طور پر ایک کردار کی کہانی ہے لیکن اس کردار کے داخلی اضطراب اور خارجی مصائب کی تصویر کچھ اس طرح سامنے آتی ہے کہ شہر بے مثال (لاہور) کی ساری تہذیبی شخصیت اپنے روشن و تاریک پہلوؤں کے ساتھ منکشف ہونے لگتی ہے۔ ناول میں واقعے کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے مختلف حکایتوں کا سہارا لے کر ''ان کہے'' کو کہنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ انداز زیادہ وضاحت، خوبی اور پختگی کے ساتھ ان کے ناول ''راجہ گدھ'' میں سامنے آیا ہے۔

ناولٹ ''موم کی گلیاں'' اشفاق احمد کے رسالے ''داستان گو'' میں ستمبر ۱۹۵۸ء کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ''موم کی گلیاں'' کا موضوع قدرت کے مقصد افزائش کے تناظر میں مرد و عورت کے مابین محبت کا جذبہ ہے۔ ناولٹ میں شہد کی مکھیوں کے چھتہ بنانے کے عمل، ملکہ مکھی کی جانب نرگس کی پیش قدمی اور وصل یا محرومی وصل دونوں صورتوں میں نرگس کا موت سے ہم کنار ہونے کا المیہ کہانی کو روشن اور تناظر کو تہہ دار کرتا ہے۔

ناولٹ ''پُروا'' پہلی بار داستان گو، لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ''پُروا'' کی کہانی ایک محبت کی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے عقب میں پاکستانی معاشرے کے مختلف رویے خصوصاً حصول دولت کے منفی ہتھکنڈے اور نسلی و علاقائی تفاخر نظر آ رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ (سابق) مغربی پاکستان کا (سابق) مشرقی پاکستان کے حوالے سے منفی ذہن، جھوٹی انا اور احساس برتری پوری وضاحت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ''پروا'' کی کہانی کے انجام کو خوش انجام کہہ سکتے ہیں کیونکہ آخر کار اہل دل، ''اہل دماغ'' اور اہل تعصب کو شکست دے کر دوریوں کو قربتوں میں بدل دیتے ہیں۔ ناولٹ ''ایک دن'' کا موضوع محبت کے تصورات کے ہاتھوں، محبت کرنے والوں کی شکست ہے۔ ناولٹ میں مرد ارضی رومان یا لمسی محبت کا قائل ہے اور عورت افلاطونی، آسمانی اور فقط روحانی محبت کے حق میں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اٹل ہیں سو دونوں ٹوٹ جاتے ہیں اور یہی ان کا المیہ ہے۔ مصنفہ محبت کے تصورات کو توازن سے ہم کنار کرنا چاہتی ہیں لیکن جانتی ہیں کہ محبت کے تصورات ارزاں ہیں اور توازن نایاب و ناپید ہو چلا ہے۔

چہار چمن میں شامل چاروں ناولوں کے (الگ الگ کتابی صورتوں میں بھی) سنگ میل کے زیر اہتمام متعدد ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔

بانو قدسیہ، ''دوسرا دروازہ''، صفحات: ۳۶۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

تنکے کا سہارا، نیت شوق، مراۃ العروس ثانی، ٹیکنالوجی، سنہری فصل، خانہ جنگی، ہونی کا لمحہ، دربدر، بیٹے کا خط، پریم بولی، ٹائیگرازم، ترقی کی ٹرین، قطبی ستارہ، سنیاس، شناخت، کعبہ میرے پیچھے، ذات کی چیستاں، زمین سخت آسمان دور، خالی کمند، نقل مکانی، دشت امکان۔

بانو قدسیہ حقیقت نگار ہیں لیکن ان کے ہاں حقیقت نگاری نہ تو کسی معروف سیاسی و معاشی نظریے کے تابع ہے اور نہ ہی طنز و تشنیع کے ہتھیاروں سے معاشرے کی اخلاقی حساسیت پر حملہ آور ہے۔ زیر نظر مجموعے کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ فنکار معاشرے کا نباض اور حق گو ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ہمدرد، خلیق اور خوگر محبت بھی ہے۔

بانو قدسیہ، ''راجہ گدھ''، صفحات: ۴۵۲، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

راجہ گدھ۔ بانو قدسیہ کا دوسرا ناول اور ان کے فکر و فن کا اہم ترجمان ہے۔ پہلی بار سنگ میل پبلی کیشنز سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے فلیپ پر اشفاق احمد کی یہ رائے درج تھی: ''راجہ گدھ اردو زبان میں ایک اور طرح کا ناول ہے جو آئندہ کے لکھنے والے کے لیے سوچ کی نئی راہیں کھولے گا''۔ ناول کا تناظر قیام پاکستان کے بعد کی معاشرت اور فکری صورتحال ہے۔ ناول کا بنیادی موضوع اسلام کا تصور حلال و حرام ہے۔ گدھ کی تمثیل کو انسان پر لاگو کر کے بتایا گیا کہ انسان میں حرام رزق اور فعل سے اسی طرح کی دیوانگی پیدا ہو جاتی ہے جیسی گدھ میں مردار کھانے سے جنم لیتی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار قیوم ہے اور ناول بنیادی طور پر صرف اس کی سوانح محسوس ہوتا ہے لیکن اس سوانح میں مرکز سے گریز اور دیگر کرداروں کو اپنے سے آمیز کرنے کی قوت بھی ہے؛ اس لیے اپنے اپنے مقام پر آفتاب، سیمی، پروفیسر سہیل اور امتل وغیرہ کے کردار بھی مرکزی کردار نظر آنے کی صلاحیت سے متصف نظر آتے ہیں۔ ناول فلسفیانہ مزاج رکھتا ہے؛ اس میں پیش کردہ بنیادی نظریہ اور مابعد الطبیعاتی زاویہ: کئی نزاعی بحثوں کا باعث بنا ہے؛ تاہم تمام تر تنازعوں اور تلخ و ترش تنقیدوں کے باوجود اس ناول کی مقبولیت قائم و دائم ہے (راجہ گدھ کا پاکستان میں بائیسواں ایڈیشن ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے؛ قبل ازیں صرف ایک سال (۲۰۰۲ء) میں تین ایڈیشن شائع ہوئے تھے)۔ بائیس ایڈیشنوں کی سن وار تفصیل یہ ہے:

پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء، دوسرا ایڈیشن ۱۔۱۹۸۱ء، تیسرا ۱۹۸۲ء، چوتھا ۱۹۸۸ء، پانچواں ۱۹۸۹ء، چھٹا ۱۹۹۲ء، ساتواں ۱۹۹۴ء، آٹھواں ۱۹۹۵ء، نواں ۱۹۹۵ء، دسواں ۱۹۹۷ء، گیارہواں ۱۹۹۷ء، بارہواں ۱۹۹۸ء، تیرہواں ۱۹۹۸ء، چودھواں ۱۹۹۹ء، پندرھواں

۲۰۰۰ء،سولہواں ۲۰۰۱ء،سترہواں ۲۰۰۲ء،اٹھارواں ۲۰۰۲ء،انیسواں ۲۰۰۲ء،بیسواں ۲۰۰۴ء،اکیسواں ۲۰۰۴،بائیسواں ۲۰۰۵ء۔

(۲۰۰۲ء میں تین اور ۱۹۸۱ء، ۱۹۹۵ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸، اور ۲۰۰۴ء میں دو دو ایڈیشنز شائع ہوئے)۔

پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۸۱) کی قیمت ۶۰ روپے تھی جبکہ بائیسویں ایڈیشن (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) کی قیمت ۴۰۰ روپے ہے۔

بانو قدسیہ، ''سامان وجود''، صفحات: ۲۰۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

ابن آدم، منسراج کا بین، نیو ورلڈ آرڈر، تنگی دل، شہر کافور، خاکستری بوڑھا، موسم سرما میں نیلی چڑیا کی موت، صدمہ آواز، شوق ہاتھی کا سواری چوہے دل کی، نفس نارسا، اسباق الثلاثہ، کنج کلاہ، شطرنج چال۔

بانو قدسیہ عورت کے باطنی رویے اور داخلی مسائل بڑی خوبی سے پیش کرتی ہیں لیکن ان سب پہلوؤں کا تجزیہ اور حاصل تجزیہ صرف اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پیش کرتی ہیں جس میں مابعد الطبیعاتی عناصر حاوی نظر آتے ہیں۔

بانو قدسیہ کا اسلوب سادہ اور حد درجہ ذاتی ہے؛ اس میں نمایاں اور مروجہ نثری اسالیب کا کہیں کوئی شائبہ نہیں ہے۔

بانو قدسیہ، ''نا قابل ذکر''، صفحات: ۲۹۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

افسانوی مجموعہ ''نا قابل ذکر'' سنگ میل پبلی کیشنز نے پہلی بار ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں درج ذیل بارہ افسانے شامل ہیں:

دورنگی، پابند، شاہراہ، حجاب، گجھی مار، بڑا ابول، مشک نافہ، رنگروٹ، کینچلی، کیمیا گر، جھکورا، روس سے معذرت کے ساتھ۔

''نا قابل ذکر'' کے افسانوں میں بانو قدسیہ نے سماج کے دکھوں پر اپنے کرب کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ اس مجموعے کا آخری افسانہ ''روس سے معذرت کیساتھ'' روس کے نظام کی شکستگی کی پیش گوئی بھی ہے اور کٹر نظریاتی اور آدرش پسند مرد و عورت کی محبتوں کا المیہ بھی۔ افسانہ ''بڑا ابول'' کا موضوع سماجی بڑوں کا تکبر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اقدار کی شکست و ریخت کا بنیادی سبب انسان کو انسان نہ سمجھنے کی روش ہے۔ مجموعی طور پر بانو قدسیہ کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ کرداروں کی تحلیل نفسی بھی ان کے ہر افسانے کا خاصا ہے لیکن یہ تحلیل، فن کی تخریب کا باعث بننے کے بجائے اس کی تکمیل کا سبب بنتی ہے۔

بذلِ حق محمود (مترجم)، ''سگِ آوارہ اور ایران کے دیگر منتخب افسانے''، صفحات: ۳۲۰، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

کتاب کے آخر میں مترجم اور زیر نظر تراجم کے حوالے سے درج ہے:

> ''۱۹۷۸ء میں بذلِ حق محمود نے مشہور ایرانی افسانہ نگار صادق ہدایت کے فارسی افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل کتاب ''سگِ آوارہ'' پیش کی۔ ۱۹۸۰ء میں ان کا ایران کے مختلف افسانہ

نگاروں کی تخلیقات کے اردو تراجم کا مجموعہ ''محرم راز'' شائع ہوا۔ زیرِنظر کتاب میں بذلِ حق محمود کے مترجمہ افسانوں کے یہ دونوں مجموعے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔...... بذلِ حق محمود مرحوم ایک شائستہ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ بطور محقق، مصنف اور مترجم انہیں ادب میں ایک منفرد مقام حاصل تھا''۔(مضمون: ''بذلِ حق محمود اوران کے مترجمہ افسانے''ص:۳۱۴)

زیرِنظر کتاب میں پہلا حصہ: صادقِ ہدایت کے بیس افسانوں پر مشتمل مجموعہ ''سگِ آوارہ'' ہے، دوسرے حصے میں: بارہ منتخب افسانے محمد حجازی، جلال آل احمد، سعید نفیسی (چھ افسانے) جہانگیر جلیلی، سید فخر الدین شادمان، صادق ہدایت وغیرہ کے ہیں۔ اس مجموعے کا دیباچہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا لکھا ہوا ہے۔ بذلِ حق محمود کے تراجم تخلیقی اور رواں دواں ہیں۔

بشریٰ اعجاز، ''بارہ آنے کی عورت''، صفحات:۱۹۶، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''بارہ آنے کی عورت''۔ بشریٰ اعجاز کا ایک اہم افسانوی مجموعہ ہے۔ بشریٰ اعجاز کی شاعری اور افسانہ نگاری ایک ہی مدار کے دو مختلف حصے ہیں جو ایک دوسرے کے روبرو ہیں لیکن متصادم نہیں۔ زیرِنظر مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

فیری لینڈ، دل اور دائرہ، چھوٹی ماں، ابابیل، گلابی کاغذ، گناہ، رحمورام ریان والی، گتھی، سکوت شب کا سفر، سانپ اور سایہ، جلسہ گاہ، کبوتر اور بلی، درد کیوں لا دوا نہیں ہوتا، مثال، حل، عمر میری تھی مگر......، چراغ اور کٹیا، چھوٹی مسجد کا شیطان، صبح، بارہ آنے کی عورت، حاجی سلطان احمد کی لاڈلی۔

کتاب کے پس سرورق پر درج نصیر احمد ناصر کی رائے کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

> ''بشریٰ کے پاس بھی ''باپ، ماں اور بیٹا'' کی طرح ایک تثلیث ہے اور وہ ہے خدا، ماں اور محبت۔ اس کی نظر میں اس تثلیث کے بغیر کوئی کائنات وجود پا ہی نہیں سکتی..... ماں خدا کا ارضی روپ ہے۔ خدا ماں کا الوہی روپ ہے۔ محبت خدا ہے اور عورت محبت ہے۔ بشریٰ کے ہاں یہ تینوں اتنی پیچیدگی کے ساتھ اپنی سرحدیں ایک دوسرے میں گم کرتے ہیں کہ کچھ پتا نہیں چلتا کون کہاں سے شروع ہوا اور کون کہاں ختم ہوا۔ کسی ایک کو الگ کرنے کی کوشش کی جائے تو کائنات کا جغرافیہ درہم برہم ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں تادیر ملول رکھنے والی بے رحمانہ کیفیت پائی جاتی ہے، تثلیث کے کسی نہ کسی زاویئے کی گمشدگی کا نوحہ ہے، تکمیل اور عدم تکمیل کا المیہ ہے اور عموماً ان کہانیوں کے کائناتی جغرافیے ایک خاص ترتیب کے ساتھ منتشر رہتے ہیں۔ یہی اس کے فن کی مضبوط اساس ہے''۔(پس سرورق)

پریم چند، ''شطرنج کے کھلاڑی''، صفحات:۱۱۲، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''شطرنج کے کھلاڑی'' پریم چند کے نو افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے؛ ان میں سے افسانہ ''کفن'' کو بین الاقوامی شہرت اور اردو افسانے میں کلاسیک کا رتبہ حاصل ہے۔ ''کفن'' کے علاوہ اس مجموعے میں شامل درج ذیل افسانے یہ ہیں:

شطرنج کے کھلاڑی، عیدگاہ، دو بیل، حج اکبر، پنچائیت، بٹوارہ، سوا سیر گیہوں، بوڑھی کاکی۔

زیرِنظر مجموعے میں تعارف کے عنوان سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اس صدی کی پہلی دہائی کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی تناظر کو ملحوظ رکھ کر پریم چند نے افسانوں کیلئے خارجی حقیقت نگاری پر مبنی اندازِ تحریر اپنا کر واقعیت نگاری کی طرح ڈالی..... پریم چند نے ترقی پسند ادب کی تحریک سے بہت پہلے ترقی پسندانہ اندازِ نظر اور اندازِ تحریر اپنایا یوں وہ ترقی پسندوں کے ہراول قرار پائے ہیں''۔ (ص ۶، تاریخ تحریر: ۱۵/مئی ۱۹۷۷ء)

پریم چند ''منشی، گئودان''، صفحات:۲۰۸، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

''گئودان''، منشی پریم چند کا مقبول و معروف ناول ہے؛ جو پہلی بار ۱۹۳۶ میں شائع ہوا تھا۔

''گئودان'' بظاہر ایک دیہاتی گھرانے کی کہانی ہے لیکن اس کے ذریعے پورے برصغیر کی دیہی زندگی کے مسائل، مصائب، خوبیاں اور خرابیاں سب سامنے آجاتی ہیں۔ ناول کا ایک نسوانی کردار ''دھنیا'' اردو کے افسانوی ادب کا ایک اہم، طاقت ور اور مزاحمت پسند کردار ہے؛ یہ دیہاتی خاتون ہر قسم کے استحصال کے خلاف ایک انقلاب کی علامت نظر آتی ہے۔ ''گئودان'' میں گاؤں کی جیتی جاگتی زندگی کو ایک دلچسپ کہانی بنا دینا پریم چند کے فنی کمالات میں سے ایک ہے۔ اس ناول کا کوئی واقعہ اور کردار ایسا نہیں ہے جو فقط تخیلاتی ہو اور کوئی مکالمہ ایسا نہیں جو مصنوعی ہو۔ پریم چند کے ایک درجن سے زائد ناولوں میں ''گئودان'' اپنی خاص اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

پریم چند، ''مجموعہ پریم چند'' (افسانے)، صفحات:۹۲۸، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۲ء

''مجموعہ پریم چند''۔ پریم چند کے ۱۱۸ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اور آخری افسانہ ''قاتل کی ماں'' ہے۔

زیرِنظر افسانوی کلیات کا تعارف ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے، وہ پریم چند کے فکر و اسلوب کے حوالے سے کہتے ہیں:

''پریم چند نے اردگرد پھیلی زندگی کے تضادات، افراد کے رویوں میں تنوع، انسانی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے، اقتصادی ناہمواری، سماجی عدم مساوات اور غلام ہند کی سیاسی صورتحال کے

تجزیہ اور مطالعہ کے لیے اپنے افسانوں اور ناولوں کو بھی محدب شیشہ میں تبدیل کر لیا۔ انہوں نے اس خوبی سے کردار واعمال کی توضیح کی کہ آج بھی ان کے افسانوں کا مطالعہ بصیرت افروز ثابت ہوسکتا ہے''۔(ص ۷)

سنگ میل کی افسانوی مطبوعات میں پریم چند کا زیرنظر افسانوی کلیات ایک اہم اضافہ ہے؛ علاوہ ازیں پریم چند کے تمام افسانوں کا ایک ضخیم جلد میں یکجا ہونا پریم چند کی مقبولیت اور افسانوی اہمیت کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ سنگ میل نے ۲۰۰۳ء میں پریم چند کے ناولوں پر کلیات بعنوان ''مجموعہ پریم چند (ناول)'' بھی شائع کیا ہے اور اسے بھی ایک اہم ادبی اشاعت کے طور پر سراہا گیا ہے۔ (ہمارا مطالعہ چونکہ ۲۰۰۲ء تک کی مطبوعات تک محدود ہے لہٰذا مجموعہ پریم چند (ناول) توضیحی کتاب میں شامل نہیں)۔

ثریا شہاب، ''بارشوں کے موسم میں''، صفحات: ۱۴۱، زیرنظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''بارشوں کے موسم میں'' ثریا شہاب کا ناول ہے جس میں حقیقت اور رومان نے باہم آمیز ہو کر کہانی اور کرداروں کی تشکیل کی ہے۔ انتظار حسین، ثریا شہاب کے ناول پر اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''یہ دو ذائقوں والا ناول ہے... اس ناول میں حقیقت نگاری کا ذائقہ بھی ملے گا۔ ناول کی ابتدا میں انہوں نے آشوب زدہ کراچی کا جیسا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کی مثال منجھے ہوئے حقیقت نگاروں کے یہاں سے بھی کسی قدر مشکل سے برآمد ہوگی۔ مگر پتہ یہ چلا کہ حقائق و واقعات کی دنیا انہیں زیادہ دیر تک باندھ کر نہیں رکھ سکتی۔ پھر ثریا شہاب.... ایک خوبصورت سی رومانی دنیا تعمیر کرتی ہے.... زندگی کی تلخ حقیقتیں یہاں بھی ہیں مگر وہ رومانی یادوں کے عمل سے گزر کر کتنی حسین نظر آنے لگتی ہیں''۔(پس سرورق)

جمیلہ ہاشمی، ''تلاشِ بہاراں''، صفحات: ۴۳۲، زیرنظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

''تلاشِ بہاراں'' جمیلہ ہاشمی کا پہلا ناول ہے؛ ۱۹۶۱ء میں اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے پہلی بار شائع ہوا تھا؛ خوب معروف و مقبول ہوا اور آدم جی ادبی ایوارڈ حاصل کیا۔ ناول کی کہانی کا زمانہ: آزادی ہند سے ذرا پہلے سے لے کر ۱۹۴۷ء کے فسادات تک کا ہے۔ تلاش بہاراں، اصل میں تلاشِ آزادی ہے؛ ناول کا زمانہ بھی تحریک آزادی کا ہے لیکن بنیادی طور پر کہانی کا موضوع عورت اور اس کی فلاح و بہبود ہے۔ ناول کی مرکزی کردار کنول کماری ٹھاکر ایک مثالی کردار کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے؛ وہ حقیقی دنیا کے مسائل حل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن خود حقیقی اور اس دنیا کی شخصیت نظر نہیں آتی۔ اس ناول میں رومانیت کا عنصر، کہانی اور کردار نگاری سے لے کر اسلوب بیان تک اپنی خوش رنگ دُھند اور ماورائی جمالیات قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس ناول کو آدم جی ادبی ایوارڈ ملنا، اردو ادب کے متنازع معاملات

میں سے ایک ہے۔

جمیلہ ہاشمی، ''دشتِ سوس''، صفحات:۵۰۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۲ء

ناول ''دشتِ سوس''۔ پہلی بار ۱۹۸۳ء میں رائٹرز بک کلب، لاہور نے شائع کیا تھا۔ ''دشتِ سوس''۔ معروف صوفی حسین ابن منصور حلاج کی تاریخی داستان ہے۔ جو ایک المیے پر منتج ہوتی ہے۔ ناول میں حلاج کی داستان تین حصوں میں پیش کی گئی ہے: صدائے ساز، نغمۂ شوق، زمزمہ موت۔ ناول داستانی انداز اور تاریخی پیرائے میں طبیعات سے مابعد الطبیعات کی طرف بڑھتا ہے اور حلاج کی سوانح، فکر و فلسفے اور مقام و مرتبے کو آشکار کرتا چلا جاتا ہے۔

ناولوں اور افسانوں میں شاعرانہ اندازِ بیان جمیلہ ہاشمی کی خاص پہچان ہے، اور یہ انداز دشتِ سوس میں بھی برقرار ہے۔ ''دشتِ سوس'' میں حلاج کے حوالے سے کچھ تاریخی واقعات درست تناظر میں پیش نہیں ہو سکے ہیں۔

حجاب امتیاز علی، ''احتیاطِ عشق''، صفحات:۲۵۳، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''احتیاطِ عشق'' میں عشق کی وارفتگی کے افسانے ہیں۔ حجاب امتیاز علی کا فن شعریت اور احساسِ جمال سے عبارت ہے؛ ایک طویل عرصے تک' اپنے مخصوص اسلوب میں رنگین افسانوں کی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھ کر انھوں نے اپنی تخلیقی قوت کو کم و بیش سب سے منوالیا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں پچیس افسانے ہیں؛ چند افسانوں کے عنوان یہ ہیں:

یہاں سوس محوِ خواب ہے، وہ طریقہ بتاؤ تمھیں چاہیں کیونکر، میں پرُ سے کوئی تھی، صورت شمع انجمن تنہا، احتیاطِ عشق، پے انگ گیسٹ، کارِ جہاں، لمبا رستہ۔

افسانہ: ''پے انگ گیسٹ''، ''ماہ نو'' کے اپریل ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور اسے خصوصی توجہ حاصل ہوئی تھی۔

حجاب امتیاز علی، ''اندھیرا خواب''، صفحات:۲۵۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''اندھیرا خواب''۔ حجاب امتیاز علی کا دوسرا ناول ہے جو پچاس کی دہائی میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول میں بھی حجاب کے پہلے ناول ''ظالم محبت'' کی مانند ایک تخلیاتی فضا موجود ہے؛ اس کے علاوہ پہلے ناول کے کچھ کردار: کہانی نگار، روحی اور بوڑھا ڈاکٹر گار بھی کہانی کا حصہ ہیں۔ اردو ناول میں کچھ کرداروں کو مستقلاً اپنے ناولوں میں شامل رکھنا حجاب امتیاز علی کی منفرد داُپچ ہے۔ اندھیرا خواب کی مرکزی کردار ایک نفسیاتی مریضہ ہے اور اس کے توسط سے انسانی نفسیات کی مختلف پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں۔ اس ناول کو بھی حجاب امتیاز علی کے دیگر ناولوں کی طرح اب تک عوامی مقبولیت حاصل ہے۔

حجاب امتیاز علی، ''پاگل خانہ''، صفحات:۳۴۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۵ء

''پاگل خانہ''۔حجاب امتیاز علی کا تیسرا ناول ہے جو ۱۹۸۰ء میں ارادۂ تاج وحجاب لاہور سے شائع ہوا تھا۔اس ناول میں حجاب نے اپنی مخصوص طلسماتی فضا کو قائم رکھنے کے لیے سائنس فکشن کا سہارا لے کر ایک نیا انداز اختیار کیا۔ناول بنیادی طور پر جدید دور اور سائنسی ترقی کے منفی رُخ کو سامنے لاتا ہے، جرائم ،جنگیں، امراض، اسلحے کی بھرمار، ایٹمی دھماکے، تابکاری اثرات دیکھتے ہوئے مصنفہ اس جدید دنیا کو بجا طور پر ''پاگل خانہ'' قرار دیتی ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کے پیش لفظ (مرقومہ: ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء) اور مصنفہ کے دیباچے (دیباچہ دل) میں ناول کے موضوع کی وضاحت اور جدید دنیا کی تخریبی سوچوں اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اندرون سرورق پر ناول کے عنوان ''پاگل خانہ'' کے نیچے ایک ذیلی سرخی بھی درج ہے: ''تلاش امن کا سفر اور مستقبل کی دنیا کے متعلق چند سائنسی نظریات''۔

حجاب امتیاز علی، ''صنوبر کے سائے اور دوسرے رومان''، صفحات: ۳۱۷، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

زیرِنظر مجموعہ حجاب امتیاز علی کی درج ذیل کتابوں پر مشتمل ہے:

صنوبر کے سائے، موم بتی کے سامنے، نغماتِ موت، ادب زریں۔

''صنوبر کے سائے''۔حجاب امتیاز علی کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس میں صنوبر کے سائے، اندھی محبت، مرد اور عورت، مرحوم بیوی، نجومی کی وصیت، سبز آنکھ، فورسڈ لیڈنگ کے عنوان سے افسانے شامل ہیں۔

''موم بتی کے سامنے'' ان کے روزنامچوں کا مجموعہ ہے جو وہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں، جنگ کے ہی حوالے سے، رات کو بلیک آؤٹ کے باعث صرف ایک موم بتی کی روشنی میں لکھا کرتی تھیں۔''موم بتی کے سامنے'' میں حجاب کی اپنے وطن کے لیے تڑپ اور اہلِ وطن کے لیے محبت ہر سطر سے ظاہر ہو رہی ہے۔اس مجموعے کا دیباچہ امتیاز علی تاج نے لکھا تھا۔

''نغماتِ موت'' حجاب کی نثری نظموں یا شاعرانہ نثر پاروں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس کا دیباچہ عبدالحمید حسن نے لکھا تھا۔''ادب زریں'' مختلف موضوعات پر مختصر، خوبصورت اور خیال انگیز نثر پاروں کا مجموعہ ہے۔بعض نثر پاروں کے عنوان تلے کبھی نظم نما نثر اور کبھی شعر منثور لکھا ہوا ملتا ہے۔مجموعی طور پر زیرِنظر مجموعہ حجاب امتیاز علی کی تخلیقی نثر کا ایک بھرپور ترجمان ہے۔

حجاب امتیاز علی، ''ظالم محبت''، صفحات: ۲۶۴، زیرِنظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''ظالم محبت''۔حجاب امتیاز علی کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۴۰ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا تھا۔

''ظالم محبت'' کی کہانی دو دوستوں کی محبت اور ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کے جذبے پر استوار ہوئی ہے۔ناول ایک تخلیاتی اور طلسماتی ماحول کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے؛ اس ناول کا ماحول بعد ازاں حجاب امتیاز علی کے تمام ناولوں میں پوری طرح موجود رہا ہے؛ اس ناول کے چند کرداروں سے بھی حجاب کے دیگر ناولوں میں قارئین کی ملاقات رہتی ہے۔

حجاب امتیاز علی، ''میری ناتمام محبت اور دوسرے افسانے''، صفحات:۱۳۶، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

میری ناکام محبت۔ ایک طویل افسانہ/ ناولٹ ہے۔ پہلی بار نیرنگ خیال میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۲ء ہی میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ''میری ناتمام محبت اور دوسرے رومانی افسانے'' کے عنوان سے مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس طویل افسانے میں ایک رومانی فضا پوری کہانی میں موجود ہے۔ ''روحی'' کا کردار پہلی بار یہیں جلوہ گر ہوتا ہے اور پھر حجاب امتیاز علی کے تمام ناولوں میں موجود رہتا ہے۔ حجاب نے پیش لفظ میں اپنے پہلے افسانے ''میری ناتمام محبت'' کے لکھے جانے کا قصہ سنایا ہے۔

''میری ناتمام محبت'' کے علاوہ مجموعے میں شامل دو افسانے یہ ہیں: ''نارنگی کی کلیاں''۔ ''نادیدہ عاشق''۔

حجاب امتیاز علی (مترجم)، ''ننھی بیبیاں''، صفحات:۳۹۷، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''ننھی بیبیاں''۔ امریکی مصنفہ لویزا مے الکاٹ (پیدائش:۱۸۳۲ء) کے مقبول عام ناول Little Woman کا ترجمہ ہے۔ مترجم کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان لکھا گیا اور اس نے امریکی ہی نہیں پورے انگریزی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیا۔ حجاب امتیاز علی بتاتی ہیں: ''اس ناول کا تعلق امریکہ کے نچلے متوسط طبقے کے ایک خاندان سے ہے۔ اس میں وہاں کی اس زمانے کی زندگی کا بہت صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے''۔ اصل ناول میں موجود نظموں کا ترجمہ حجاب امتیاز علی کی درخواست پر شوکت تھانوی نے کیا تھا۔ ناول تیئیس ابواب پر مشتمل ہے۔

''ننھی بیبیاں''۔ پہلی بار دارالاشاعت، پنجاب' لاہور سے شائع ہوا تھا (تاریخ اشاعت درج نہیں تھی)۔

حجاب امتیاز علی، ''وہ بہاریں یہ خزائیں''، صفحات:۲۷۲، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

''وہ بہاریں یہ خزائیں'' اٹھارہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے؛ اور یہ پہلی بار دارالاشاعت پنجاب، لاہور کے زیرِ اہتمام میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا؛ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود اس مجموعے کی مقبولیت قائم ہے۔

''وہ بہاریں یہ خزائیں'' کے افسانوں میں وہ رومانی ماحول اور جمالیاتی اسلوب موجود ہے جو حجاب امتیاز علی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سہارا بھی ہے اور ان کی انفرادیت کی سند بھی۔ زیرِنظر مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

وہ بہاریں یہ خزائیں، طوفانی دوپہر، وہ گر پڑا، خزاں نے لوٹ لیا، ڈھلتی شامیں، صبح کا ناشتہ، تاریکیاں، یہ حادثے، یہ فالتو لوگ، زہرہ سے ملاقات، پتھر، کنواں، ہاون شرے کا سٹیشن، خاندانی تصویر، یہ انسان، بارش، مینہ، راہ گزر۔

حمید یزدانی، خواجہ، ڈاکٹر، (ترتیب و ترجمہ)، ''پس پردہ گڑیا (ایرانی افسانے)، صفحات:۲۲۸، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی نے زیرِنظر کتاب میں ایرانی افسانے کی روایت کو نہایت رواں اور تخلیقی ترجمے کے ذریعے پیش کیا ہے۔

اپنے پیش لفظ میں مترجم نے ایران میں داستان گوئی سے لے کر جدید افسانے کے سفر تک پر ایک نظر ڈالی ہے اور ترجمہ نگاری کے حوالے سے اپنے خیالات اور مشکلات کا اظہار کیا ہے۔ ایران کے درج ذیل افسانہ نگاروں کے مترجمہ افسانے کتاب میں شامل ہیں:

مطیع الدولہ محمد حجازی (پانچ افسانے)، بزرگ علوی (ایک افسانہ)، جلال آل احمد (دو افسانے)، ش۔ پرتو (ایک افسانہ)، اور صادق ہدایت (چھ افسانے؛ ''پس پردہ گڑیا'' بھی ان ہی کا افسانہ ہے جس پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے)' جمال زادہ، منصورہ شریف زادہ، فریدہ رازی، احمد علامی (ایک ایک افسانہ)

خالدہ حسین، ''پہچان''، صفحات: ۲۰۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

خالدہ حسین کی شہرت اور ان کے افسانے کی پہچان علامت اور تجرید ہے۔ خالدہ حسین نے تقریباً ہر علامت و تجرید نگار کی طرح افسانہ نگاری کا آغاز روایتی انداز سے ہی کیا لیکن بعد ازاں ان کا افسانہ ایک اور نئی دنیا (علامت و تجرید) کا باسی بن گیا لیکن انہوں نے اپنے روایتی اور ابتدائی انداز سے کہانی کہنے کی جو تربیت حاصل کی وہ تا حال ان کے افسانے میں افسانویت کو برقرار اور پڑھے جانے کی جوبی کو قائم رکھتی ہے۔ بقول انور سدید ''ان کی افسانہ نگاری دو ادوار پر منقسم ہے اور ''پہچان'' اور ''دروازہ'' کے افسانوں میں ایک حد فاصل موجود ہے''۔ (انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، اے۔ ایچ پبلشرز، ۱۹۹۶ء صفحہ ۵۳۳)

''پہچان'' میں کل سترہ افسانے شامل ہیں جن کا اسلوب، افسانہ نگار کے احساس کا محرمِ راز اور ان کی فکری رو کا پارکھ اور پرچارک ہے۔

خالدہ حسین، ''دروازہ''، صفحات: ۲۸۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

خالدہ حسین، اس افسانوی مجموعے کا غیر رسمی دیباچہ (جو ایک صفحے سے بھی کم ہے) ''اعتراف'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے کہتی ہیں: ''جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو لکھتی ہوں۔ کہانی لکھنے کا عمل میرے لیے اپنے وجود کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش ہے''۔ (ص ۱۳) ڈاکٹر محمد اجمل کتاب کے حرف اول میں رقم طراز ہیں:

> ''خالدہ حسین ہمارے جدید افسانہ نگاروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے ہاں داخلی خارجیت کے اسلوب کی طرح ڈالی ہے۔ داخلی خارجیت ایک نہایت جرات مندانہ اسلوب ہے....'' (ص ۷، ۸)

''دروازہ'' میں کل تئیس افسانے ہیں جو خالدہ حسین کے افسانوی ارتقا کا نیا موڑ سامنے لا رہے ہیں۔

خالدہ حسین، ''مصروف عورت''، صفحات: ۱۷۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

اس افسانوی مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے اور ایک ترجمہ (آئی۔ بی سنگر کی کہانی کا) ہے۔

''مصروف عورت'' میں شامل افسانے خالدہ حسین کی داخلی پیش رفت، مشاہدے کی سیر حاصل کیفیت، اسلوب کی پختگی اور لہجے کی بے تکلفی کو سامنے لا رہے ہیں، یہ اسلوب ہی ہے جو افسانے کی علامت کو ہمارے احساس اور تجرید کو ہماری تفہیم پر منکشف کرتا ہے۔ عموماً افسانے کا آغاز ایک چھوٹے سے فقرے سے ہوتا ہے اور پھر بات پھیل کر زماں و مکاں کو اپنے میں ضم کر لیتی ہے۔ زندگی میں کہانی کا آغاز بھی تو ایک چھوٹی سی بات سے ہوتا ہے اور پھر کہانی بذات خود ایک نئی کائنات کو تخلیق کر لیتی ہے۔

خدیجہ مستور، ''آنگن''، صفحات: ۳۱۸، سن اشاعت ندارد

اردو دنیا کا مشہور اور مقبول عام ناول ''آنگن'' پاک و ہند میں متعدد بار شائع ہوا۔ اس ناول کی کہانی بظاہر ایک غریب مسلمان گھرانے کے آنگن میں ہی برپا ہوتی ہے لیکن یہ آنگن پھیل کر پورے برصغیر کے آنگن میں بدل جاتا ہے اور برصغیر کا آنگن، پردیسیوں کے قبضے سے نکلنے کی راہ پر ہے اور پھر اس آنگن پر دنیا کا بہت بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ تقسیم اور ہجرت کا واقعہ۔

خدیجہ مستور نے اس بڑے واقعے کو اپنے کرداروں اور ان کی خواہشوں، خوابوں، محبتوں اور نفرتوں کے آئینے میں دیکھا اور دکھایا ہے، گویا ناول کا ہر کردار اس واقعے کی تشکیل بھی کر رہا ہے اور تفہیم بھی کرا رہا ہے۔ مرکزی کردار ''عالیہ'' اردو کے افسانوی ادب میں یادگار اور ہماری ادبی روایت میں اضافہ ہے۔ خدیجہ کا اسلوب ''سچی کہانی'' سنانے کے رس اور شوق سے لبریز ہے۔

خدیجہ مستور، ''بوچھار''، صفحات: ۱۳۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

''بوچھار''۔ خدیجہ مستور کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کے دیباچے میں اختر حسین رائے پوری رقم طراز ہیں:

> ''مجھے یقین ہے کہ ناظرین ان (افسانوں) میں ایک انوکھا پن دیکھیں گے۔ جو ان مرد افسانہ نگاروں میں کم یاب ہے، جن کا خاص موضوع جنسی ہے.... وہ جو کچھ کہتی ہیں اس میں بڑی اصلیت ہے اور کہتے وقت وہ لگی لپٹی نہیں رکھتیں''۔ (ص ۱۰)

مجموعے میں یہ افسانے شامل ہیں: عسق، ہنھ، چپکے چپکے، لاشیں، یہ بڑھے، چیلیں، کیا پایا، جوانی، یہ ہم ہیں، دیوانی، ہوس۔

خدیجہ مستور، ''تھکے ہارے''، صفحات: ۲۶۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

اس افسانوی مجموعے کے آغاز میں خدیجہ مستور کی چھوٹی بہن اور معروف افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کا خدیجہ مستور کے بارے میں لکھا ہوا ایک سوانحی اور شخصی خاکہ ہے جو بذات خود افسانے کی خصوصیات رکھتا تھا۔ مجموعے میں شامل افسانے یہ ہیں:

لعنتی، بورکا، ہینڈ پمپ، کانٹا، تلاش گمشدہ، سراب، آسرے، ڈولی، دل کی پیاس، پانچویں برسی، لالہ صحرائی، تھکے ہارے، پیوند، دادا، دس نمبری۔

خدیجہ مستور بنیادی طور پر متوسط طبقے کی مظلوم اور بے بس عورتوں کی افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی کہانیوں میں ہر طبقے کی زندگی کے گرم وسرد دیکھے یا محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

خدیجہ مستور، ''ٹھنڈا میٹھا پانی''، صفحات:۱۵۹، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''ٹھنڈا میٹھا پانی'' خدیجہ مستور کے نو افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس مجموعے کے افسانے بھی معاشرے کے بے نوا کرداروں کو اپنا موضوع بناتے ہیں لیکن نوحہ یا نعرہ بننے کے بجائے فقط فن پارہ رہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔افسانوں کے عنوان یہ ہیں:

خرمن، راستہ، بھورے، ثریا، سودا، سہرا، فیصلہ، ٹھنڈا میٹھا پانی، بھروسا۔

افسانہ ''خرمن'' کی ڈرامائی تشکیل ہوئی اور اسے پاکستان ٹیلی ویژن سے پیش کیا گیا؛ ڈرامے کے روپ میں بھی اس افسانے کی تاثیر قائم رہی اور اسے ایک حقیقت پسند، غیر رومانی کھیل ہونے کے باوجود خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

خدیجہ مستور، ''چند روز اور''، صفحات:۱۵۰، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''چند روز اور'' خدیجہ مستور کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا تھا؛ دیباچے میں فیض نے نہایت عمدگی سے خدیجہ مستور کے پرانے اور نئے افسانوں کا تجزیہ کیا ہے، چند سطریں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

> ''ان کے افسانوں میں درشتی، مردم بیزاری اور انسان دشمنی کا تاثر قریب قریب ناپید ہے.... جنسی معاملات کی منظر کشی میں بھی ان کی نظر لذت کے کسی پہلو کے بجائے ہمیشہ دکھ کے کسی پہلو پر پڑتی ہے.... اب انہیں محض جنسی جبر و ستم، محض جذباتی فریب اور ریا کاری، محض نجی الجھنوں اور گھریلو سازشوں کے علاوہ ان بنیادی حقائق سے بھی آشنائی ہو چلی ہے، جن کی وجہ سے جملہ ذہنی، جذباتی اور سماجی امراض پیدا ہوتے ہیں''۔(ص ۸،۹)

مجموعے میں درج ذیل دس افسانے شامل ہیں:

چلی پی سے ملن، نیا سفر، ایک خط، مینوں لے چلے، محافظ، تین عورتیں، سنسان موڑ، جھینپ، ٹامک ٹوئیے، محاذ سے دُور۔

خدیجہ مستور، ''زمین''، صفحات:۱۸۳، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''زمین'' خدیجہ مستور کا دوسرا ناول ہے۔اس کا پس منظر تحریک آزادی کا انتہائی اور قیام پاکستان کا ابتدائی زمانہ ہے۔

اس ناول کی مرکزی کردار ''ساجدہ'' قیام پاکستان کے بعد اپنی طرح کے ایک مہاجر خاندان کا حصہ بنتی ہے اور اس کے توسط سے ہی نوزائیدہ مملکت کی تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے؛ ناول میں آنے والے زمانے میں پاکستانی معاشرے کی

زوال پذیری کے حوالے سے اشارے موجود ہیں۔ بظاہر ''زمین'' خدیجہ مستور کے پہلے ناول ''آنگن'' سے ہر طرح سے مختلف ہے لیکن کہانی اور کرداروں کو ذرا غور سے دیکھیں تو ''زمین''، ''آنگن'' کی توسیع محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت کا غیر رومانی اظہار، وطن کی محبت، خاندانوں کا المیہ، قدروں کی شکست وریخت وغیرہ دونوں ناولوں کا مشترک حوالہ ہے۔

''زمین'' خدیجہ مستور کے انتقال کے بعد ادارہ فروغ اردو، لاہور سے جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا اور فلیپ پر پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر سلیم اختر اور احمد ندیم قاسمی کی آرا تھیں۔

راجندر سنگھ بیدی، ''گرم کوٹ''، صفحات: ۱۰۱، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

راجندر سنگھ بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ دانہ ودام، پہلی بار مکتبہ اردو، لاہور سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا، زیرِ نظر مجموعے (گرم کوٹ) کے تمام افسانے اسی مجموعے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ''گرم کوٹ'' میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

گرم کوٹ، بھولا، ہمدوش، من کی من میں، چھوکری کی لوٹ، پان شاپ، منگل اشٹکا، کوارنٹین، تلادان، دس منٹ بارش میں۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں عام زندگی کے عمومی مسائل ہوتے ہیں لیکن انہیں اس گہرائی اور وسعت نظر سے پیش کیا جاتا ہے کہ پوری زندگی اپنی معنویت اور بے معنویت کے ساتھ نظر آنے لگتی ہے۔ بیدی فلسفے کو فکشن نہیں بناتے بلکہ فکشن سے فلسفہ اخذ کرتے ہیں۔

''گرم کوٹ'' کا مرکزی کردار خود مصنف ہے؛ یہ انداز بیدی کے دیگر افسانوں میں بھی نمایاں ہے۔ بیدی عظیم کردار کی تخلیق کے بجائے روزمرہ زندگی میں بہ آسانی صرف ہو جانے والے عام آدمی کی معمولی اور نا قابل ذکر شخصیت کو ایک بڑے کردار کے طور پر متشکل کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ افسانہ: ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' میں برصغیر کی عورت کا دُکھوں بھرا مقدر نظر آ رہا ہے' اس مقدر میں کوئی تبدیلی جدید تمدن اور خوشحالی کے اسباب نہیں لا سکے ہیں۔ بیدی کا افسانہ تین جہتوں کا یقینی طور پر مالک ہے: انسان دوستی، حقیقت پسندی، سلیقہ شعاری۔ بیدی فقط کہانی تصنیف کرتے ہیں اور کہانی کا کوئی حصہ خطبہ، میلوڈراما یا مباحثہ نہیں بنتا۔

راجندر سنگھ بیدی، ''مجموعہ راجندر سنگھ بیدی'' (افسانے، ناول، ڈرامے، مضامین)، تحقیق متن وتدوین: صلاح الدین محمود، صفحات: ۱۴۰۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''مجموعہ راجندر سنگھ بیدی'' میں بیدی کے ساٹھ افسانے، ایک ناول (ایک چادر میلی سی)، گیارہ ڈرامے اور بیدی کے لکھے ہوئے پیش لفظ، مضامین، خاکے اور مکاتیب شامل ہیں۔ مجموعے کے مرتب صلاح الدین محمود کے مطابق زیرِ نظر مجموعہ بیدی کا کلیات نہیں ہے بلکہ ان کے اہم ترین کاموں کا ایک انتخاب ہے البتہ اس میں بیدی کی اکثر قابل ذکر نگارشات یکجا ہوگئی ہیں۔ (ص ۱۴) مجموعے میں شریک ساٹھ افسانوں میں چند نمایاں افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

بھولا، گرم کوٹ، دس منٹ بارش میں، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دُکھ مجھے دے دو، لاجونتی، لمبی لڑکی، سرب دیال، مکتی بودھ۔

ڈراموں میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں: خواجہ سرا، چانکیہ، آج، ایک عورت کی ''نہ''، بے جان چیزیں۔

مضامین میں سے اہم مضمون: ''افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل'' ہے۔ ''خواجہ احمد عباس'' پر خاکہ بھی خاکہ نگاری کی دنیا میں اہمیت رکھتا ہے۔ بیدی کے مکاتیب میں سادگی، بے تکلفی اور شگفتگی نمایاں ہے۔

راشد الخیری، ''مجموعہ راشد الخیری''، صفحات: ۶۶۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

اس مجموعے میں راشد الخیری کی درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی، نوحہ زندگی، فسانہ سعید، نالہ زار (ان میں ''نالہ زار'' مضامین کا مجموعہ ہے؛ باقی ناول/ ناولٹ ہیں)

علاوہ ازیں رازق الخیری کا لکھا ہوا مضمون ''مصورِ غم'' مرقومہ: ۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء بطور پیش لفظ موجود ہے۔

راشد الخیری مصورِ غم کہلاتے ہیں اور واقعی اردو کے افسانوی ادب میں پہلی بار جس لکھاری نے نہایت غم انگیز اور رقت خیز واقعات اور کیفیات کو پیش کیا وہ صرف راشد الخیری ہی تھے۔ راشد الخیری کی کتابوں کی حیثیت ان کے زمانے کے معاشرے میں فقط قصے کہانی کے مجموعوں کی نہیں تھی بلکہ انہیں تعلیم و تربیت اور اصلاحِ معاشرہ کی دستاویز کا رُتبہ دیا جاتا تھا۔

راشد الخیری، ''ناول افسانے''، صفحات: ۸۵۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

اس ضخیم مجموعے میں راشد الخیری کے درج ذیل ناول اور افسانوی مجموعے شامل ہیں:

تمغہ شیطانی (طویل افسانہ)، ماہ عجم (تاریخی ناول)، عروس کربلا (تاریخی ناول)، شاہین و دراج (ناول)، دُرِ شہوار (تاریخی ناولٹ)، آفتاب دمشق (تاریخی ناول)، مسلی ہوئی پتیاں (خطوط کی تکنیک میں لکھے گئے افسانے؛ ایک افسانہ ''بڑی بہن کا خط'' مجموعے میں شامل ہونے سے پہلے ''نصیر اور خدیجہ'' کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں چھپا تھا؛ اس حوالے سے اردو کا اولین افسانہ کہلاتا ہے)، گوہرِ مقصود (دو افسانوں: ''لال کی تلاش'' اور ''خیالستان کی پری'' پر مشتمل مجموعہ)، بیلہ میں میلہ (غدر کے حوالے سے کہانیاں؛ کتاب کا ایک معروف نام: ''غدر کی ماری شہزادیاں'' بھی ہے)۔ راشد الخیری کے ناولوں اور افسانوں کی موضوعاتی مثلث کچھ یوں بنتی ہے: درد انگیز واقعات، تعلیم و تربیت کے اصول، دلی کی تہذیب کے روشن اور سوگوار عکس۔

رُسوا، مرزا محمد ہادی، ''امراؤ جان ادا''، صفحات: ۲۰۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

''امراؤ جان ادا'' اردو ادب کا فنی اعتبار سے پہلا مکمل ناول ہے، اس کی مقبولیت اب عالمی سطح کے مختلف آفاق چھو رہی ہے۔

''امراؤ جان ادا'' بظاہر ایک طوائف کی کہانی ہے لیکن بباطن برصغیر کے عہدِ زوال کی سہ ابعادی، متحرک اور حقیقی تصویر ہے۔

''امراؤ جان ادا'' میں مرزا ہادی رسوا کا تاریخی اور سائنسی شعور پوری طرح کارفرما ہے۔ رسوا ایک کردار کے طور پر بھی ناول میں موجود ہیں؛ جس سے قصے کو آگے بڑھانے اور کرداروں کی نفسیاتی گرہوں کو کھولنے میں مدد ملی ہے۔

برصغیر میں امراؤ جان ادا کی ڈرامائی تشکیل تھیٹر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے لیے بارہا ہوئی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ سنگ میل کے شائع کردہ زیرنظر ایڈیشن کا تعارف ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے اور اس پر تاریخ تحریر ۱۰ فروری ۱۹۹۶ء درج ہے۔

رشید اختر ندوی، ''محمد ابن ابی عامر''، صفحات: ۳۹۰، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

تاریخی ناول نگاری میں رشید اختر ندوی ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ ''محمد ابن ابی عامر'' ایک کردار کا ناول ہے اور اس کا پس منظر اندلس ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے رشید اختر ندوی کے ناولوں میں ''محمد ابن ابی عامر'' فوقیت رکھتا ہے۔ محمد ابن ابی عامر اپنی زندگی کا آغاز عرضی نویسی سے کرتا ہے اور مختلف اہم عہدوں کو حاصل کرتا چلا جاتا ہے، آخر حکمرانی کے تخت تک پہنچ جاتا ہے۔ ناول نگار نے محمد ابن ابی عامر کی خارجی تگ و دو کے ساتھ باطنی آویزش کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والے ۳۹۰ صفحات کے اس ناول کی قیمت صرف ۸۰ روپے تھی۔ ''محمد ابن ابی عامر'' پہلی بار ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا۔

رضی ترمذی، سید (مترجم)، ''ایک کھویا ہوا لڑکا'' (طویل افسانے)، صفحات: ۲۵۶، زیرنظر ایڈیشن ۱۹۹۸ء

زیرنظر مجموعہ تھامس وولف (Thomas Wolf) اور کیتھرین این پورٹر (Kathrine Ann Porter) کے طویل افسانوں کے ترجموں پر مبنی ہے۔ ترتیب درج ذیل ہے:

میرینڈا، ایک کھویا ہوا لڑکا، فریب زیست، جادو بھرا جنگل، گینٹ کی موت۔

''میرینڈا'' اور ''فریب زیست'' کیتھرین این پورٹر کے طویل افسانے ہیں۔ ''میرینڈا'' کا اصل انگریزی نام Pale Horse, Pale Rider ہے اور ''فریب زیست'' کا نام Jilting of Granny Weatherall ہے۔

''ایک کھویا ہوا لڑکا''، ''جادو بھرا جنگل''، ''گینٹ کی موت'' تھامس وولف کے طویل افسانے ہیں۔

''ایک کھویا ہوا لڑکا'' کا اصل انگریزی نام The Lost Boy، ''جادو بھرا جنگل'' کا Love in the Enchanted wood اور ''گینٹ کی موت'' کا نام Death of W. Gant ہے۔

سید رضی ترمذی کے درج بالا تراجم کی بڑی خوبی سلاست اور تخلیقی اسلوب ہے۔

زاہدہ حنا، ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی''، صفحات: ۱۶۴، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

''نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' افسانہ نگار زاہدہ حنا کا ناولٹ ہے۔ کتاب کے پس سرورق پر ادیب سہیل نے اس رائے کا اظہار کیا

ہے کہ زاہدہ حنا کی تخلیقات کا ضمیر: بغاوت، حسن اور صداقت سے اٹھا ہے اور یہ تینوں عناصر انہیں وراثت میں ملے ہیں۔

زیرِ نظر ناولٹ میں بھی زاہدہ حنا کی باغیانہ لَے، دوٹوک لہجہ اور بے باک تجزیہ موجود ہے لیکن تخلیقی اسلوب بڑی خوبی سے ان کے فن پارے کو صحافتی رنگ اور نظریاتی پروپیگنڈے کی سطحی کیفیت سے بہت دور لے آتا ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں کی طرح زیرِ نظر ناولٹ کو بھی ایک مختلف ذائقے کا فن پارہ قرار دینا غلط نہیں ہوگا۔

سجاد احمد یلدرم، ''خیالستان''، (مختصر افسانوں کا مجموعہ)، صفحات: ۱۷۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

مجموعہ ''خیالستان'' پہلی بار ۱۹۱۱ء میں ادارہ مخزن لاہور نے شائع کیا تھا۔ زیرِ نظر ایڈیشن محمد حیات خاں سیال نے مرتب کیا اور یلدرم کے حالات پگڈنڈی (امرتسر) کے یلدرم نمبر سے اخذ کر کے مختصراً پیش کیے۔ کتاب پر مبسوط مقدمہ سید مبارز الدین رفعت نے لکھا ان کے بارے میں سیال صاحب لکھتے ہیں: ''لے دے کر یلدرم کے ایک شیدائی سید مبارز الدین رفعت ہیں جنھوں نے سجاد حیدر یلدرم کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب ۱۹۴۶ء میں لکھی اور پھر ۱۹۶۱ء میں پگڈنڈی امرتسر کا یلدرم نمبر مرتب کیا''۔ خیالستان کے آغاز میں سید غلام بھیک نیرنگ کی تمہید اور امتیاز علی تاج کے دیباچے میں یلدرم کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیرنگ لکھتے ہیں:

> ''ان تحریروں میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ صرف پر معنی ہی نہیں بلکہ معنی خیز ہیں۔ صرف معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہیں۔ گویا یہ خیالات ہی نہیں بلکہ خیالات کے تخم بھی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس لحاظ سے ''خیالستان'' ناموزوں نام نہیں ہے۔ یہ نام میں نے ہی تجویز کیا تھا اور میں خوش ہوں کہ یہ خیالستان ''خیالستان'' ہی کے نام سے شائع ہو رہا ہے''۔ (ص ۲۸)

یلدرم کا اسلوب اپنے تخلیقی حسن، رومانی لحن اور شگفتہ پیرائے کے باعث آج بھی ہماری قرأتوں کو سرسبز کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ''سیر کہسار''، (جلد اول و دوم)، صفحات: (جلد اول) ۴۹۶ + (جلد دوم) ۷۰۰ = ۱۱۹۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول ''سیر کہسار'' ۱۸۹۰ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔

زیرِ نظر اشاعت، نول کشور پریس، لکھنو سے ۱۹۳۴ء میں چھپنے والے ایڈیشن کا عکس ہے۔ آغاز میں تبسم کاشمیری کا ایک (فلیپ نما) مختصر دیباچہ ''سیر کہسار'' کی خصوصیات پر روشنی ڈال رہا ہے:

> ''سرشار کے ذہن پر پرانی داستانوں کی طوالت پسندی کا گہرا اثر تھا۔ اگرچہ ''فسانہ آزاد' اور ''سیر کہسار'' جدید ناول کی تکنیک کے مطابق لکھے گئے ہیں مگر طوالت پسندی میں، وہ داستان کے پرانے ڈھانچے سے رہائی حاصل نہ کر سکے تھے..... ''سیر کہسار''، ''فسانہ آزاد'' کی طرح کرداروں کا جنگل نہیں ہے۔ اس ناول میں سرشار نے ناول کے بنیادی کرداروں ہی پر توجہ قائم

رکھی ہے..... ''سیر کہسار'' سرشار کے دورِ عروج اور دورِ زوال کی درمیانی کڑی ہے''۔(تاریخ تحریر: ۱۸/فروری ۲۰۰۲ء)

''سیر کہسار'' کے پرانے اور مستند ایڈیشن کے عکس کی خوبصورت اشاعت ایک قابل داد طباعتی کام ہے اور کلاسیک کو محفوظ اور حیاتِ نو دینے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ''فسانہ آزاد'' (چار جلدیں)، جلد اول: صفحات: ۶۷۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۴ء

جلد دوم: صفحات: ۴۴۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۴ء

جلد سوم: صفحات: ۱۱۴۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۴ء

جلد چہارم: صفحات: ۱۰۷۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۴ء

''فسانہ آزاد'' کے سرورق پر مصنف کا نام اس طرح درج ہے: پنڈت رتن ناتھ سرشار صاحب دُر کاشمیری لکھنوی۔ زیر نظر چاروں جلدیں مطبع منشی نول کشور کی شائع شدہ جلدوں کا عکس ہے۔ پہلی جلد کے اختتام پر یہ اطلاع درج ہے:

''اعلان۔ جو کہ اس کتاب کا حق تالیف وتصنیف مصنف نے مطبع منشی نول کشور کو دیا ہے لہٰذا بہ نمبر ۱۸۸۔ ۱۶/فروری ۱۸۸۱ء کو بموجب دفعہ ۱۸، ۱۹۔ ایکٹ ۲۵۔ ۱۸۶۷ء درج رجسٹر رجسٹری ہو گئی ہے''۔(ص: ۶۷۲)

جس ایڈیشن کا عکس چھاپا گیا ہے وہ درج اعلان کے مطابق نواں ہے۔ جو ماہ نومبر ۱۹۴۸ء میں طبع ہوا۔

فسانہ آزاد برصغیر کا نمایاں ترنثری کلاسیک ہے۔ کہانی میں موجود دلچسپی، ظرفیانہ عناصر، لکھنوی معاشرت ومزاج کی عکاسی، زندگی کے نشاطیہ تصور اور آزاد و خوجی کے جاندار کرداروں نے اسے اپنے زمانے کا مقبول عام شاہکار بنا دیا تھا؛ تب سے آج تک اس کی ادبی حیثیت اور مقبولیت کو گہن نہیں لگا۔

قیام پاکستان کے بعد فسانہ آزاد کی کئی تلخیصیں شائع ہوئیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی گئیں نیز مکمل صورت میں بھی مطبع منشی نول کشور کی شائع کردہ (فسانہ آزاد کی چاروں) جلدیں کتاب خانوں کے ساتھ ساتھ اہل ذوق کے پاس دستیاب رہیں اور ایک محدود پیمانے پر ان کی قرأت کا سلسلہ جاری رہا۔ سنگ میل نے آہستہ آہستہ نایاب ہوتی مذکورہ جلدوں کی عکسی طباعت کا ۱۹۸۴ء میں بندوبست کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے اور فسانہ آزاد اپنی مکمل صورت میں ایک بار پھر ''منظر خاص'' سے منظر عام پر آ گیا ہے۔

سرور، رجب علی بیگ، ''فسانہ عجائب''، صفحات: ۲۴۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

فسانہ عجائب، رجب علی بیگ سرور کا فنی شاہکار اور تاریخی وتہذیبی طور پر ایک اہم ادبی دستاویز ہے۔
میر امن دہلوی کی داستان ''باغ و بہار'' کے جواب میں لکھی گئی زیرِ نظر داستان لکھنو کے تمدن، نفسیات اور لب و لہجے کی عکاس ہے۔ فسانہ عجائب برصغیر پاک و ہند میں اپنی پہلی اشاعت (۱۲۵۹ھ) سے لے کر آج تک درجنوں بار مختلف اشاعتی اداروں سے طبع ہوتی رہی ہے۔ زیرِ نظر اشاعت کا مقدمہ ڈاکٹر عبیداللہ خان نے لکھا ہے اور کتاب کے آخر میں فسانہ عجائب کے متن کی مختصر لیکن جامع فرہنگ بھی شامل کر دی ہے۔ مقدمے میں سرور کی سوانح، کارنامے اور فسانہ عجائب کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

سعید شیخ، محمد، ''چھوٹی سی بات''، صفحات: ۲۴۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

''چھوٹی سی بات'' محمد سعید شیخ کے انیس افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے؛ جس کا پہلا افسانہ ''مائے نی مائے'' خودنوشت سوانحی ذائقہ رکھتا ہے۔ دیگر افسانوں کے عنوان یہ ہیں: ترغیب، بحران، جرم و سزا، اہل محبت، آزمائش، جواز، قفس، اشتہار، چھوٹی سی بات، بھنور، زندگی، ائیر پاکٹس، تار عنکبوت، رنگوں کا رزق، بوجھ، شاہ کار، فریب، زنجیر۔

کتاب میں بانو قدسیہ کی یہ رائے درج ہے:

> ''محمد سعید شیخ کی ''چھوٹی سی بات'' یقیناً ایک بڑے بحران سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بحران اس وقت جنم لیتا ہے جب کہانی کے مرکزی کردار Exposure سے دوچار ہوتے ہیں۔ کردار، حالات، واقعات میں اکھاڑ پچھاڑ سے سوچ میں کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔
> سعید شیخ سوچتا ہے کہ کیا نفسانی منزل شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ کی رومان پروری کی موت تو نہیں!
> یہ سارے افسانے اقدار کے نئے سانچوں میں ڈھلنے کی کربناک تصویریں ہیں''۔ (پس سرورق)

محمد سعید شیخ کے افسانے اس آشوب کو پیش کرتے ہیں جو پہلے ہمارے خارج میں برپا ہوا اور اب ہمارے داخل کو اپنی آماجگاہ بنائے ہوئے ہے۔ افسانہ: ''اشتہار'' اس آشوب کے استحکام کا اعلان ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''کڑوے بادام''، صفحات: ۲۹۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

''کڑوے بادام'' ڈاکٹر سلیم اختر کا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں ان کے ۳۳ افسانے شامل ہیں۔
مجموعے کو چار حصوں: بے ضرر کہانیاں، حجرہ ہفت بلا، تال پاتال اور بحر ظلمات میں تقسیم کیا گیا ہے؛ ڈاکٹر سلیم اختر اس تقسیم کی توجیہہ اور اپنے فنی زاویوں کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:

> ''اگرچہ میں نے بالعموم نفسی جنسی رنگ کی کہانیاں لکھیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسی معاشرتی کہانیاں بھی سرزد ہوتی رہیں۔ جنہیں نفسیات کے مقابلہ میں ''بے ضرر کہانیاں'' قرار دیا جاسکتا

ہے۔اُدھر گذشتہ پانچ سات برس سے میں نے صرف استعاراتی اور علامتی کہانیاں ہی لکھیں۔
کچھ نیم تجریدی کہانیاں بھی ملیں گی۔چنانچہ کتاب کا دوسرا حصہ ''حجرہ ہفت بلا''، ''تال پا تال'' اور
''بحرظلمات'' کے عنوانات تلے اسی انداز کی کہانیاں ملیں گی۔میرا تازہ ترین کام بھی یہی ہے۔
یوں دیکھیں تو بحیثیت کہانی کار میرے فن کے تین رخ بنتے ہیں:
جنسی نفسیاتی کہانیاں، معاشرتی کہانیاں اور استعاراتی علامتی کہانیاں .... جہاں تک افسانوں
کے اس مجموعہ کا تعلق ہے تو آپ کو یہ نفسیاتی اور جنسی کہانیوں سے پاک نظر آئے گا.... سیدھی سی
وجہ یہ ہے کہ کتاب ضبط ہو جانے کا خدشہ تھا''۔(دیباچہ بعنوان ''میں'' ص:۱۱،۱۲)

مجموعے میں شامل چاروں حصوں کے افسانے یہ ہیں:

۱) بے ضرر کہانیاں: محاذ ۱۹۷۱ء، دوسیارے، گریز پا، سفر سے واپسی، رزقِ حلال، ماں بیٹا، آئینہ، درد کا بندھن، محاورے کے معنی، دھرتی کی زنجیر،۲) حجرہ ہفت بلا: پانچویں کھونٹ، عذاب میں گرفتار بستی، اور بستی، اختتام، زنجیر، ظل ہما، کھجوروں کا موسم۔۳) تال و پاتال: پکار، لہو کی چہچہاہٹ، اماوس، شاہی دستر خوان، شکتی، جنون کی رات۔

۴) بحرظلمات: افسانہ۔جو میں لکھنا بھول گیا، سائے کی طرح ساتھ پھریں، آشوب چشم، پیرتسمہ پا، بچہ جمورا، تخلیق، بے چہرہ لوگ، جو جاگے ہیں خواب میں، آئینہ تکرارِ تمنا، خاموشی کا کیپسول۔

''کڑوے بادام'' کے افسانوں میں تکنیک کا تنوع ملتا ہے اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں کا بیان عموماً واضح، واشگاف اور کسی حد کڑوے لہجے میں کیا گیا ہے۔علامتی و تجریدی افسانوں میں تحلیل نفس اور تجزیہ معاشرت کے زاویے پنہاں بھی ہیں اور عیاں بھی؛ ان افسانوں کی علامتیں اتنی مبہم نہیں کہ موضوع، مقصد، کہانی، قاری سب گم ہو جائیں۔

طارق محمود،''بند دروازہ''، صفحات:۲۷۶، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

''بند دروازہ''۔طارق محمود کے سولہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے؛ آخر میں ظہورالحق شیخ کا ایک تجزیاتی مضمون ''بند دروازہ۔ایک نظر میں'' بھی شامل ہے۔مجموعے کے افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

کل ہی کی بات، سایہ، ایک نامکمل کہانی کی کہانی، ایک بار پھر، کبوتر خانہ، شعبدہ باز، مجسمہ ساز، بھیڑ، تسلسل، بند دروازہ، پتلی تماشہ، زیتون کی شاخ، جیٹ آورز، نام، گنڈ ولا، کھویا ہوا پہر۔

ظہورالحق شیخ اپنے تجزیاتی مضمون میں زیر نظر مجموعے کے حوالے سے یہ تاثر پیش کرتے ہیں:

''طارق محمود بطور ادیب بنیادی طور پر اپنی کہانیوں میں ماحول کو اجاگر کرنے میں دلچسپی رکھتا

ہے۔اس کے افسانے ایک واقعے یا واقعات کی مختلف کڑیوں پر مشتمل ہوتے ہیں.... طارق کی کہانیوں میں کردار نگاری کو اتنی اہمیت حاصل نہیں۔ کردار تو ایک خیال کے حوالے سے سامنے آتے ہیں...... طارق محمود ایسا کہانی نویس ہے جس کی تحریروں میں زندگی کو سمجھنے کا ایک مخصوص نظریہ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ کہانی کے ڈھانچے میں بہت عیاں نہیں ہوتا.... طارق یقیناً ایک دلچسپ کہانی نویس ہے۔فینٹیسی کا عنصر اس کی کہانیوں کو جاذبیت دیتا ہے اور اس کے تخلیقی تجربے کو شدت۔ علامتوں کی ہمہ جہتی کے باوجود اس کی تحریر قاری کو بوجھل نہیں لگتی۔ اس کی علامتیں پڑھنے والے کے تجربے میں شامل ہو جاتی ہیں''۔(ص:۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۵، ۲۷۶)

طارق محمود،''سہ حدہ''،صفحات:۲۱۲،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''سہ حدہ''۔ طارق محمود کے بیس افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔طارق محمود کے افسانے :قومی المیوں، معاشرتی پیچیدگیوں اور تہذیبی مناقشوں کو سامنے لاتے ہیں۔اس مجموعے میں شامل افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

آئی لینڈ، دھوپ رات، لال باغ، تیل کی دھار، بھولا تخلیق کار، لمحے، بائیس سال بعد، دیواروں میں گھرا فالتو آدمی، سہ حدہ، بریک ڈاؤن، رات رات میں، ڈیزی فلاور، تنہائیوں کا ہجوم، فاصلوں کے درمیان، سازش، بارش کا آخری قطرہ، میوزیکل چیئر، سرکس، پسپائی۔

ان افسانوں میں آئی لینڈ، لال باغ اور سرکس میں خفی یا جلی طور پر مشرقی پاکستان اور اس کے سقوط کے حوالے موجود ہیں۔

زیرِنظر مجموعے کے آخر میں رشید امجد کے مضمون بعنوان''طارق محمود کی کہانیاں'' سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

''موضوعاتی اور اسلوبی دونوں سطحوں پر اس کی کہانیوں میں وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے.... طارق محمود کے یہاں باطن کے اسرار اس طرح تو نہیں کھلتے جس طرح بعض نئے افسانوں میں نئی مابعد الطبیعاتی کیفیت کے ساتھ ان کے معنی متعین ہوتے ہیں، لیکن اس کے باطنی سفر میں دوسری ہستی کی تلاش کا احساس ضرور ہوتا ہے اور ظاہری دنیا کے اندر چھپی حقیقی دنیا کو پانے کی تمنا بھی ابھرتی ہے''۔(ص:۲۱۰،۲۱۱)

ظہیر بابر،''دیدہ بیدار کے خواب''،صفحات:۴۴۸،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

''دیدہ بیدار کے خواب''،ظہیر بابر کے دو افسانوی مجموعوں''رات کی روشنی''اور''شیشے کے آبلے'' پر مشتمل ہے۔

''رات کی روشنی''میں شامل افسانے:

مینو، بلبلا جسے دل کہیں، فضا میں لٹکتی ہوئی لاش، رات کی روشنی، بابل کے گھر کی چڑیا، پھلاں دے رنگ کالے، مختلف مضمون کا آدمی، خوف کا خشک سمندر، نیلے آسمان کا ٹکڑا۔

''شیشے کے آبلے'' میں شریک افسانے:

۱۰۵/۹ بخار، ۔ پہلے داؤ میں ہارے شرط، شیشے کے آبلے، حرفوں کا جادو، اندھیارے میں برکھا، صدا کی چٹکی، نکتہ، نقطہ، نک تا، ناچتی ہوئی جسم بریدہ باہیں، دماغ کا کاتا ہوا سوت، ایک عبرت انگیز کہانی۔

اول الذکر مجموعہ ''رات کی روشنی'' کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی رائے یہ ہے:

''نو کہانیوں پر مشتمل یہ مجموعہ انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور جذباتی مدوجزر کی مختلف کیفیات کو سامنے لاتا ہے.... طرز حساس کے اعتبار سے ان کی کہانیاں نئے ادبی دھاروں سے ہم آہنگ ہیں جن میں حقیقت اور رمزیت دونوں رنگ موجود ہیں (پس سرورق)

موخر الذکر مجموعہ ''شیشے کے آبلے'' کے حوالے سے مظہر جمیل کا تاثر یہ ہے:

''شیشے کے آبلے کی کہانیوں میں فین تاسی کی تحیر پذیرانہ اور دلچسپ فضا کی تشکیل بھی ظہیر بابر کا اسلوب خاص معلوم ہوتا ہے۔ جس کے سہارے وہ ایسی متحرک تصویریں بنانے میں کامیاب رہے ہیں جن سے صرف خطوں اور رنگوں کی دلاویز چھوٹ ہی نہیں پڑتی بلکہ معنی اور مفہوم کی گہرائی بھی ظاہر ہوتی ہے''۔

عاشق حسین بٹالوی، ''تاریخ اور افسانہ''، (مجموعہ عاشق حسین بٹالوی)، صفحات: ۶۲۷، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

عاشق حسین بٹالوی نے افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھے تھے؛ افسانوں کے مجموعے: ''سوز ناتمام'' اور ''رہگزر'' تھے، ''شاخسار'' مضامین اور ''تاریخ اور افسانہ'' تاریخی ڈراموں پر مشتمل مجموعے تھے۔

زیر نظر کتاب ''تاریخ اور افسانہ'' ان کے درج بالا تمام مجموعوں پر مشتمل ہے۔

افسانوی مجموعہ ''سوز ناتمام'' کا مقدمہ حمید احمد خان اور دوسرے افسانوی مجموعے ''رہگزر'' کا دیباچہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا؛ مضامین کے مجموعے ''شاخسار'' کا تعارف مولانا عبدالمجید سالک نے کرایا تھا۔ جبکہ تاریخی ڈراموں کے مجموعے ''تاریخ اور افسانہ'' کا مقدمہ مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''ڈاکٹر عاشق حسین اردو کے ایک صاحب طرز انشاء پرداز ہیں اور افسانہ ہو یا مقالہ، تقریظ ہو یا تنقید، سیاسی بحث ہو یا تاریخی تحقیقات، ان کا دل آویز اسلوب نگارش اپنی منفرد اور ناقابل تقلید

کیفیت میں اس کی ہر ہر سطر اور ہر ہر جملے سے صاف پہچانا جاتا ہے''۔(مقدمہ:ص ۵۳۵)

عابد علی عابد، سید، ''داغ ناتمام''، صفحات: ۳۹۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

داغ ناتمام۔ سید عابد علی عابد کے ایک افسانوی مجموعے ''طلسمات''، ایک ناولٹ ''شمع'' اور دو ناولوں ''دکھ سکھ'' اور ''سہاگ'' پر مشتمل مجموعہ ہے۔ مجموعے کا عنوان ''داغ ناتمام'' سید عابد علی عابد کے ایک افسانے سے لیا گیا ہے۔

''طلسمات'' میں شامل افسانے درج ذیل ہیں:

داغ ناتمام، شباب تازہ، بہار، موتی کرن کپور، شب نگار بنداں، عدالت، لاہور کی ایک رات، سینما کی ایک شام، جوانی کی پہلی محبت، عشرت باقی، قسمت اور خطوط رنگیں، مسافر، منگنی، محبت کی ایک شام۔

ناولٹ ''شمع'' کا دیباچہ سید عابد علی عابد نے لکھا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ ناولٹ (شمع) ریڈیو کے لیے لکھا گیا تھا اور سامعین میں مقبول ہوا تھا؛ اس کی پہلی اشاعت کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ اسے پبلشرز یونائیٹڈ کے سلام صاحب نے شائع کیا تھا۔ ناول ''دکھ سکھ'' کا دیباچہ مصنف کی بیگم: بلقیس عابد علی نے لکھا اور سید عابد علی عابد کی نثر کو ان کی شاعری سے بہتر قرار دیا ہے۔ (ص ۱۹۴) ناولوں کے حوالے سے اپنے دیباچے میں بلقیس عابد علی لکھتی ہیں:

> ''ناولوں میں جیسا لوچ اور گھلاوٹ شیرینی اور گداز وہ اپنی تحریر میں پیدا کر دیتے ہیں اس کی مثال ان کے کسی اور نثری کارنامے میں نہیں ملتی۔ ناولوں کے سوا ان کی تحریر میں ایک تکلف سا ایک تصنع سا معلوم ہوتا ہے وہ خود اسے بانکپن کہتے ہیں''۔ (ص ۱۹۸)

عبداللہ حسین، ''اداس نسلیں''، صفحات: ۵۵۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۴ء

''اداس نسلیں'' عبداللہ حسین کا پہلا ناول ہے؛ اس کا تناظر جنگ آزادی (۵۷ء) سے حصول آزادی (۴۷ء) تک کا زمانہ ہے۔ ناول کا بنیادی موضوع جبر ہے جس کا نتیجہ ایک ازلی و ابدی بے سکونی اور اداسی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ''نعیم'' خارج میں پھیلے مصائب اور سانحوں اور داخل میں ٹھہری کوفت اور اداسی کو پیش کرنے کا ایک مضبوط ذریعہ ہے جو ناول میں کبھی حقیقی اور کبھی علامتی کردار نظر آتا ہے۔

ناول کے بظاہر چار حصے ہیں: برٹش انڈیا، ہندوستان، بٹوارا اور اختتامیہ لیکن بباطن یہ تقسیم بے معنی ہے کیونکہ سب حصے ایک دوسرے میں اترے ہوئے ہیں؛ اور ایک ہی مرکزی کردار کے ذریعے اپنے آپ کو منکشف کرتے ہیں۔

''اداس نسلیں'' کی اولین اشاعت سے لے کر آج تک اس کے بکھرے ہوئے پلاٹ، غیر متعلق واقعات، مختلف موضوعات پر طویل تقاریر اور قرۃ العین حیدر کے اس ناول پر اثرات کے حوالے سے ناول نگار کی مخالفت اور موافقت میں مباحث کا سلسلہ جاری ہے۔

عبداللہ حسین، ''باگھ''، صفحات:۳۶۰، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

ناول ''باگھ'' کا تناظر پاکستان اور کشمیر ہے؛ کہانی کی فضا یہاں کی سیاسی، انتظامی، عسکری اور شخصی آمرانہ رویوں سے تشکیل پاتی ہے؛ ناول کا موضوع بدترین مصائب اور مظالم جھیلتے افراد اور اُن کی محبت کرنے اور آسودگی پانے کی آرزو ہے۔

''باگھ'' میں پہلی بار سیاسی اور حکومتی آمریت کے ایک شاخسانے کے طور پر خفیہ ایجنسیوں کی مطلق العنانی اور ان کے سامنے معصوم عوام کی بے بسی بھی موضوع بنتی ہے۔ ''باگھ'' کی کہانی کے کچھ حصوں کے اسباب و محرکات واضح نہیں کیے جاتے اور یوں کچھ حوالوں سے ناول کے اختتام تک پراسراریت موجود رہتی ہے؛ ایک طرح سے یہ بھی ہماری سیاسی و سماجی زندگی کا ایک عکس اور ایک واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں کئی واقعات و معاملات پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا ہے۔

عبداللہ حسین، ''قید''، صفحات:۱۱۵، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

یہ ناولٹ پاکستان کی سیاست و معاشرت پر جعلی پیری مریدی کے اثرات کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس موضوع کے انتخاب سے مصنف کو کئی آسانیاں میسر آئی ہیں لہٰذا وہ بڑی خوبی سے معاشرے کی جہالت، بداعتقادی، افلاس، استحصال، سیاسی و جاگیرداری اطوار، آمریت اور مذہب کی آڑ میں سفاکیت ایسے درجنوں موضوعات کو کہانی کا حصہ بنانے میں کامیاب رہا ہے۔

ناولٹ ''قید'' معاشرے کے منفی روپ کی تخلیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلوب سادہ اور رواں ہے، واقعات کا بیان دلچسپ اور پرتجسس ہی نہیں، تحیر آمیز اور عبرت انگیز بھی ہے۔

عصمت چغتائی، ''ضدی''، صفحات:۹۶، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''ضدی'' ۔عصمت چغتائی کا پہلا ناول ہے؛ اور یہ ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کی کہانی دلچسپ اور ہلکی پھلکی ہے اور عصمت کا اندازِ بیان اسے قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔ کہانی اور کردار نگاری کے حوالے سے ناول ادبی دنیا میں وہ مقام نہیں رکھتا جو عصمت کے بعد میں لکھے ناولوں کو حاصل ہوا ہے۔ ۳۰ء کی دھائی کی فلموں کے اثرات ناول کے واقعات، کردار اور اندازِ پیشکش پر حاوی ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی، مرزا، مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی (افسانے)، صفحات:۴۴۵، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

زیرِنظر مجموعے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے پینتیس افسانے شامل ہیں۔ تحقیق متن و تدوین صلاح الدین محمود نے کی ہے؛ اور ایک تخلیقی انداز کا پیش لفظ ''حمام بادگرد کے ورے'' لکھا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''انگوٹھی کی مصیبت'' ہے، جو عظیم بیگ چغتائی نے ۱۹۳۰ء میں دورانِ تعلیم لکھا تھا۔ مجموعے میں شامل چند افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

شاطر کی بیوی، رموز خاموشی، جہالت مکسچر، نیکی جرم ہے، رنگروٹ کی بیوی، خودمختار دوشیزہ، فرزند سرحد۔

اردو افسانے کا آغاز نہایت سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ ماحول میں ہوا اور سنجیدگی اور حقیقت پسندی تا حال اردو افسانہ کا اہم حوالہ ہیں؛ لیکن اس شارعِ عام سے ہٹ کر بھی کچھ افسانہ نگاروں نے اپنے لیے الگ پگڈنڈیاں دریافت کیں؛ عظیم بیگ چغتائی بھی ان ہی گنے چنے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کے افسانے میں معاشرتی اور کرداری ناہمواری سے ایک شگفتہ کہانی پھوٹ پڑتی ہے، اور قاری کے اندر ایک باغ و بہار کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی، مرزا، ''مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی''، (داستان، ڈرامے، مضامین)، (تحقیق متن و تدوین: صلاح الدین محمود)

صفحات: ۳۰۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۷ء

اس مجموعے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ایک داستان ''قصرِ صحرا''، دو ڈرامے: ''مرزا جنگی'' اور ''شادی کی ضرورت'' اور نو مضامین شامل ہیں؛ مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

زوالِ بغداد، سالنامہ مرمریں، امان اللہ خان کا ہیرا، دارا کا قتل، میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں، ایک قیمتی شعر، درکاداس راٹھور، افسانہ نگاروں کی قسمیں، بابر۔

صلاح الدین احمد نے اس مجموعے میں شامل تحریروں کے متن کی تحقیق اور تدوین بڑی دل جمعی سے کی ہے۔ اپنے دیباچے (حرفے چند) میں وہ لکھتے ہیں:

> ''متن کی درستگی اور صحت کے بنیادی کام پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ اس کام کے واسطے ساقی بک ڈپو، جودھ پور، جاورہ، دارالاشاعت (پنجاب) لاہور اور کراچی کے اولین ایڈیشن بنیاد کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ ساقی، ادب لطیف، نیرنگ خیال و نقوش وغیرہ کے شمارے بھی سامنے رکھے گئے ہیں۔ مصنف کی ترجیح کو ہمیشہ حرف آخر سمجھا گیا ہے''۔
>
> (حرف چند، ص ۵، مرقومہ: ۱۹۹۶ء)

عظیم بیگ چغتائی، مرزا، ''مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی''، (ناول)، (تحقیق متن و تدوین: صلاح الدین محمود)

صفحات: ۷۹۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۷ء

زیرِ نظر ضخیم مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے چھ ناولوں پر مشتمل ہے۔ ناولوں کے نام یہ ہیں:
خانم، کولتار، کمزوری، چمکی، کھرپا بہادر، کالے گورے۔

اس مجموعے کی تحقیق متن اور تدوین صلاح الدین حیدر نے کی ہے؛ ایک مختصر سے دیباچے (حرف چند: تاریخ اشاعت: ۱۹۹۶ء

)میں انہوں نے زیرِنظر مجموعے کی تصحیح متن کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے تمام ناول مزاحیہ ہیں؛ ناول کے واقعات اور کردار ان کے ذہن میں جنم لیتے ہیں اور تھوڑی بہت معاشرتی حقیقت کے رنگ روپ کے ساتھ عبارت میں طلوع ہوتے ہیں ان کی کہانیاں اور کردار ان کی ذاتی زندگی کا ردعمل ہیں جو مختلف اور مستقل بیماریوں کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہیں۔ان کے ناولوں کو ایک خاص دور میں خاصی مقبولیت حاصل رہی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی، مرزا، ''مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی'' (ناولٹ)، صفحات:۴۵۴، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

زیرِنظر مجموعے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے دس ناولٹ شامل ہیں، مجموعہ کے لیے تحقیق متن اور تدوین کا کام صلاح الدین محمود نے کیا ہے اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے تینوں مجموعوں (شائع کردہ: سنگ میل پبلی کیشنز) میں مدون صلاح الدین محمود کا ایک ہی پیش لفظ (بعنوان حرفے چند) ہے۔اس مجموعے میں درج ذیل ناولٹ شامل ہیں:

سوانہ کی روحیں، جنت کا بھوت، چینی کی انگوٹھی، خطوط کی ستم ظریفی، فل بوٹ، دیکھا جائے گا، ملفوظات ٹامی، ویمپائر، مسز کڑھلے، شہزوری۔ناولٹ ''شہزوری'' کی پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامائی تشکیل حسینہ معین نے کی اور ڈرامے کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

قدرت اللہ شہاب، ''سرخ فیتہ''، صفحات:۳۳۹، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

اس مجموعے میں قدرت اللہ شہاب کا ایک ناولٹ ''یا خدا''، دو افسانوی مجموعوں ''ماں جی'' اور ''نفسانے'' سے منتخب افسانے شامل ہیں۔''یا خدا'' کے آغاز میں ''اس کہانی کی کہانی'' کے عنوان سے قدرت اللہ شہاب کا وہ دیباچہ بھی شامل ہے جو انہوں نے ''یا خدا'' کے (غالباً) دوسرے ایڈیشن کے لیے لکھا تھا اس پر تاریخ تحریر یکم ستمبر ۱۹۶۱ء درج ہے۔منتخب افسانے یہ ہیں:

ماں جی، ۱۸۔سول لائین، ایک پنکچر، نمبر پلیز، پکے پکے آم، پھوڑے والی ٹانگ، سٹینو گرافر، جگ جگ، آیا، تلاش، دورنگا، جلترنگ، کراچی (ایک برطانوی فوجی افسر کی ڈائری کے چند اقتباسات کا ترجمہ جو ۱۸۳۹ء میں کراچی آیا تھا، ۱۸۵۱ء میں اس کی ڈائری لندن سے اس کے نام کے بغیر شائع ہوئی (نام صیغہ راز میں رکھا گیا))، پٹیالہ پیگ، آپ بیتی، اور عائشہ آ گئی، غم جاناں، ریلوے جنکشن، سردار جسونت سنگھ، سرخ فیتہ، ایک ڈسپیچ۔

اس کے علاوہ تین مضامین: اقبال کی فریاد، آثارِ قدیمہ اور اے بنی اسرائیل بھی شامل مجموعہ ہیں۔

قدرت اللہ شہاب، ''ماں جی''، صفحات:۲۱۵، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''ماں جی'' قدرت اللہ شہاب کا ایسا مجموعہ ہے جس میں افسانے، خاکے، مکالمے اور سفر نامے سب شامل ہیں اور بقول احمد ندیم قاسمی: ''ان کے درمیان باہمی ربط، شہاب کے کہانی سنانے کے منفرد انداز سے پیدا ہوا ہے''۔(ص۶)

اس مجموعے کی سب سے اعلیٰ اور اثر انگیز تحریر ''ماں جی'' ہے، اردو ادب، تا حال اس نوعیت کی کوئی اور مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ''ماں جی'' کو قدرت اللہ شہاب کا سب سے بڑا فنی کارنامہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس مجموعے میں چھبیس نثر پارے ہیں جن کی سب سے بڑی خوبی قدرت اللہ شہاب کا سادہ، افسانوی اور نفیس اسلوب ہے۔ ''ماں جی'' کا پہلا ایڈیشن، لاہور اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔

قدرت اللہ شہاب، ''نفسانے''، صفحات: ۱۴۳، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

سولہ افسانوں پر مشتمل ''نفسانے'' پہلی بار ۱۹۵۰ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کیا تھا؛ یہ قدرت اللہ شہاب کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔ ''یا خدا'' اس سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

غریب خانہ، شلوار، جگ جگ، کٹی ہے رات تو....، سب کا مالک، ماما، جال، آیا، تلاش، دورنگا، جلترنگ، ڈاگی، تین تارے، پہلی تنخواہ، صنم پلکیت، سٹینوگرافر۔

شروع میں ''لے دے'' کے عنوان سے ایک غیر رسمی دیباچہ ہے جس میں ادبی صورتحال پر فکاہی انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

حسن اور محبت کی آمیزش اور آویزش، اور جذبوں کی جزئیات کا تجزیہ نیز ارد گرد کے حالات کا حسن، محبت اور جذبوں پر اثر انداز ہونا یا استحصال کرنا قدرت اللہ شہاب کا خاص موضوع ہے جو روپ بہروپ بدل کر مختلف افسانوں میں مختلف زاویوں سے سامنے آتا ہے۔ مثلاً ''غریب خانہ'' اور ''سب کا مالک'' میں خوراک کا قحط، انسانیت کی تفریط اور غریبوں کی تذلیل دکھائی دیتی ہے تو ''ڈسپیچ''، ''پکے پکے آم''، ''جگ جگ''، ''ریلوے جنکشن'' اور پھوڑے والی ٹانگ'' میں افلاس زدہ طبقے کا جنسی استحصال نظر آتا ہے؛ اسی طرح ناآسودگی کی اُلجھنیں (ڈاگی)، سماج کے جنسی تلذز پر خوبصورت زندگی کی بھینٹ (آیا)، بے ضمیر فرد اور معاشرے کے بھیانک روپ (دورنگا)، نسوانی معصومیت کا جنسیت کی دلدل میں دھنسنا (سٹینوگرافر) نوخیز حسیات کا استعاراتی اظہار (شلوار)، (جلترنگ) زیر نظر مجموعے کے اہم نکات ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ احتجاج اور مزاحمت کی ایک خاص لے رکھتا ہے لیکن یہ لے فنی آہنگ سے باہر نہیں نکلتی۔

قدرت اللہ شہاب، ''یا خدا''، صفحات: ۱۰۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۷ء

''یا خدا'' قدرت اللہ شہاب کا مقبول عام ناول/ ناولٹ ہے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات، ہجرت اور مہاجرین کے مصائب کے حوالے سے لکھا گیا تھا۔

ناول کے تین حصے ہیں: رب المشرقین، رب المغربین، رب العالمین؛ یہ تینوں عنوان بذات خود ایک دکھی دل کی دھائی نظر آتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ایک خاتون کا ہے جس کی بے بسی ۴۷ء کی تمام مظلوم عورتوں کی ایک خاموش پکار ہے جو آج بھی تاریخ اور معاشرے سے اپنے مظالم کا حساب مانگ رہی ہے۔

ناول کے آغاز میں ''اس کہانی کی کہانی'' کے عنوان سے مصنف کا ایک مضمون ہے جس پر تاریخ تحریر یکم ستمبر ۱۹۶۱ء درج ہے۔

ناول کے بعد آخر میں مصنف کا ایک نوٹ: ''کچھ یا خدا کے بارے میں'' ہے۔ علاوہ ازیں ''یا خدا'' کے حوالے سے ممتاز شیریں کے نام محمد حسن عسکری کا ایک خط بھی کتاب میں شامل ہے؛ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ممتاز شیریں نے لکھا تھا۔ ''یا خدا اور اس کا دیباچہ'' کے عنوان ابوالفضل صدیقی کا ایک مضمون اور ناول اور ناول نگار پر اظہر سہیل کا ایک اخباری کالم بھی شامل کتاب ہیں۔

''یا خدا'' پہلی بار ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا (یہ بات لاہور اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام چھپنے والے ''یا خدا'' کے تیرھویں ایڈیشن ۱۹۹۱ء سے معلوم ہوئی؛ تیرھویں ایڈیشن کی قیمت ۲۵ روپے اور صفحات ۹۴ تھے)

قرۃ العین حیدر، ''آخر شب کے ہم سفر''، صفحات: ۳۶۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

صاحب طرز ناول نگار قرۃ العین حیدر کا ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' ان کے معرکۃ الآرا ناول ''آگ کا دریا'' کے بعد، فکر و فن دونوں حوالوں سے مقبول و معتبر قرار پایا ہے۔ ناول کا پس منظر بنگال کی انقلابی سیاست، ہندوستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کا قیام ہے، ناول کی مرکزی کردار متوسط ہندو طبقے کی پڑھی لکھی انقلابی سوچ رکھنے والی ایک لڑکی (دیپالی سرکار) ہے اور ناول کی روداد۔۔ایک نیا آگ کا دریا ہے۔

''آخر شب کے ہم سفر'' میں ''آگ کا دریا'' کی طرح، کہانی سے فکر پھوٹتی ہے اور فکر کہانی کو کروٹ دیتی ہے، گہرا احساس جملہ تخلیق کرتا ہے اور تہہ دار اسلوب جملے کو مقولے میں بدل دیتا ہے۔ ''آخر شب کے ہم سفر'' پاکستان میں اعلیٰ درجاتی نصابات میں شامل ہے۔

قرۃ العین حیدر، ''آگ کا دریا''، صفحات: ۵۷۵، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''آگ کا دریا''۔ قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناول ہے جسے پہلی بار مکتبہ جدید، لاہور نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔ یہ وسیع کینوس کا ناول اپنی انفرادیت اور مقبولیت کے باعث آج بھی اردو ناول کا ایک محکم اور معتبر حوالہ ہے۔

اس ناول کا موضوع کیا ہے؟ اس حوالے سے اردو تنقید نے مختلف جواب دیئے: ہند کی تہذیب، اہل ہند کے دکھوں کا تسلسل، انسانی فکر و فلسفہ، وقت کا پھیلاؤ۔ اصل میں یہ موضوعات ایک دوسرے میں اس طرح اترے ہوئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ دیکھا جا سکتا ہے نہ دکھایا جا سکتا ہے۔

ناول کے چار ادوار یا حصے ہیں: قدیم ہندوستان، ہند اسلامی دور، انگریزی زمانہ، آزادی کا دور (تقسیم سے ذرا پہلے اور بعد کا زمانہ)

ناول کے چند کردار ہر دور میں جنم لیتے ہیں؛ گو ان کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر، ذہنی روشیں اور روحانی کیفیتیں مختلف ہوتی ہیں لیکن دکھ ہر زمانے کے یکساں ہیں۔ آگ کا دریا دکھوں کا دریا ہے؛ اس میں کردار ڈوب کر اُبھرتے ہیں اور ابھر کر ڈوب جاتے ہیں؛ لہٰذا ہر زمانے میں گوتم، کمال، چمپا اور ہری شنکر وغیرہ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر، (مرتبہ ومقدمہ) ''انتخاب سجاد حیدر یلدرم''، صفحات:۲۲۱، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

''انتخاب سجاد حیدر یلدرم'' سجاد حیدر یلدرم کے طبع زاد مضامین، افسانے اور تراجم پر مبنی ہے۔ جس کے لیے ایک طویل مقدمہ قرۃ العین حیدر نے ''داستانِ عہد گل'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر محمود الٰہی کا پیش لفظ اور ڈاکٹر ثریا حسین کا مضمون ''یلدرم اور اردو افسانہ'' بھی شامل مجموعہ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کی درج ذیل نگارشات، مجموعے میں شریک ہیں:

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، جواب، ایک دوست کی خبر وفات سن کر، ایک نیا ستارہ۔ اقبال، سفر بغداد، جہاں پھول کھلتے ہیں، صحبت ناجنس، مصاحبتِ ادبیہ، احمد۔ علی گڑھ کا ایک قصہ، سیل زمانہ، حکایہء لیلیٰ و مجنوں، زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ، ز۔خ۔ش، قوت، (تراجم از ترکی)، جلال الدین خوارزم شاہ (ایک طویل ڈراما)، آسیب الفت (کہانی)، پرانا خواب (ڈراما)۔

قرۃ العین حیدر، ''پت جھڑ کی آواز''، صفحات:۱۹۲، زیر نظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

پت جھڑ کی آواز۔ قرۃ العین حیدر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ مجموعے میں شامل افسانے یہ ہیں: ڈالن والا، جلاوطن، یاد کی اک دھنک جلے، قلندر، کارمن، ایک مکالمہ، پت جھڑ کی آواز۔

''جلاوطن'' ایک خوبصورت اور معروف افسانہ ہے اور قبل ازیں (زیر نظر مجموعے سے پہلے شائع ہونے والے افسانوی مجموعے) ''شیشے کے گھر'' میں بھی شامل رہا ہے۔ ''ڈالن والا'' ایک المیہ ہے؛ اس کا اسلوب اور تکنیک المیے کے تاثر کو ہمارا ذاتی احساس بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ''یاد کی ایک دھنک جلے'' یادنگاری کی تکنیک میں لکھا گیا ایک تاثر انگیز افسانہ ہے۔ افسانہ ''قلندر'' میں ''جلاوطن'' کی طرح بے تعصبی اور محبت کی جہاں گیری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''کارمن'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' بھی کئی حوالوں سے اہم اور دلاویز افسانے ہیں۔ ''ایک مکالمہ''۔ مکالمے/ ڈرامے کی تکنیک میں لکھا گیا افسانہ ہے۔

مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے ایڈیشن میں طویل تر افسانہ یا ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' بھی اسی مجموعے میں شامل تھا۔

قرۃ العین حیدر، ''چار ناولٹ'' (دلربا، سیتاہرن، چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو)، صفحات:۲۹۰، زیر نظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''چار ناولٹ''۔ اس مجموعے میں قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ شامل ہیں۔ یہ تمام ناولٹ الگ الگ کتابی صورت میں بھی سنگ میل لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ ''چار ناولٹ'' کا پہلا ناولٹ ''دلربا'' ہے۔

''دلربا'' کی کہانی اس حقیقت سے پھوٹتی ہے کہ تہذیب اٹل نہیں، تبدیلی اٹل ہے؛ وقت نہایت سفاکی سے اقدار کو بدلتا اور تہذیبی بساط کو اُلٹتا چلا جاتا ہے۔ بزرگوں کے فیصلے اقدار کو رکھنا چاہتے ہیں، آنے والا وقت (جس کا ایک ارضی روپ نسل نو ہے) فقط اپنے آپ کو رکھنا چاہتا ہے۔ ''دلربا'' کا تناظر ہندوستان کے قدیم تھیٹر سے موجودہ فلم تک کا زمانہ اور زندگی ہے؛ یہ ثقافتی نگارخانہ ہمہ وقت تبدیلیوں سے

دو چار ہے اور اس کے بارے میں معاشرے کی تہذیبی سوچ اور اقداری رویے بھی مسلسل بدل رہے ہیں۔''دلربا'' کے کرداروں کے مسائل، مصائب اور المیے انہی تبدیلیوں کا شاخسانہ ہے۔

دوسرا ناولٹ ''سیتا ہرن'' ہے۔''سیتا ہرن'' پہلی بار ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔اس کا موضوع عورت ہے: ایسی عورت جو مظالم اور مصائب میں گھری ہے لیکن پھر بھی اپنے خوابوں کے مطابق جینا چاہتی ہے۔''سیتا'' ایک ملک سے دوسرے ملک تک اور ایک شخص سے دوسرے شخص تک اس مسرت کے لیے بھٹکتی رہتی ہے، جو اس ناشفاف اور ناملائم دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ ۴۷ء کے بعد اس کے مصائب اور استحصال کا آغاز ہوتا ہے اور پھر کہانی اور کردار میں کئی نقطہ ہائے عروج اور نقطہ ہائے زوال آتے ہیں؛ ذات اور خوابوں کی شکستگی کہانی کا انجام اور سیتا ہرن کا اختتام ہے۔ ناولٹ: ''سیتا ہرن'' الگ کتابی صورت میں بھی سنگ میل سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اس کے صفحات: ۱۶۸ ہیں۔

تیسرا ناولٹ ''چائے کے باغ'' ہے۔''چائے کے باغ'' پہلی بار ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ناولٹ کا موضوع بظاہر مختلف معاشی اور معاشرتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے مرد و عورت کی باہمی محبتیں ہیں جن کا انجام ناکامی ہے لیکن حقیقت میں انسان کے داخل و خارج میں پھیلی وہ پیچیدگی ہے جس کے باعث دنیا ایک معمہ نظر آتی ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔''چائے کے باغ'' میں سابق مشرقی پاکستان کے خوبصورت اور پر مصائب معاشرتی زندگی کی نہایت فنکارانہ اور دانش وارانہ عکاسی کی گئی ہے؛ خصوصاً (سابق) مشرقی پاکستان اور آسام (ہندوستان) کی سرحد پر آباد غریب اور مزدور طبقوں کے مسائل اور دکھ سکھ کی تصویریں پر تاثیر اور بے حد حقیقی ہیں۔ناولٹ کے کردار اس طرز زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو مسرتوں اور سچی رفاقتوں سے عبارت ہو، ظاہر ہے ان کی یہ تلاش ''رائیگاں تو ہے''۔

مجموعہ: ''چار ناولٹ'' کا چوتھا ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'' ہے۔یہ ناولٹ پہلی بار ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'' برصغیر کی ایک غریب، فریب خوردہ اور استحصال زدہ عورت کی المیہ داستان ہے لیکن اس کے عقب میں پورے برصغیر کے افلاس زدہ نسوانی طبقے کی زندگی اپنی ساری اندوہناکی کے ساتھ نظر آ رہی ہے۔اس تناظر میں ناول کی ہیروئن ''رشک قمر'' ایک کردار نہیں بلکہ ایک استعارہ بن جاتا ہے۔ناولٹ میں ''خانہ بدوش شو بزنس'' یعنی ادھر ادھر گھوم پھر کر'' ناچ گا کر اور چھوٹے موٹے تماشے دکھا کر اپنی روزی کا ''بہانہ'' کرنے والے طبقے کی عکاسی کا حق ادا کیا گیا ہے۔

مجموعہ: ''چار ناولٹ''۔ میں شامل قرۃ العین حیدر کے چاروں ناولٹ فکری و فنی حوالے سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر، ''چاندنی بیگم''، صفحات: ۴۲۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

''چاندنی بیگم'' کا تناظر تقسیم ہند کے بعد کا ہندوستانی مسلم معاشرہ ہے جس کا تہذیبی انحطاط، فکری خستگی، پھیلتے مسائل اور گہرے مصائب ہزار چھوٹی بڑی کہانیوں کو وجود میں لا رہے ہیں۔''چاندنی بیگم'' کے عنوان سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک کرداری ناول ہے، حالانکہ

ایسانہیں ہے؛ چاندنی بیگم ایک ٹوٹتے ستارے کی طرح کچھ دیر کے لیے ناول کے مطلع پرنظر آتی ہے اور پھر اس کے بعد صرف دوسروں کے تذکروں میں ہی طلوع ہوتی ہے۔اس کے باوجود یہی کردار ناول کا سب سے بلند، مثبت، خوددار، روشن لیکن دکھی اور بے بس کردار ہے؛ جس کا غروب اس کے اولین طلوع میں ہی نظر آ رہا ہوتا ہے۔ ناول کے چودہ ابواب ہیں جن کی فہرست کو''منازلِ قمر'' کا نام دیا گیا ہے۔

ناول زمین کے ملکیتی مسئلے پر''غیر ترقی پسندانہ اور غیر مارکسی'' انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔

قرۃ العین حیدر،''سفینۂ غم دل''، صفحات:۲۵۵، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''سفینۂ غم دل''۔قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ہے؛ ناول کی بنیاد انسانی اقدار اور تہذیبی آثار کی شکست وریخت سے اٹھی ہے۔اس ناول میں بھی ہندوستان کے جاگیردار طبقے کی اپنے فکری وتہذیبی حصاروں اور آثاروں کے ساتھ خاتمے کی منزل تک پہنچنے کی کیفیت پہلے ناول''میرے بھی صنم خانے'' کی طرح موضوع بنی ہے؛ گویا سماجی تناظر یکساں ہے؛ بالکل اسی طرح فنا اور موت پر غور وخوض کی کیفیت بھی اسی انداز سے کرداروں پر حاوی ہے جیسے پہلے ناول میں تھی۔ناول کے کردار انسانیت کے نمائندہ ہیں لیکن تعصب کے طوفان کے سامنے بے بس ودم بخود ہیں۔''سفینۂ غم دل'' مکتبہ جدید، لاہور نے پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شائع کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر،''ستاروں سے آگے''، صفحات:۲۰۸، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''ستاروں سے آگے'' قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جو پہلی بار مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے میں درج ذیل چودہ افسانے شامل ہیں:

دیودار کے درخت، پرواز کے بعد، سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا، ٹوٹتے تارے، لیکن گومتی بہتی رہی، ستاروں سے آگے، آہ! اے دوست، ایں دفتر بے معنی، ہم لوگ، رقصِ شرر، یہ باتیں، اودھ کی شام، مونالسا، جہاں کارواں ٹھہرا تھا۔

رومانی اندازِ پیش کش اور شاعرانہ بیان ان افسانوں کے بنیادی عناصر ہیں؛ ساتھ ہی اردو ادب میں ایک نئے اور نرالے افسانے کے ظہور کی بشارتیں بھی اس مجموعے کے ہر افسانے میں موجود ہیں۔اس مجموعے میں موضوعات کا وہ تنوع اور اسلوب کی وہ پختگی تو نہیں ہے جو بعد ازاں قرۃ العین حیدر کی پہچان بنے لیکن داخل وخارج میں موجود رنگین اور خواب ناک دُھند کو مصنفہ نے بڑی خوبی سے دیکھا اور دکھایا ہے۔اس مجموعے کے افسانوں میں بھی جبر کی موجودگی اور فنا کی آمد کا احساس رومانیت کے جھروکوں سے جھانک رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر،''شیشے کے گھر''، صفحات:۳۲۸، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''شیشے کے گھر''۔قرۃ العین حیدر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے؛ مکتبہ جدید، لاہور نے اسے ۱۹۵۶ء میں پہلی بار شائع کیا تھا۔اس میں بارہ افسانے ہیں جن کے عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

جب طوفان گزر چکا، سرراہے، آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا، میں نے لاکھوں کے بول سہے، برف باری سے پہلے، کیکٹس لینڈ، یہ داغ داغ اجالا، جہاں پھول کھلتے ہیں، دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم، نت بھئے رت بسنت میرو، لندن لیٹر، جلاوطن۔

اس مجموعے کے افسانوں میں رومانی طرزِ احساس کی موجودگی کے باوجود گہری حقیقتیں اور سنگین انسانی مسائل۔۔ نازک دلوں، رشتوں اور عرفانی زاویوں کے روبرو ہیں۔ نزاکت، محبت اور معرفت سب زمانے کے ہمہ جہت آشوب کی زد پر ہیں۔

اس مجموعے کے افسانے ''جلاوطن'' کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کا موضوع بے تعصبی بھی ہے اور جلاوطنی بھی (اور بے تعصب شخص کی تنہائی اور اداسی بھی)۔ افسانہ: ''کیکٹس لینڈ'' میں بھی جلاوطنی کا دکھ اور واپسی کے دروازے بند ہونے کا احساس نمایاں ہے۔

''لندن لیٹر'' اصل میں ایک رپورتاژ ہے؛ اس میں شگفتہ پیرائے میں لندن اور اس کے عقب میں پھیلی پوری مغربی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر مغرب کے سطحی جائزے کے بجائے اس کے بطن میں جھانک کر اپنا تاثر تشکیل دیتی ہیں اور ہلکے پھلکے انداز میں بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ اسے قاری تک پہنچا دیتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر، ''کار جہاں دراز ہے'' (جلد اول، دوم، سوم)، صفحات: ۹۰۶، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''کار جہاں دراز ہے'' ایک سوانحی ناول ہے، جس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء، دوسری ۱۹۷۹ء اور تیسری ۲۰۰۱ء میں سامنے آئی۔ ''کار جہاں دراز ہے'' اردو ادب میں ایک نیا تجربہ تھا، اسے غیر روایتی ناول یا ناول نما سوانح کہا جا سکتا ہے۔ ''کار جہاں دراز ہے'' میں پڑھے جانے کی خوبی اور افسانوی تکنیک: اسے ناول اور حقیقی کرداروں کی موجودگی: اسے سوانح بناتی ہے۔

متنوع قصوں اور شخصیتوں، تاریخ و تہذیب کی ان گنت پرتوں اور مصنفہ کی طرز ادا و اندازِ فکر نے اس طویل سوانحی ناول کو دلچسپ، دلاویز اور معنی خیز بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پورے ناول کی زبان تخلیقی ہے اور اسلوب: رنگوں، جہتوں اور پرتوں کے تنوع کو پیش کرنے کی قوت سے ہمکنار ہے۔

''کار جہاں دراز ہے''۔۔ بظاہر قرۃ العین کے اپنے گھرانے کا بیان ہے لیکن اس میں تقریباً نو صدیوں کی ڈوبتی ابھرتی زندگیاں، تہذیبیں اور تحریکیں اپنی چھب دکھا رہی ہیں اور اپنے ''ان مٹ'' نقوش کے مدہم ہونے پر ششدر بھی ہیں اور نوحہ کناں بھی۔ ناول میں مصنفہ کا تحقیقی طریقہ کار، تاریخ و تہذیب سے گہری دلچسپی اور شعریت کی حامل نثر حسب معمول بڑی خوبی اور تخلیقی شان سے موجود ہے۔

''کار جہاں دراز ہے'' میں علامہ اقبال کے کلام کی گونج، ناول کے عنوان سے لے کر اظہار کے مختلف قرینوں تک میں موجود ہے البتہ قرۃ العین حیدر کا احساس، فکر اور اسلوب ہمیشہ کی طرح ذاتی، منفرد اور مختلف ہے۔

قرۃ العین حیدر، ''میرے بھی صنم خانے''، صفحات: ۳۱۴، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''میرے بھی صنم خانے''۔ قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے، جو مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول اودھ کے

زوال آمادہ جاگیردار طبقے کو موضوع بناتا ہے؛ خصوصاً اس طبقے کے بے فکر اور بے عمل نوجوانوں کی ٹوٹتی بکھرتی داخلی اور خارجی دنیا کو بڑی خوبی اور کامیابی سے سامنے لاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں حیات و کائنات کے بارے میں گہرے فلسفیانہ تصورات و احساسات جو ناول ''آگ کا دریا'' میں ایک بڑے فکری و تہذیبی تناظر میں کہانی کا حصہ بنتے ہیں؛ اولین سطح پر ''میرے بھی صنم خانے'' کی کہانی اور کرداروں کے باطن میں کسی نہ کسی حوالے سے رواں دواں ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تقسیم ہند کے سماجی اور فکری اثرات کی تخلیقی پیش کش کا آغاز بھی ''میرے بھی صنم خانے'' سے ہوا تھا۔

کشور ناہید (مرتب)، ''خواتین افسانہ نگار''، (۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک)، صفحات: ۲۰۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

کشور ناہید نے خواتین افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانوں کا نہایت کڑا اور اہم انتخاب پیش کیا ہے؛ اس میں مسز عبدالقادر سے لے کر نورالہدیٰ شاہ تک کے چنیدہ افسانے شامل ہیں۔ ''خواتین لکھنے والیوں کے توسط، استعارے کی تفہیم'' کے عنوان سے کشور ناہید نے تخلیقی پیرائے میں خواتین افسانہ نگاروں پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ (اس دیباچے پر تاریخ تحریر ستمبر ۹۳ء درج ہے)۔

زیرِ نظر انتخاب میں صرف پاکستانی خواتین افسانہ نگار شامل کی گئی ہیں۔

محمد حسین جاہ، سید، منشی، ''طلسم ہوش ربا'' (سات جلدیں)، صفحات: جلد اول: ۹۸۰، دوم: ۹۶۴، سوم: ۹۲۸، چہارم: ۱۲۸۰، پنجم: حصہ اول: ۸۳۶، حصہ دوم: ۸۸۷، ششم: ۱۳۷۷، ہفتم: ۱۰۷۶، سن اشاعت ندارد

''طلسم ہوش ربا''۔ ''داستان امیر حمزہ صاحبقراں'' کا سب سے اہم، خوبصورت اور دلچسپ حصہ ہے، جو ۸۳۶۸ صفحات پر محیط ہے۔

داستان امیر حمزہ صاحبقراں کے آٹھ دفتر (یا حصے) ہیں، جو چھیالیس جلدوں اور پچاس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ پانچواں دفتر ''طلسم ہوش ربا'' ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے؛ ان میں سے پہلی چار جلدیں منشی محمد حسین جاہ نے ۱۸۸۳ء۔۱۸۹۰ کے دوران میں لکھیں؛ بقیہ تین جلدوں کی تکمیل منشی احمد حسین قمر، اسمٰعیل اثر اور تصدق حسین نے کی۔ ''طلسم ہوش ربا،، کی تمام جلدیں پہلی بار مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے طبع ہوئی تھیں۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے نول کشور کی شائع کردہ جلدوں کا عکس چھاپا ہے، اس طرح یہ سات نایاب جلدیں خصوصاً پاکستان کے قارئین اور کتب خانوں کی دسترس میں آ گئی ہیں (پاکستان سے باہر بھی ''طلسم ہوش ربا'' کی طبع نو کی پذیرائی کی گئی ہے) ساتویں جلد کی اشاعتی تکمیل پر (ناشر) نیاز احمد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میں نے اردو کے کلاسیکی ذخیرے کو دوبارہ شائع کرنے کا جو ارادہ باندھا تھا، خدا کے فضل و کرم سے آج اس سلسلے کا ایک اہم سنگ میل عبور کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ اہل علم و ادب اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو کے داستانوی ادب میں ''طلسم ہوش ربا'' کا کیا

مقام ومرتبہ ہے۔

یہ داستان، تخیل اور اسلوب کے کمال کا ایسا حیرت انگیز جہان آباد کرتی ہے کہ اس کا جادو ہر دور میں سر چڑھ کر بولتا ہے.... ''فسانہ آزاد'' اور ''طلسم ہوش ربا'' کی اشاعت نے میرے لیے محنت کی نئی راہیں کھولی ہیں.... میں جناب شیخ محمد نصیر ہمایوں مرحوم (احسن برادرز) کا ممنونِ احسان رہوں گا جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور جنہوں نے مجھے کتابوں سے محبت کرنا سکھایا.... میں جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ''طلسم ہوش ربا'' کی ساری جلدیں بہم پہنچائیں''۔

محمد خالد اختر، ''چاکی واڑہ میں وصال''،صفحات:۲۰۳،زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

چاکی واڑہ میں وصال معروف مزاح نگار محمد خالد اختر کا ایک معروف ناول ہے،لیکن عام اردو ناولوں سے مختلف ہے اس نوعیت کے ناول مغربی ادب میں تو لاتعداد ہیں لیکن اردو میں واحد مثال زیرِنظر ناول ہی ہے۔ چاکی واڑہ میں وصال۔فینٹیسی (Fantansy) کا ناول ہے؛ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین اسی حوالے سے کیا جاتا ہے۔اس ناول میں کوئی واقعہ اور کوئی کردار حقیقت اور فطرت کے خلاف نہیں ہے؛ اصل میں حقیقت اور فطرت کی زندگی سے مصنف کی تخیلاتی دنیا کا سنجوگ ہوگیا ہے؛ اور یوں ایک نئی حقیقت، ایک مختلف واقعاتی دنیا اور منفرد کردار سامنے آئے ہیں۔ناول دلچسپ ہے؛ محمد خالد اختر کا اسلوب نیا، تازہ اور انگریزی ادب کا گرم وسرد چشیدہ ہے، نیز فینٹیسی اور ادبی مزاح کی حامل کہانی کے لیے نہایت موزوں اور لائق داد ہے۔

چاکی واڑہ میں وصال۔ پہلی بار لارک پبلشرز کراچی سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ہی طبع کیا تھا؛ اور اس کے فلیپ پر ابن انشا اور احمد ندیم قاسمی کی آراتھیں۔

محمد خالد اختر، ''کھویا ہوا اُفق''،صفحات:۲۸۶،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

''کھویا ہوا اُفق''۔محمد خالد اختر کے ہلکے پھلکے مضامین، افسانوں، خاکوں اور سفر ناموں پر مشتمل ہے۔ جو بقول محمد خالد اختر انیس بیس سال کے عرصے میں لکھے گئے تھے۔(ص۵) اپنے دیباچے بعنوان ''پیارے پڑھنے والے سے'' میں محمد خالد اختر اپنی لکھنے کی عادت، انگریزی ادب کے مطالعے اور نگارشات کے اشاعتی پس منظر سے آگاہ کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پہلی مطبوعہ تحریر ایک سفری روئداد ''ڈیپلو سے نواں کوٹ تک'' تھی جو ۱۹۴۵ء میں لکھی گئی اور ادب لطیف میں شائع ہوئی۔اس مجموعے میں محمد خالد اختر کے تخلیق کردہ معروف مزاحیہ کردار چچا عبدالباقی کی دو کہانیاں بھی شامل ہیں۔فہرست اندراجات یہ ہے:

کھویا ہوا اُفق، سائیں حیدر علی فندک، فورتھ ڈائمینشن، مچھلیاں اور عبدالباقی، رفتارِ ادب، ایک باتصویر سوسائٹی میگزین، مسٹر گھامڑ

کا ادبی کیرئیر، ڈیپلو سے نواں کوٹ تک، معلوماتی قاعدہ۔(ا)۔ بچوں کے لیے، مقیاس المحبت ،تنقید نگاری سے توبہ، زیبرا اسکیم، چچا سام کے نام آخری خط، دہقانی یونیورسٹی، معلوماتی قاعدہ (۲)۔ قدرے بڑے بچوں کے لیے، آخری دن۔

محمد خالد اختر کا اسلوب تحریر اردو ادب میں نیا، انوکھا اور تخلیقی شگفتگی سے بھرا ہوا ہے۔ محمد خالد اختر ''ادیبوں کے ادیب'' بھی کہلاتے ہیں۔ ''کھویا ہوا اُفق'' کا پہلا ایڈیشن مکتبہ جدید، لاہور نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔

محمد عمر میمن، ''تاریک گلی''، صفحات: ۱۸۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

''تاریک گلی'' محمد عمر میمن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ محمد عمر میمن کی بنیادی پہچان ایک اچھے مترجم اور افسانے کے ناقد کی ہے؛ زیرِ نظر افسانوی مجموعے سے انہوں نے ایک کامیاب افسانہ نگار کے طور پر بھی اپنا تشخص قائم کیا ہے۔ مجموعے میں شامل افسانے درج ذیل ہیں:

چاندنی اور کھمبیاں، واپسی، حصار، تاریک گلی، کینچوا اور سورج مکھی، بجلی بسنت، تاب نظارہ نہیں، ماسی، بڑا اپدیشک ہے۔

ان افسانوں میں کلاسیکل افسانے سے آگاہی اور جدید افسانے کا شعور جھلک رہا ہے؛ واقعات، کردار نئے ہیں، نیز اسلوب اور زبان ذاتی اور غیر روایتی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ، ''بہاؤ''، صفحات: ۲۶۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

ناول ''بہاؤ'' کی کہانی اور کرداروں کی تشکیل عہد قدیم کی بستیوں موہن جو داڑو اور ہڑپہ کے تناظر میں کی گئی ہے۔ ناول کا موضوع تہذیبی تھکاوٹ ہے جس کا انجام مرگ مفاجات کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ ناول کی سب سے بڑی فنی خوبی یہ ہے کہ ناول کا تناظر پرانا اور زمانہ معاصر معلوم ہوتا ہے؛ لگتا ہے کہ موہن جو داڑو اور ہڑپہ خود ختم ہوگئیں لیکن ان کی تہذیبی تھکاوٹ، سماجی تفاوت اور اخلاقی گراوٹ کا بہاؤ ہمارے دروں اور دریاؤں تک آ پہنچا ہے، جبھی تو فکر کے سوتے، باطن کے چشمے اور عمل کے کرشمے ناپید ہونے لگے ہیں۔

ناول کے بارے میں عبداللہ حسین کی رائے کچھ یوں ہے:

> ''یہ ناول قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس پر متعدد سمتوں سے نظر ڈالے.... یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ پنجاب کے ایک ادیب نے اپنے کلچر کی چند جڑیں سرزمین سندھ سے کھود کر نکالی ہیں.... ایک قاری کی حیثیت سے مجھے تین باتوں کا احساس ہوا ہے؛ کہانی، کردار اور زبان۔ کہانی میں انرجی اور اندرونی ربط .... ہے۔ کردار کے بارے میں صرف ایک کا ذکر کافی ہے اور وہ ہے عورت کا مرکزی کردار۔ اردو فکشن میں اس سے زیادہ زوردار نسوانی کردار مشکل سے دستیاب ہوگا.... اس ناول میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات اس کی حیرت انگیز زبان ہے.... مجھے یقین ہے کہ ہماری کلچرل زندگی میں اس ناول کی عمر طویل ہوگی''۔ (فلیپ: تاریخ

تحریر: ۷ اپریل ۱۹۹۲ء)

مستنصر حسین تارڑ، ''پرندے'' (دوناولٹ)، صفحات: ۱۶۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۴ء

''پرندے''۔ میں دوناولٹ '' پکھیرو'' اور ''فاختہ'' موجود ہیں؛ پکھیرو پنجابی سے ترجمہ ہے اور اردو ترجمے کے لیے مستنصر نے محمد سلیم الرحمٰن کے مشوروں اور راشد جاوید کی کاوشوں کا شکریہ ادا کیا ہے (پہلا صفحہ) ناولٹ '' پکھیرو'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو معاشرے کی قباحتوں اور غلاظتوں سے تنگ آ کر فطرت کی بے کنار، پاکیزہ اور آزاد فضا میں داخل ہو جاتا ہے؛ اسے پکھیرو کی رفاقت میسر آتی ہے اور وہ اسے پہلے اپنا رفیق اور رہنما اور آخر میں ہمزاد سمجھنے لگتا ہے۔

بنیادی طور پر اس ناولٹ کے دو کردار ہیں: ''معاشرہ'' (جو ولن ہے) اور ''شخص'' (جو ہیرو ہے)؛ پکھیرو اس شخص کے اندر سے ہی برآمد ہوتا ہے اور اسے ذات کے پھیلاؤ، زندگی کے حاصل اور نام نہاد تمدنی معاشرے کی لایعنیت سے آگاہ کر دیتا ہے۔

دوسرا ناولٹ ''فاختہ''۔ جانوروں اور پرندوں کے حوالے سے عالمی تناظر کو پیش کرتا ہے۔ عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور زیادتیوں کو بھگتنے والی کمزور قومیں دیکھنے، محسوس کرنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن ظلم کو روکنے، سربلند ہونے اور عافیت سے رہنے کی کوئی سبیل ان کے پاس نہیں ہے۔ اس منظر نامے میں فاختہ اکیلی اور کمزور ہے گویا امن غائب ہے اور کمزور سے ہر جائے امان چھن چکی ہے، فاختہ خود خوفزدہ ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''پیار کا پہلا شہر''، صفحات: ۲۶۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

ناول کی تکنیک، سفر نامے کے اسلوب میں ڈھل جائے تو ''پیار کا پہلا شہر'' ایسا فن پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ ناول کا تناظر فرانس ہے اور موضوع درد اور دردمندی ہے۔ ناول کے آغاز میں شعبہ اردو ماسکو یونیورسٹی روس کی سینئر پروفیسر '' گالینا ڈشنکو'' کی رائے اور تاثر درج ہے:

> ''میں ایک حساس شخص سے اس کی اندرونی دنیا اور اس کی آنکھوں سے دیکھی ہوئی باہر والی دنیا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ خاص طور پر اس دنیا میں جہاں پاسکل جیسی پیاری، نازک اور بدقسمت لڑکی رہتی ہے.... ماسکو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے طلبہ بھی پاسکل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے''۔ (ص ۵)

''پیار کا پہلا شہر'' اردو کے مقبول ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''راکھ''، صفحات: ۵۸۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۷ء

ناول ''راکھ'' کا موضوع پاکستان ہے: بے شمار قربانیوں سے حاصل کیا ہوا ملک کس طرح ٹوٹا، باقی ماندہ ملک کو پسماندہ رکھنے کی

کیا تدابیر اختیار کی گئیں، اور اب کون سے المیے اس شہر آشوب کے نقطہ عروج کے منتظر ہیں؟ یہ سب سوال مل کر کہانی کو قائم کرتے ہیں اور کرداروں کو تشخص دیتے ہیں۔ راکھ: تبصرہ ہے نہ تجزیہ، نہ پیش گوئی، بس واقعہ اور انتباہ ہے۔ ناول کے آغاز میں درج مجید امجد کی نظم کے چند مصرعے: ناول کے مواد اور ناول نگار کے طرزِ احساس کی جانب بلیغ اشارے کر رہے ہیں۔

راکھ کی علامت دو پرتیں رکھتی ہیں: سب کچھ ختم ہونے کی اور راکھ کے اندر موجود کوئی ڈھکی چھپی چنگاری کے دوبارہ سلگ اُٹھنے کی۔ ناول میں مختلف النوع قصے، کردار، علاقے اور حادثے باہم آمیز ہو کر اس علامت (راکھ) کی دونوں پرتوں کی توثیق کرتے ہیں۔

ناول نگار کے مثبت اور مضبوط فکری و فنی رویئے کے باعث ناول: راکھ قنوطیت کے مدار میں داخل نہیں ہوا حالانکہ ایسا ہونا بعید از امکان ہوتا نہ خلاف واقعہ!!

مستنصر حسین تارڑ، ''سیاہ آنکھ میں تصویر''، صفحات: ۲۲۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

''سیاہ آنکھ میں تصویر'' مستنصر حسین تارڑ کا افسانوی مجموعہ ہے۔ مستنصر کے افسانوں میں محبت کی رم جھم بھی نظر آتی ہے اور دنیاوی مصائب کے سیلاب بلاخیز کے تھپیڑے بھی۔ زیرِ نظر مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

آدھی رات کا سورج، سیاہ آنکھ میں تصویر، پریم، درخت، بابا بگلوس، غلام دین، آکٹوپس، بادشاہ، ذات کا قتل، گیس چیمبر، لوہے کا کتا، جولی (پارک شائر کی گائے)، کوٹ مراد، آؤ، ٹائم مشین، ڈائری۔

افسانہ ''ڈائری'' ایک مختصر طنزیہ ہے جس میں سقوط ڈھاکہ کے المیے کی بازگشت اور کسی نئے سانحے کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''قربتِ مرگ میں محبت''، صفحات: ۳۷۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''قربتِ مرگ میں محبت'' مستنصر حسین تارڑ کا ''بہاؤ'' اور ''راکھ'' کے بعد آنے والا ناول ہے۔

یہ ناول: ادبی، ثقافتی اور شخصی طور پر مستحکم ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جس کا شخصی استحکام اب بڑھاپے اور موت کی زد پر ہے اور قلبی اطمینان محبت کی زد پر آ چکا ہے۔ ناول کی کہانی: موت سے محبت تک اور محبت سے موت تک دونوں شاہراہوں پر بیک وقت آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ تہذیب و تاریخ کے بطن میں بھی اپنا سفر بڑے ہنر سے جاری رکھتی ہے۔

مسعود اشعر، ''سارے فسانے''، صفحات: ۴۲۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

''سارے فسانے''۔ مسعود اشعر کے دو افسانوی مجموعوں: ''خطِ سرطان'' اور ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'' پر مشتمل ہے۔

مجموعہ ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا البتہ ''خطِ سرطان'' نیا مجموعہ ہے۔

انتظار حسین مسعود اشعر کے پرانے اور نئے افسانوں پر اظہارِ خیال یوں کرتے ہیں:

''جس آشوب کی لپیٹ میں ہم آئے ہوئے ہیں اس کا تخلیقی سطح پر اگر کہیں اظہار ہوا ہے تو وہ مسعود اشعر کا افسانہ ہے۔ خارج کی سطح پر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ مگر یہاں لگتا ہے کہ باطن کی سطح پر زیادہ بڑا سانحہ گزرا ہے۔ سقوط ڈھاکہ سے بڑا سقوط۔ سارا نقشہ تتر بتر ہے۔ تصویریں ادھوری اور غیر واضح۔ لگتا ہے کہ اندھیرے میں چل رہے ہیں۔ بار بار کوئی تکلیف دہ سوال رستہ کاٹتا ہے۔
مسعود اشعر کے اس وقت کے افسانوں اور آج کے افسانوں کے درمیان ایک لمبی چپ ہے.... اب عورت اور مرد کا رشتہ افسانے کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مگر یہ عورت بھی نئی ہے اور مرد بھی نیا ہے.... یہ لبریٹڈ کھوکھلی عورت آج کی معاشرتی حقیقت ہے.... میں یہ احمقانہ سوال نہیں کروں گا کہ آج کا آشوب مسعود اشعر سے کیوں کچھ نہیں کہتا۔ اس افسانے کے اپنے معنی تھے۔ اس افسانے کی اپنی معنویت ہے۔ ویسے کھوکھلی لبریٹڈ عورت بھی چھوٹا آشوب نہیں ہے''۔ (فلیپ)

''سارے فسانے'' میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

مجموعہ: ''خطِ سرطان'': بچھڑے کا گیت، خواب، ایک بہت پرانی کہانی، سفر نامہ، خوابوں کے زندانی، بتاشوں پر چلنے والے، لوحِ آئینہ، ننگا آسمان، کھلی ہتھیلی کا عذاب، مجھے چہرہ دکھا میرا، خاموشی۔۱، خاموشی۔۲، خاموشی۔۳، ایک بڑی کہانی کے لیے ورک نوٹس، آئینے، ایک قدم، خطِ سرطان۔

مجموعہ: ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'': ''درخت اور دروازے، طیراً ابابیل، اندھے سفر میں ایک صبح، کابوس، اعراف، پابہ زنجیر، ٹوٹا پھوٹا گھر، موم کا شہر، دل کے آسیب، اکیلے آدمی کا سفر، غیر آدمی، دوستی کی دیوار، دکھ جومٹی نے دیئے، اپنی اپنی سچائیاں، ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل، آنکھوں پر دونوں ہاتھ، بیلا نائی رے، جولدی جولدی۔

مظہر الاسلام، ''باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی''، صفحات: ۱۸۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

مظہر الاسلام کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ اپنے عنوان کی مانند منفرد اور خوبصورت ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں باتوں کی بارش، بھیگنے کی کیفیت، اور محبت کرنے والوں کی اداسی اور بے بسی کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ قرأت، واردات میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

کہانی کیسے بنی؟، شام پڑے برتن ٹوٹنے کی آواز، پنجرہ، آؤ بجھ جائیں، لائن مین اب شہر کی شکایت کس سے کرے؟، گھر سے دور ایک گڑیا، ایک شام نے چڑیا کو چگ لیا، تتلی، پاگل، کیمرے میں مری ہوئی لڑکی، گواہ، بن بیاہی بات، شہر پناہ، بچا کھچا، بیس برس پرانا اشتہار، زہر باد، می رقصم، کہانی سے باہر گرا ہوا بابا، گمشدہ بچہ، باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے، بابا اور ڈولی، شام ڈھلے میلے سے واپسی،

میری کہانی لکھو، اس کی باتیں کون سنتا ہے، پھٹا ہوا آدمی، پت جھڑ، کردار سے روٹھی ہوئی ایک کہانی۔

(عنوانات کی مانند) مظہر الاسلام کے افسانے گہرے تاثر، شعریت، معنویت اور انوکھے واقعات، کردار اور اسلوب کے حامل ہوتے ہیں۔ مظہر الاسلام کے افسانوں کا مرکزی موضوع محبت ہے جس کا حاصل عموماً محرومی، تنہائی، اداسی اور موت ہے۔ مظہر الاسلام ہر طبقے اور ہر عمر کی محبتیں مجسم کرنے کا فن جانتے ہیں۔

آغاز میں دیباچے کا قائم مقام ایک مکالمہ (مابین: مرد وعورت) ہے جو افسانہ نگار کے ویژن اور تخلیقی محرکات کو روشن کرتا ہے۔

مظہر الاسلام، ''خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر''، صفحات: ۲۳۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر'' مظہر الاسلام کے چوبیس افسانوں، پانچ سفر کہانیوں اور چونتیس افسانچوں یا نثر پاروں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ آغاز میں حسبِ معمول ایک مکالمہ (مابین: مرد وعورت) ہے جسے دیباچے کا قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ اس مکالمے کے ذریعے مظہر الاسلام نے اپنے فن، اسلوب، لفظیات اور موضوعات کی توجیہہ تخلیقی انداز میں کی ہے۔ مجموعے کے اندراجات کی فہرست درج ذیل ہے:

پروں پر پانی، کاغذ کے ایک شہر کا قصہ، جاگتے سمندر کے کنارے سوئی ہوئی کشتیاں، کسی اور گاؤں کا آدمی، ایک کہانی بھلا دینے کے لیے، آنکھیں نیند سوچتی ہیں، اس شہر میں ایک پرانا کنواں تھا، کھلونے 2، جنتری، کھویا ہوا بچپن ڈھونڈ ا ہوا بڑھاپا، ڈیڈ لیٹر، شیلف سے گری ہوئی کتاب، کہار، مرحوم کی روح اب کیا لینے آتی ہے؟، سڑک کی تصویر، پورٹریٹ، جلد ساز، آندھی اور کھلی کھڑکیاں، گڑیا مرنے نہیں دیتی، چاروں طرف پانی، مٹھی بھر لفظ، بوچھاڑ، شام باتوں میں چابیوں کا ذکر، کوٹ سے ٹوٹ کر گرا ہوا بٹن۔

سفر کہانیاں: سفر کہانی، ایک گمشدہ شخص کی تلاش، مائی ہیر سے ملاقات۔۔ جہاں میاں رانجھا بھی تھا، مرحوم کے گھر رات کے کھانے پر، یہ کتاب کس کو دوں۔

قصہ مختصر: چونتیس افسانچے/ نثر پارے۔

مظہر الاسلام، ''گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو''، صفحات: ۲۶۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

موت کی طرف کھلی کھڑکی، کھلونے، ناراض شخص کے دل سے پلٹ کر آنے والی آوازیں، چور آنکھ، ایک گڑیا کا زائچہ، وہ اسے گدھے پر بٹھانا چاہتے تھے، گٹھڑی میں چور، رات کنارا، تتلی کے بوجھ سے ڈولتی ٹہنی، رات، سرگوشیوں کی اوٹ میں بیٹھا خاکروب، سفید گلاب، کہانی کی مٹھی میں ڈرامہ، اندھیرے میں بیٹھ کر لکھا ہوا خط، قبرستان کے کنارے تھوڑی سی زندگی، قتل کا مقدمہ، شام کی دیوار کے اُس پار، معرفت چاچا نوردین، مرحوم کے لیے چڑیا پھول کیوں لاتی ہے، دھتکارا ہوا آدمی، آنکھوں کے اجڑے ہوئے شہر میں کتابوں کی ایک دکان، شکار، ابر آلود شہر میں چھتری بھر دھوپ، شکار کیا ہوا جانور۔

افسانوں سے پہلے ایک مکالمہ (مابین: مرد وعورت) مظہرالاسلام کی ہر کتاب کی ایک روایت ہے۔ اس مکالمے میں وہ مجموعے کے افسانوں کے حوالے اپنے احساس، فکر اور نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مظہرالاسلام لحہ موجود کے افسانہ نگار ہیں؛ ان کا فن عصر کے مصائب سے شعور اور تحریک حاصل کرتا ہے۔ مظہرالاسلام کی کہانیاں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

مظہرالاسلام، ''محبت: مردہ پھولوں کی سمفنی''، صفحات: ۲۲۹، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

مظہرالاسلام کے اس ناول کے عنوان تلے (ذیلی عنوان کے طور پر) لکھا گیا ہے کہ ''دنیا سے ختم ہوتی ہوئی محبت کو بچانے کے لیے لکھا گیا ایک ناول''۔ ناول کے آغاز میں ایک فرضی مکالمہ ہے جو ناول کے موضوع، ناول نگار کے رویے اور ناول نگاری کی توجیہہ بیان کرتا ہے۔ اس مکالمے سے چند جملے:

> ''میرا یہ ناول دراصل محبت کا عجائب گھر ہے اس دنیا سے انتہائی تیز رفتاری سے ختم ہوتی ہوئی محبت کی پراسرار راہداریوں میں سایوں اور خوابوں میں لپٹے نادر نمونوں کا سانس لیتا میوزیم....
> ہر سچا دل محبت کا چرواہا ہوتا ہے جو بے محبت موسم میں محبت کی نگہبانی کے عہد کی پرورش سے کبھی غافل نہیں ہوتا.... یہ ناول انسانی جذبوں کی ایک ایسی سمفنی ہے جس کا آرکسٹرا حقیقی واقعات اور خوابوں کی تمثیل پر مبنی ہے''۔ (ص ۹،۱۳،۲۱)

مظہرالاسلام ''محبت'' کے کہانی نویس ہیں لیکن ان کی کہانی رومان کی دھند کے بجائے حقیقت کی دھوپ میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ ان کا اسلوب بھی رومانی نہیں ہے البتہ شعریت کا حامل ہے۔

ممتاز مفتی، ''الکھ نگری''، صفحات: ۹۹۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

''الکھ نگری''۔ ممتاز مفتی کے سوانحی ناول ''علی پور کا ایلی'' کا دوسرا حصہ ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' ۱۹۴۷ء تک کے واقعات سامنے لاتا ہے؛ ''الکھ نگری'' کا زمانی و مکانی سفر اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری'' میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر کو ناول کے طور پر سامنے لایا گیا تھا اور ایک زمانے کے بعد اس کے سوانح ہونے کا اعتراف کیا گیا تھا، اس کے برعکس موخر الذکر کو سوانح کے طور پر ہی پیش کیا گیا ہے لہٰذا دلچسپی کا جو عنصر اور واقعات کا جو بہاؤ ''علی پور کا ایلی'' میں ہے وہ ''الکھ نگری'' میں نہیں ہے؛ اس کے باوجود الکھ نگری ممتاز مفتی کے سحر طراز قلم، نفسی تجزیے کی قوت اور تاثر و تاثیر پیدا کرنے کی بے مثل صلاحیت کے باعث ایک اہم اور خوبصورت ناول ثابت ہوا ہے کہ اس نے اپنی ضخامت اور سوانحی مواد کی کثرت کے باوجود ممتاز مفتی کے قارئین کے حلقے کو وسیع کیا ہے۔

الکھ نگری کے دیباچے ''کتاب کی بات'' میں ممتاز مفتی نے پہلے ۲۳ ابواب کو ایلی کی زندگی کا تسلسل اور دیگر ابواب کو ۱۹۵۶ء سے

لکھی جانے والی ذاتی ڈائری کا حاصل کہا ہے؛ قدرت اللہ شہاب کے متعلق الکھ نگری کا حصہ ان ڈائریوں سے ہی ماخوذ ہے۔
الکھ نگری کی سوانحی اور دستاویزی حیثیت کو بڑھانے کے لیے ناول کے ضمیمے میں خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ممتاز مفتی، ''اَن کہی''، صفحات:۲۴۳، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۸ء

''اَن کہی''۔ممتاز مفتی کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جو پہلی بار ۱۹۴۳ء میں مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوا تھا؛اس کے بعد''اَن کہی'' کے دو ایڈیشن مصنف کی اجازت کے بغیر اور اغلاط کی بھرمار کے ساتھ شائع ہوئے؛ ۱۹۸۸ء میں سنگ میل سے زیرِ نظر اشاعت عمل میں آئی۔اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

آپا، بیگانگی، جھکی جھکی آنکھیں، آپ بیتی، اندھیرا، خلط ملط، یہ دیوی، نفرت، محلّہ، غسل آفتابی، کرن محل کا بھوت، مہندی والا ہاتھ، اندھا، ماتھے کا تل، مورا، انطخام، سیانی۔

ممتاز مفتی''اَن کہی'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:''اگر میں ان کہی کہنے میں کامیاب نہ ہوا تو بھی مجھے خوشی ہوگی کہ میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔اس امید پر کہ شاید یہ تحریریں کسی بہتر قلمکار کو اس موضوع پر لکھنے پر اکسا ئیں۔(ص:۱۱)

اس مجموعے کا پہلا افسانہ''آپا'' اردو کی افسانوی روایت میں ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔دیگر افسانے بھی انسانی نفس کی''ان کہی'' کو سامنے لانے کی کوشش سے عبارت ہیں۔''جھکی جھکی آنکھیں'' ممتاز مفتی کا پہلا افسانہ ہے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔

ممتاز مفتی، ''علی پور کا ایلی''، صفحات:۱۱۶۷، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''علی پور کا ایلی''، ممتاز مفتی کا ضخیم سوانحی ناول ہے، جو پہلی بار اشفاق احمد کے ذاتی اشاعتی ادارے''داستان گو'' لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا؛ دوسری بار میری لائبریری لاہور نے ۱۹۶۹ء اور تیسری بار سنگ میل لاہور نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا؛ آخری ایڈیشن میں ناول کے کرداروں کے اصل ناموں کی ایک فہرست بھی شامل کر دی گئی جس سے ناول کی سوانحی حیثیت مسلم اور محکم ہوگئی۔

''علی پور کا ایلی''۔ایلی کی کہانی ہے جس میں اس کے گھرانے اور زمانے کا ماحول (خصوصاً ایلی کے باپ کی منفرد ومنفی شخصیت) اور ایلی کی داخلی وخارجی زندگی کی تمام پرتیں نہایت خوبی سے کھلتی چلی جاتی ہیں۔ناول میں کرداروں کے نفسیاتی وجنسی مطالعے ناول نگار کی انسانی باطن کی وسعتوں اور پیچیدگیوں تک رسائی کو ظاہر کر رہے ہیں۔

ممتاز مفتی کا اسلوب ذاتی ہے اور ان کی باریک بینی، گہرے تاثر اور اداس ورنگین کیفیت کے بیان کا کفیل ہے۔اس ضخیم وعظیم ناول کو آدم جی ادبی ایوارڈ نہیں ملا تھا جس سے ایوارڈ کا مقام ومرتبہ اور مصنفین کا ذوق ادب خاصا موضوع بحث بنا تھا۔

منٹو، سعادت حسن، ''منٹو باقیات''، صفحات:۵۶۰، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''منٹو باقیات' میں تراجم، طبع زاد افسانے، ناول اور نایاب خطوط شامل ہیں۔ اندراجات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ''سرگزشتِ اسیر'': یہ وکٹر ہیوگو کی مشہور ڈرامائی تصنیف The last days of the condemoned کا ترجمہ ہے۔ آغاز میں مصنف اور مترجم دونوں کے الگ الگ دیباچے ہیں یہ ترجمہ پہلی بار اردو بک سٹال لاہور سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

۲۔ ''ویرا'' (انقلاب روس کی خونی داستاں) یہ آسکر وائیلڈ کا شاہ کار (چار ایکٹ میں ایک حزینہ) ہے۔ منٹو نے اس کا خوبصورت اور رواں ترجمہ کیا ہے۔ یہ پہلی بار دارالاحمر، امرتسر سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

۳۔ ''گورکی کے افسانے''۔ ان مترجمہ افسانوں کے ساتھ منٹو کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے۔

۴۔ ''روسی افسانے''۔ روسی افسانے کے ان تراجم کی اشاعت کے لیے باری (دارالاحمر امرتسر) نے مقدمہ لکھا ہے۔ پہلی بار اس کتاب کو دارالاشاعت لاہور نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔

۵۔ ''منٹو کے افسانے''۔

۶۔ ناول: بغیر عنوان کے۔

۷۔ متفرقات: اس میں منٹو کے چند نایاب خطوط، ''باتیں ہماری یاد رہیں'' کے عنوان سے منٹو کے لکھے مختصر تخلیقی شذرے اور سید وقار عظیم کا مضمون ''منٹو'' کا ''فن'' شامل ہے۔

منٹو، سعادت حسن، ''منٹو کہانیاں''، صفحات: ۶۹۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''منٹو کہانیاں'' میں چھ مجموعے: ''نمرود کی خدائی، بادشاہت کا خاتمہ، افسانے اور ڈرامے، دھواں، انارکلی، شکاری عورتیں'' نو غیر مطبوعہ افسانے اور بائیس مطبوعہ افسانے، (جو پہلی مرتبہ کتابی صورت میں سامنے آئے) شامل ہیں۔

آغاز میں ادارے کی جانب سے ایک مختصر شذرے میں بتایا گیا ہے:

> ''کلیات منٹو کے سلسلے کا پہلا مجموعہ ''منٹو نامہ'' ۱۹۹۰ء میں طبع ہوا.... ۱۹۹۰ء میں ہی کلیات منٹو کی دوسری ضخیم جلد ''منٹو راما'' شائع ہوئی.... ۱۹۹۱ء میں کلیات منٹو کی تیسری (جلد) ''منٹو نما'' (سامنے آئی).... ''منٹو کہانیاں'' کلیات منٹو کے اشاعتی منصوبے کی چوتھی جلد ہے''۔ (ص ۸،۷)

منٹو، سعادت حسن، ''منٹو راما''، صفحات: ۹۵۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۴ء

''منٹو راما'' پہلی بار سنگ میل لاہور نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا؛ یہ کلیات منٹو کے سلسلے کی دوسری جلد ہے۔ ''منٹو راما'' میں منٹو کے چند نمایاں، معروف اور ہنگامہ خیز افسانے شامل ہیں۔ اس ضخیم مجموعے میں درج ذیل افسانوی کتب موجود ہیں:

خالی بوتلیں خالی ڈبے، سڑک کے کنارے، اوپر نیچے اور درمیان، برقعے، رتی، ماشہ، تولہ، آتش پارے، منٹو کے افسانے۔

آ خرالذکر مجموعے کا پیش لفظ منٹو کے ایک مضمون پر مشتمل ہے (تاریخ تحریر یکم جنوری ۱۹۴۴ء درج ہے) منٹو کے معروف افسانے ''نیا قانون'' اور ''ہتک'' بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔منٹو کے مشہور طنزیہ خطوط چچا سام کے نام، مجموعہ: ''اوپر نیچے اور درمیان'' میں شامل ہیں۔مجموعہ: ''خالی بوتلیں خالی ڈبے'' میں ''سہائے'' مجموعہ: سڑک کے کنارے'' میں موذیل ایسے معروف اور اہم افسانے موجود ہیں۔مجموعہ: ''آتش پارے'' منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور اسی میں ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ ''تماشا'' بھی شامل ہے۔

منٹو،سعادت حسن، ''منٹونامہ''، صفحات: ۷۱۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

''منٹونامہ'' پہلی بار ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا اور یہ سنگ میل پبلی کیشنز کے کلیات منٹو کے اشاعتی سلسلے کا پہلا مجموعہ تھا۔

سعادت حسن منٹو اردو کی افسانوی روایت کا اہم ترین نام ہیں اور ان کے چند افسانے تو اردو ادب کے کلاسیک میں شمار ہونے لگے ہیں؛ سنگ میل نے کئی جلدوں پر مشتمل ان کا کلیات شائع کر کے ان کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کو صحت متن کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔

''منٹونامہ'' میں درج ذیل افسانوی مجموعے شامل ہیں:

پھندنے، یزید، چغد، ٹھنڈا گوشت، سرکنڈوں کے پیچھے، لذت سنگ، بغیر اجازت۔

مجموعہ ''پھندنے'' کا معرکتہ الآرا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہے۔اسی مجموعے میں شامل دو افسانے پھندنے اور فرشتہ کو اردو کے اولین علامتی اور تجریدی افسانے قرار دیا گیا ہے۔

مجموعہ: ''یزید'' میں شامل افسانے گورمکھ سنگھ کی وصیت (۴۷ء کے فسادات کے پس منظر میں) ٹیٹوال کا کتا (پاک بھارت کی پہلی جنگ ۴۸ء کے حوالے سے) اور یزید (پاکستان کے دریاؤں پر بھارتی قبضے کے تناظر میں) خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

مجموعہ: ''چغد'' کا افسانہ بابو گوپی ناتھ، مجموعہ: ٹھنڈا گوشت کا ٹھنڈا گوشت اور مجموعہ: لذت سنگ کے تینوں افسانے بو، دھواں اور کالی شلوار معروف ہوئے۔مجموعہ: ''چغد'' کے آخر میں منٹو کا لکھا ہوا ایک دیباچہ شامل ہے۔

منٹو،سعادت حسن، ''منٹونما''، صفحات: ۷۷۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

اس افسانوی کلیات میں منٹو کے درج ذیل مجموعے شامل ہیں:

گنجے فرشتے، لاؤڈ سپیکر، تلخ، ترش اور شیریں، منٹو کے مضامین: سیاہ حاشیے۔

زیرِ نظر کلیات کا پہلا مجموعہ ''گنجے فرشتے'' خاکوں اور آخری مجموعہ سیاہ حاشیے افسانچوں پر مشتمل ہے۔

منٹونما میں شامل اکثر تحریروں کا خمیر نہایت گہرے طنز سے اٹھا ہے۔

منیر احمد شیخ، ''بہتے پانی میں عکس''، صفحات: ۲۲۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

''بہتے پانی میں عکس''منیر احمد شیخ کا افسانوی مجموعہ ہے؛ آغاز میں ''میں اور میرا عکس'' کے عنوان سے مصنف نے تخلیقی سرگرمی کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے؛ آخر میں'' لکھنے والے کی کہانی'' کے نام سے ایک افسانوی نوعیت کا مضمون ہے جس میں منیر احمد شیخ کی سوچ اور تخلیقی رویے کو موضوع بنایا گیا ہے؛ اس مضمون کے مصنف کے بارے میں درج ہے :''باتیں نچھی کی،تحریر مختار صدیقی کی''۔ افسانوں کے عنوان درج ذیل ہیں:

شگون،کھارے پانی کا بندہ،۹دسمبر،زرد ماضی کی خوشبو،پھر موج ہوا پیچاں،ایک تھوکا گیا آدمی،وہ جو تنہا تھے،بند گھڑی، چکر اک تقدیر کا،اوپریشن بائی پاس،قصہ سوتے جاگتے کا،بے جی،بہتے پانی میں عکس۔

ان افسانوں کے حوالے سے انتظار حسین کی رائے یہ ہے:''منیر احمد شیخ کے افسانے ایسے افسانے ہیں،جو خودنوشت کی منزل سے نکل کر افسانے کے منطقے میں داخل ہو رہے ہیں''۔(فلیپ) اور محمد خالد اختر کا خیال یہ ہے:

''منیر احمد شیخ ہمارے صحیح الخیال اور ضابطے کے پابند افسانہ نگاروں کے گروہ سے ہٹ کر کھڑا ہے....

اس کی اپنی ایک الگ رنگین عینک ہے۔اپنی آواز ہے۔اپنا انفرادی جھنڈا ہے''۔ (فلیپ)

منیر احمد شیخ،''قصے تیرے،فسانے تیرے''،صفحات:۳۹۲،زیرنظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

''قصے تیرے،فسانے تیرے''۔منیر احمد شیخ کے دو افسانوی مجموعوں:''بہتے پانی میں عکس''اور''لمحے کی بات''پر مشتمل ہے۔مجموعہ ''بہتے پانی میں عکس''۱۹۸۶ء میں سنگ میل لاہور سے شائع ہوا تھا(اس کے اندراجات کے لیے رجوع کیجئے:منیر احمد شیخ،بہتے پانی میں عکس)

مجموعہ''لمحے کی بات'' پہلی بار اگست ۱۹۷۰ء میں اظہار سنز،لاہور سے شائع ہوا تھا۔زیرنظر کتاب:''قصے تیرے،فسانے تیرے'' میں مجموعہ''لمحے کی بات'' شامل کرتے ہوئے افسانوں کی ترتیب تبدیل کر دی گئی ہے۔اور ایک مضمون:''منیر احمد۔صورت سے سیرت تک''از عطاالحق قاسمی شامل کر لیا گیا۔مجموعہ''لمحے کی بات''کے افسانوں کی ترتیب زیرنظر کتاب میں یوں ہے:

تیسرا روپ،ون اصغر مال، لمحے کی بات،قیمتی آدمی،سرگیان،روسیاہ،پی بی ایل،مٹی میں پاؤں،پرانی بستی،نئی دیوار،سلاماعلیکم، شہر ناپرساں،وادی میں شام،بابوبس،فسانہ کہیں جسے۔

''لمحے کی بات'' کا دیباچہ منیر احمد شیخ نے''سیاہ حرف کا فسانہ'' کے عنوان سے لکھا ہے اور اپنے افسانوں کو اپنے ہی شب و روز اور اپنے ہی کرب کا اظہار قرار دیا ہے۔(ص۲۰۹،۲۱۰)

میر امن،''باغ و بہار''،صفحات:۴۷۵،زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

زیرنظر باغ و بہار کا نسخہ ۱۸۵۱ء میں تیسری بار چھپنے والے نسخے کا عکس ہے؛ آخر میں باغ و بہار کے الفاظ کی فرہنگ بہ زبان انگریزی بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا تفصیلی مقدمہ (اصلی کتاب کے عکس کے بعد) شامل ہے جس میں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی، فورٹ ولیم کالج، میرامن، باغ و بہار کے ماخذ اور مقبولیت، باغ و بہار کی کہانی، کردار اور اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ مقدمے کا آخری حصہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ پر ہے جس میں ان کی سوانح، خدمات اور انگریزی شاعری کی خصوصیات (مع نمونہ کلام) درج ہیں۔

باغ و بہار اردو ادب کا کلاسیک ہے اس کا پرانا عکس پوری صحت سے چھپنے کا واقعہ اہمیت رکھتا ہے اور باغ و بہار کے حوالے سے کئی تنازعات کی حقیقت سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس عکسی ایڈیشن کے علاوہ سنگ میل نے نئی املا اور مشینی کتابت کے ساتھ بھی میرامن کی باغ و بہار کے کئی ایڈیشنز شائع کیے ہیں (مثلاً: باغ و بہار، صفحات: ۱۵۲، ایڈیشن: ۲۰۰۰ء)

میرزا ادیب، ''صحرانورد کے رومان''، صفحات: ۲۵۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۱ء

''صحرانورد کے رومان''۔ میرزا ادیب کے داستانی انداز میں لکھے گئے افسانے ہیں جنہیں کسی زمانے میں خاصی مقبولیت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ایک صحرانورد کے نام سے ایک کردار خط لکھتا ہے اور اپنی داستان سناتا ہے؛ ان خطوں/ داستانوں میں تخیل کی کارفرمائی بھی ہے اور زندگی کے عالمگیر حقائق اور مصائب بھی ہیں۔ اس مجموعے کے ''رومان'' درج ذیل عنوانات کے تحت ہیں:

دیوی، طوفان حوادث، مقدس درخت، تباہی کے بعد، جزیرہ ہارموین۔

نذیر احمد، ڈپٹی، ''مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد''، صفحات: ۱۱۷۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد''۔ نذیر احمد کے چھ ناولوں کا مجموعہ ہے؛ (سوائے ناول ''ایامی'' کے باقی ناول مجموعے میں شامل ہیں) اس ضخیم مجموعے میں ناولوں کی ترتیب یوں رکھی گئی ہے:

ابن الوقت، توبتہ النصوح، بنات النعش، فسانہ مبتلا، مراۃ العروس، رویائے صادقہ۔

مجموعے کا مقدمہ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے؛ مقدمے کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کے دو مضامین: ''نذیر احمد کے تخلیقی مقاصد'' اور ''نذیر احمد کا ایک نمائندہ ناول: ابن الوقت'' بھی شاملِ مجموعہ ہیں (یہ گویا مقدمے کی توسیعی صورتیں ہیں، موخر الذکر مضمون: مجموعے کے پہلے ناول ''ابن الوقت'' کا تفصیلی پیش لفظ محسوس ہوتا ہے)

مجموعے میں ناول: فسانہ مبتلا، مراۃ العروس اور رویائے صادقہ کے آغاز میں ڈپٹی نذیر احمد کے لکھے ہوئے دیباچے بھی موجود ہیں۔
ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کا تجزیہ یہ ہے۔

> ''نذیر احمد اپنے عہد کی پیداوار تھے اس لیے ان کی شخصیت بھی ان تمام تضادات کا مجموعہ ہے جو
> اس دور سے مخصوص تھے اور یہی عصری تضادات ان کے ناولوں میں بھی جھلک مارتے ہیں یوں
> دیکھیں تو نذیر احمد صحیح معنوں میں روح عصر کے ترجمان اور ماحول کے موقع نگار تھے

(کذا: وقائع نگار تھے) اور یہ کوئی کم اہم خصوصیت نہیں ہے''۔ (ص۱۳،۱۴)

نیلم احمد بشیر، ''جگنوؤں کے قافلے''، صفحات:۲۱۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''جگنوؤں کے قافلے''۔ نیلم احمد بشیر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ''گلابوں والی گلی'' تھا۔

احمد ندیم قاسمی ان کے افسانوں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

''نیلم احمد بشیر جدید اردو افسانے کا ایک ایسا جوہر قابل ہے جس نے اپنے افسانوں کے پہلے ہی مجموعے سے بلندی کی طرف اپنے ادبی سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ دوسرا مجموعہ اس امر کا شاہد ہے کہ وہ یہ سفر نہایت برق رفتاری سے طے کر رہی ہے۔ افسانے کے فن پر نیلم کی سی مضبوط گرفت کم ہی افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتی ہے''۔ (فلیپ)

مجموعے میں شامل افسانوں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

ماں، کاغذ کے پرزے، کیکٹس کا پھول، اپنی اپنی مجبوری، جڑیں، شریف، تھوڑی سی تنہائی، نئی دستک، تھوڑی کھلی تھوڑی بند آنکھیں، لالی کی بیٹی، چارہ گر، صدقہ، مردوں والا کام۔

نیلم احمد بشیر، ''گلابوں والی گلی''، صفحات:۲۲۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

''گلابوں والی گلی''۔ نیلم احمد بشیر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ پہلے مجموعے سے ہی نیلم احمد بشیر نے اپنے آپ کو ایک حقیقت پسند اور سلیقہ مند افسانہ نگار کے طور پر منوا لیا تھا۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل منو بھائی کا دیباچہ ''منٹو کی چٹھی''، فتح محمد ملک کا مضمون ''نئے جنم کی بشارت'' اور ممتاز مفتی کا خاکہ ''گوریلی''، نیلم احمد بشیر کے فن و شخصیت کو بڑی خوبی سے منکشف کر رہے ہیں۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''نیلم احمد بشیر ایک فطری افسانہ نگار ہے۔ اس کے موضوعات متنوع ہیں اور اسلوب دلچسپ ہے.... نیلم احمد بشیر کی فنی گرفت اور نفسیاتی ژرف نگاہی ہر جگہ اپنا جادو جگائے رکھتی ہے اور کہانی اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ پڑھنے والے کو بہائے چلی جاتی ہے''۔ (ص۲۱۶)

مجموعے میں شامل افسانے یہ ہیں:

اجازت، میں اور میرا ساتھی، محافظ، پانی کا قطرہ، عام لڑکی، ایسی، عارضی چاندنی، کمرے، دن چڑھے کا پھول، انجان، اکیلی، انتظارِ بہار، میلی روح، آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا، ہائی وے، سترہ کی مسافر، ادھوری، کسی ماں کے بچے، ٹرک اور ٹریٹ، محبت کی تلاش، سفید بال، گلابوں والی گلی۔

نیلم احمد بشیر نے ''آپس کی بات'' کے عنوان سے اپنے گھرانے اور زمانے کے تناظر میں اپنی ذات اور فن کے زاویے سادہ و

صاف گوئی سے پیش کیے ہیں۔''گلابوں والی گلی''۔کی پہلی اشاعت ۱۹۹۰ء میں جنگ پبلشرز کے زیر اہتمام ہوئی تھی۔ دو افسانوں''انجان''اور''ادھوری''کےعنوان، پہلے ایڈیشن میں بالترتیب''سائیکک''اور''ڈائمنڈرنگ اورادھورامحل''ہیں۔

نیلم احمد بشیر،''لے سانس بھی آہستہ''،صفحات:۱۸۴، زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۹ء

''لے سانس بھی آہستہ''۔نیلم احمد بشیر کے اٹھارہ افسانوں پر مشتمل تیسراافسانوی مجموعہ ہے۔

آغاز میں''گلزار'' کاایک مختصر خط نیلم احمد بشیر کے افسانوں میں موجود ایک نئے طرزِ احساس پر روشنی ڈال رہا ہے:

> ''بہت اچھے لگتے ہیں آپ کے افسانے۔اور بہت ماڈرن Sensibilities لئے ہوئے۔ بہت موضوعات تو ایسے ہیں، جواردوافسانے نے اس سے پہلے چھوئے نہیں، یا حال ہی میں، ملک سے باہر رہنے والے ادیبوں نے ان پر انگلی رکھی ہے۔ اور اس میں آپ کی خاصی Contribution ہے''۔(ص۴)

مجموعے میں شامل افسانے درج ذیل ہیں:

غم ہستی، آرزو کا صحرا، حوازادی، شجر سایہ دار، بھوک، تنہا، چھری، کوتوال کا جرم، کتا، ختم، مدد، فن کی خدمت، زندگی، دیرآئید، گل پھینکے ہیں، جسے پیاچاہے، دائمی محبت، لے سانس بھی آہستہ۔

نیلم احمد بشیر کے موضوعات میں تنوع ہے اورانہوں نے اپنے قلم کو فقط عورت کے مصائب کی تصویر کشی، حقوق نسواں کی جدوجہد اور مردوعورت کے درمیان بڑھتے ہوئے تفاوت تک محدود نہیں رکھا بلکہ زندگی کی گہرائیوں اور وسعتوں میں انسان کے مقدر کو دیکھنے اور تجزیہ کرنے کی سعی کی ہے۔

ہر چرن چاولہ،''ڈھائی اکھر''،صفحات:۲۲۹، زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۶ء

اکیس افسانوں اوراٹھارہ افسانچوں پرمبنی زیرنظر''ڈھائی اکھر'' ہر چرن چاولہ کا پاکستان میں شائع ہونے والا دوسراافسانوی مجموعہ ہے،قبل ازیں مجموعہ''سچ جیسے سپنے'' شائع ہوکر خاص وعام سے دادحاصل کر چکا ہے۔

''ڈھائی اکھر'' کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا اور جدید تنقیدی تھیوری کے وسیلے سے ہر چرن چاولہ کے افسانوں کی باطنی کیفیت دریافت کرنے کی کوشش کی:

> ''ہر چرن چاولہ اپنے ان افسانوں کے عقب میں جاکر''مثالی پلاٹ''اور''مثالی کردار'' کو چھونے کی کوشش میں ہیں۔جس طرح لاتعداد جملوں کی نسبت میں گرائمر بطورایک''سسٹم'' سدا موجود رہتی ہے جس کے قاعدوں اور کلیوں کے مطابق جملے وجود میں آتے ہیں اس طرح تمام

افسانوں کے ''تار و پود'' میں ایک ''مثالی کہانی'' بھی موجود ہوتی ہے جس کی ساخت کے مطابق یہی مختلف قد کاٹھ کی کہانیاں جنم لیتی ہیں..... مثلاً ان کا افسانہ ''ققنس'' دیکھئے جس میں واحد متکلم اپنے ان جینرک (Generic) ناموں کو نشان زد کرتا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ ایک ہی کردار، شخص یا نام ہر زمانے میں بطور اوتار جنم لیتا ہے۔ یہی انداز ''تیری کہانی'' کا ہے جس میں مثالی کہانی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دیگر افسانوں میں بھی افسانہ نگار عام کرداروں اور پلاٹوں کے اعماق میں جھانکتا دکھائی دیتا ہے تاکہ اصلی ساخت یا ماڈل کو چھو سکے''۔ (ص ۹، ۱۰)

زیرنظر مجموعے کے چند افسانوں کے عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

آب و ہوا، پہلا آدمی، ققنس، تیری کہانی، دریا اور کنارے، گریبان جھوٹ بولتا ہے، ڈھائی اکھر، بیوی یا بیماری، ٹھرکی۔

مجموعے میں شامل افسانچے بھی دلاویز اور معنی خیز ہیں۔

ہرچرن چاولہ، ''سچ جیسے سپنے''، صفحات: ۲۸۰، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

''سچ جیسے سپنے'' ہرچرن چاولہ کے افسانوں کا مجموعہ ہے؛ ان کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''ہرچرن چاولہ ناروے میں مقیم ہندوستانی ادیب ہیں ان کا محبوب موضوع مغرب میں آ کر بسنے والے مہاجروں کی داستانیں ہے.... ان کی کہانیوں میں ماضی سے جڑنے کا ارمان بھی ہے اور ترقی یافتہ سماج کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی خواہش بھی''۔ (فلیپ)

مجموعے میں شامل چند افسانوں کے عنوانات: چاچی گلابی، آخری قدم سے پہلے، دل کی آخری حد، داشتہ، پانی کی عورت، آتے جاتے موسموں کا سچ، میری بیوی کا خاوند، سچ جیسے سپنے۔

ہرچرن چاولہ نے اردو افسانے کو ایک مختلف ذائقہ اور تناظر عطا کیا ہے۔

ڈراما

ابصار عبدالعلی، ''کیسے کیسے لوگ''، صفحات،۳۴۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۷۹ء

''کیسے کیسے لوگ'' اُردو (بلکہ پاکستان کی کسی زبان) میں شائع ہونے والا ٹیلی ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ گو اس سے پہلے بھی ابصار عبدالعلی کے ڈراموں کا مجموعہ ''شہ رگ'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس میں ٹیلی ویژن ڈراموں کے ساتھ ریڈیو ڈرامے بھی شامل تھے۔

''کیسے کیسے لوگ'' کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

> ''ان ڈراموں کا موضوع تاریخ کی وہ درخشندہ شخصیات ہیں جن کی ذہنی کاوشوں، عملی تجسس اور افکار و تصورات نے عالمی تہذیب کی اساس مہیا کی۔ یہ ابصار عبدالعلی کے قلم کا اعجاز ہے جس نے تمثیلی حکمت عملی اور برجستہ مکالمات سے ان کی شخصیت یوں اُجاگر کی کہ اُن کا عہد زندہ ہو جاتا ہے'' (فلیپ)

اس مجموعے میں شامل ڈرامے پاکستان کے تمام ٹی وی سنٹرز سے ''سنگِ میل'' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں نشر ہونا شروع ہوئے؛ یہ سیریز گزشتہ ڈھائی ہزار سال کی اہم علمی اور تاریخی شخصیات کو مرکزی کردار بنا کر لکھی گئی اور:

> ''ان میں اُبھرنے والے ہر کردار کو اس کا اپنا لہجہ فراہم کیا گیا ہے۔ لہجہ ہی نہیں اُسے اس کے خاص مزاج کے مطابق الفاظ کی ایک الگ فرہنگ بھی مہیا کی گئی ہے''۔ (دوسرے ایڈیشن (۱۹۷۹ء) کے پس سرورق پر ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے)۔

اس ڈراما سیریز میں مرکزی کردار بننے والی شخصیات کے نام ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

اقلیدس، عبدالرحمٰن الداخل، رازی، زہراوی، ابن الہیثم، البیرونی، بوعلی سینا، عمر خیام، محمد ثانی، خیرالدین باربروسہ، حافظ رحمت خان روہیلہ، ٹائکو براھے، گلیلیو، مائیکل فیراڈے، فلورنس نائٹ انگیل، انریکو فرمی، جوناز ساک۔

ابصار عبدالعلی، ''شہ رگ''، صفحات:۲۵۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۸ء

''شہ رگ'' پانچ بصری اور چار صوتی تمثیلوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ بصری تمثیلیں (ٹیلی ویژن ڈرامے) یہ ہیں: قفس، چھلانگ، مدمقابل (مدمقابل کا پس منظر مغلیہ تاریخ ہے)، کباڑ، اعتراف، صوتی تمثیلیں (ریڈیو ڈرامے) یہ ہیں۔ آبِ حیات اور موت، مائی، چلتی پھرتی چھاؤں، شہ رگ۔ انتظار حسین، ابصار عبدالعلی کے ڈراموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہمارا عہد اپنے آشوب اور اپنے نئے امکانات کے ساتھ ابصار عبدالعلی کے ڈراموں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے قومی احساس کا پرتو بھی جا بجا پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے المیہ نے جس طرح ان کے ہاں ڈرامے کی صورت پکڑی ہے، وہ ان کے اس وصف کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے''۔ (دیباچہ: دو لفظ، ص۵،۶)

اشفاق احمد، ''اور ڈرامے''، صفحات:۱۱۵۱، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

اشفاق احمد کی مشہور اور متنازع ٹیلی ویژن ڈراما سیریز ''اور ڈرامے'' کا کتابی روپ سنگ میل نے گیارہ سو اکیاون صفحات پر پیش کیا تو ان ڈراموں پر اہل نقد کو ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ملا اور یوں صرف ''دیکھ'' کر جو گرد اُڑائی گئی تھی، وہ قدرے بیٹھ گئی۔ اشفاق احمد اس مجموعے کے آخر میں ''آخری بات'' کے عنوان سے ان ڈراموں کے مقصد تخلیق اور ڈرامے کے حوالے سے اپنی بدلتی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں:

> ''میں نے چند نئے ڈرامے لکھ کر انھیں ''اور ڈرامے'' کا نام دیا اور ایک نئے سلسلے کی بنیاد ڈالی ''اور'' سے میری مُراد ''مزید'' نہ تھی بلکہ طرز نو سے تھی۔ ان ڈراموں میں کچھ اور ہی بات کا ڈول ڈالا گیا ہے اور طے شدہ جانی پہچانی روش سے ہٹ کر بات کی گئی ہے''۔(۱۱۴۸)

اشفاق احمد کے اور ڈرامے ان کی ڈراما سیریز ایک محبت سو افسانے سے مختلف تھی؛ اِن ڈراموں میں اشفاق نے موضوعات اور ڈرامے کی بنت کے حوالے سے ایک جہان دیگر میں قدم رکھا۔ ان میں ماڈرن اور پڑھی لکھی شہری زندگی کے فکر و عمل میں کھوکھلے پن کو بطور خاص نمایاں کرنے اور صوفیانہ فکر و مزاج کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں دو ایسے ڈرامے (''آوارہ اور آواری''۔ ''مسئلہ اور مسائل'') بھی شامل ہیں جو حکومتی پالیسی کے باعث ٹیلی کاسٹ نہ ہو سکے۔ اس مجموعے میں کل پچیس ڈرامے شامل ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں سنگ میل نے ہی شائع کیا تھا۔

اشفاق احمد، ''ایک محبت سو ڈرامے''، صفحات:۷۹۰، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۸ء

یہ کتاب پاکستان ٹیلی ویژن کی مقبول زمانہ ڈراما سیریز ''ایک محبت سو افسانے'' کے ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ''ایک محبت سو افسانے'' کے تمام ڈراموں کو ٹیلی ویژن ڈرامے کی دنیا میں کلاسیک کی حیثیت دی جاتی ہے۔ ان کا مرکزی اور بنیادی موضوع محبت ہے جو ہمہ وقت اپنے ان گنت روپ سامنے لانے کی تخلیقی قوت رکھتی ہے۔ اشفاق احمد محبت کی تخلیقی و روحانی قوت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور بڑی اعلیٰ بنت اور نفیس اسلوب کے ساتھ (ٹی وی ڈرامے کی محدودات اور حکومتی پالیسی کی جکڑ بندی کے باوجود) پیش کر دیتے ہیں۔ خوبصورت مکالوں اور فکری زاویوں کے باعث اشفاق احمد کے ڈرامے فقط دیکھنے کی چیز نہیں بلکہ پڑھنے والی شے بھی ہیں اس سیریز (اور کتاب) کا پہلا ڈرامہ ''قرۃ العین'' ہے جو بلاشبہ ناظرین کی اجتماعی یادداشت پر مرتسم ہے۔ اس کے علاوہ دادا اور دلدادہ، آغوش وداع، ثمن گوٹھ جو ڈرائیور، اجرا سودا اور لبیک لبیک اردو ڈرامے کے روشن ترین حوالے ہیں۔ زیرِنظر مجموعے میں بائیس ڈرامے شامل ہیں۔

اشفاق احمد، ''بند گلی''، صفحات:۵۳۲، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

ٹیلی ویژن ڈراما سیریز ''بند گلی'' میں سات مختلف ڈرامے پیش ہوئے۔جس میں ڈراما ''ماماسیمی'' چار اقساط پر ''گرین کارڈ'' اور ''ہے گھات میں نگاہ ستمگر لگی ہوئی'' دو دو اقساط پر مشتمل تھے۔اس کی علاوہ دو دھاری تلوار، ناتے دار، ڈمی سٹی، یزمان کا موچی بھی شامل تھے۔اس ڈراما سیریز کا سب سے مشہور اور مقبول ڈراما گرین کارڈ تھا جو بنیادی طور ایک طنزیہ کا درجہ رکھتا تھا،اس میں ہمارے معاشرے میں امریکہ کے گرین کارڈ کیلئے پائے جانے والی تڑپ اور دیوانگی کو موضوع بنایا گیا تھا،ساتھ ہی ہماری ان بیچارگیوں کو ہمدردانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے جن کے باعث ہی ہمارے خوابوں اور خواہشوں کی تعبیر و تکمیل گرین کارڈ سے جڑ گئی ہے۔''یزمان کا موچی'' مشہور بھی ہوا اور محفلوں میں موضوع بحث بھی بنا،اس میں ہمارے معاشرے کے اس جبر اور تکبر کو موضوع بنایا گیا ہے جو پڑھے لکھوں نے ان پڑھوں کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے۔(کتاب میں فہرست موجود نہیں ہے۔)

اشفاق احمد،''توتا کہانی''،صفحات:۴۹۶،زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۳ء

ٹیلی ویژن ڈراموں کا یہ مجموعہ ۱۹۸۳ء میں سنگ میل نے پہلی بار شائع کیا۔''توتا کہانی''، ڈراما سیریز، لاہور سنٹر سے پیش ہوئی اور مجموعی طور پر ناظرین میں پسند کی گئی۔اسے ساحرہ کاظمی نے پیش کیا اور اس کی پہلی کہانی کی پیش کش پر انہیں بطور پروڈیوسر پی ٹی وی ایوارڈ ملا۔

اشفاق احمد کی اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس پر انہیں باقاعدہ دیباچہ لکھنے اور اپنے فکر و فن کی صراحت اور دفاع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔''توتا کہانی'' کے ڈراموں کا موضوع اور درس ''معافی'' ہے۔نافرمان بیٹے، ظالم جاگیردار حتیٰ کہ اپنے نفس امارہ تک کو معافی دینے کا حوصلہ اور دانش پیدا کرنا توتا کہانی کا مقصد سعید ہے۔''توتا کہانی'' میں کل تیرہ ڈرامے ہیں جن کے عنوانات قائم کرنے کے بجائے ہر ڈرامے کو فقط ''کہانی'' کہا گیا ہے۔

اشفاق احمد،''حیرت کدہ''،صفحات:۳۱۹،زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''حیرت کدہ'' اشفاق احمد کی پرانی لیکن مقبول عام ڈراما سیریز تھی۔اس میں اشفاق احمد نے حیرت ناک اور مابعد الطبیعاتی عناصر کو ملا کر ڈراموں کا تانا بانا بنا تھا۔ان ڈراموں میں بز غالہ اور بچہ زاغ، پیغام زبانی اور ہے، ایسی بلندی ایسی پستی، آدم زاد خاصے مشہور ہوئے۔حیرت کدہ کے ڈرامے نئے دور میں بھی نشر ہوئے اور پسند کیے گئے۔خصوصاً ''آدم زاد'' دو مختلف ٹی وی سٹیشنوں سے نئے سرے سے ریکارڈ اور ٹیلی کاسٹ ہوا۔''حیرت کدہ'' میں شامل تیرہ ڈرامے دیکھنے میں ہی نہیں بلکہ پڑھنے میں بھی دلآویز ہیں۔

اشفاق احمد،''شاہلا کوٹ''،صفحات:۲۸۸،زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''شاہلا کوٹ'' تیرہ اقساط پر مبنی ڈراما سیریل ہے۔''شاہلا کوٹ'' ایک گاؤں کا نام ہے اور اسے ہی ڈرامے کا مرکزی کردار کہا جا

سکتا ہے۔ڈراما بنیادی طور پر سکول کے ایک استاد ماسٹر موسی اور اس کے بیٹے مسعود سعد سلمان کے گرد گھومتا ہے اور ''شاہلا کوٹ'' کی سادگی، خوبی، خوبصورت اور کوتاہی کو مجسم کر کے سامنے لے آتا ہے۔

اس ڈرامے کا اساسی موضوع ''معافی''ہی ہے جو اشفاق احمد کے کئی ڈراموں میں کہیں خفی، کہیں جلی درس کی صورت موجود ہے ؛درس کی کیفیت کے باوجود اشفاق احمد کے ڈراموں میں فن کے تقاضے مجروح نہیں ہوتے۔

اشفاق احمد،''من چلے کا سودا''،صفحات:۳۱۹،زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''من چلے کا سودا'' پاکستان ٹیلی ویژن کا تیرہ قسطوں پر مبنی ڈراما سیریل تھا جو کئی حوالوں سے مقبول اور متعدد زاویوں سے متنازع رہا۔اس ڈراما سیریل کو پہلی بار القمر انٹر پرائزز لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا تو اہلِ نظر قارئین و ناقدین نے اس پر مکرر غور کیا اور اس کی فکری و فنی خوبیوں کو باندازِ دگر دریافت بھی کیا۔زیرِنظر مجموعے کا دیباچہ اشفاق احمد نے ''بنجارے کی ہانک'' کے عنوان سے لکھا۔اشفاق احمد ''من چلے کا سودا'' کے حوالے سے بتاتے ہیں:

> ''اس ڈرامہ سیریل کے وجود میں آنے کا تعلق ان دو مثبت اور منفی تاروں سے بندھا ہے جن میں سے ایک کا سرچشمہ تصوف اور عرفان ہے اور دوسرے کا منبع سائنس،.... صوفی اور سائنس دان، دونوں اُوک لگا کر کسی کی چھاگل کا پانی نہیں پیتے، اپنا چشمہ دریافت کر کے اس سوتے سے اپنے تجسس کی پیاس بجھاتے ہیں''۔ (ص ۵،۶)

''من چلے کا سودا'' میں مرکزی کردار ارشاد اپنی مالی آسودگی، تعلیم، سماجی مرتبے کے باوجود مضطرب رہتا ہے اور روحانی بالیدگی کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے؛ ڈرامے میں صوفیا کے خیالات کے مطابق اس دُنیا کے انتظام کے متوازی ایک اور نظم اور اہتمام دکھایا جاتا ہے جو نیک اور اللہ کا قرب رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہے؛''ارشاد'' سلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ ''صاحبِ ارشاد'' ہو جاتا ہے۔ڈرامے کے مکالمے خوبصورت اور خیال انگیز ہیں؛ ڈرامائی تکنیک کی پاسداری عموماً کی گئی ہے۔

اشفاق احمد،''مہمانسرائے''،صفحات:۲۱۵،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

''مہمانسرائے'' اپنے زمانے کی مشہور ٹی وی سیریل ''کارواں سرائے'' کا کتابی روپ ہے۔اس ڈراما سیریل کا مرکزی مقام ایک ہوٹل ''کارواں سرائے'' ہے جہاں آنے جانے والوں سے نئی کہانیاں پھوٹتی ہیں اور کارواں سرائے کو رنگا رنگ کر دیتی ہیں۔مہمانسرائے (یا کارواں سرائے) اُس زمانے کی سیریل ہے جب اشفاق احمد ناظرین کو فقط کہانیاں سناتے تھے اور اپنے ڈرامے میں اپنے فکری زاویے شامل نہیں کرتے تھے لیکن اس ڈراما سیریل میں بھی ''کارواں سرائے'' کے مالک آغا ذوالقرنین کا کردار خصوصاً ڈرامے کے آخر میں اپنے آپ کو جس طرح منکشف کرتا ہے اور معاشرے کو ہدفِ تنقید بناتا ہے، اس سے آنے والے دور کے اشفاق احمد کی ایک ہلکی

سی تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے۔

اشفاق احمد، ''ننگے پاؤں''،صفحات:۲۶۴،زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۵ء

''ننگے پاؤں'' ۔اشفاق احمد کے سولہ ٹیلی ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں شامل کئی ڈراموں کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ ڈرامے اشفاق احمد کے فکر وفن کے نئے سنگِ میل کہلائے۔مجموعے میں ڈراموں کی ترتیب اس طرح ہے:

چور بخار، ننگے پاؤں، متاعِ غرور، آسان سی بات، فہمیدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی، طلسم ہوش ربا (جو ٹیلی کاسٹ نہ ہوسکا) ، برگ آرزو، گوشہ نشین، تلاش وجود، گھاس، ڈھور ڈنگر، ٹوٹکا، پھول والوں کی سیر (پہلا رنگین کھیل)، تقریب امتحان، کوئی نہ ادا سنج ملا، نور باف (ٹیلی ویژن کی پہلی فیچر فلم)۔

ان ڈراموں میں چور بخار، ننگے پاؤں، فہمیدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی نے بے حد مقبولیت پائی اور کئی بار نشر ہوئے۔''چور بخار'' بلاشبہ ایک شاہکار ہے۔''ننگے پاؤں'' ۔''ڈراما انارکلی'' کی پیروڈی ہے؛اس میں مغلِ اعظم کو دو عالمی طاقتوں کے سامنے مجبور، بے بس اور پسپا ہوتے دکھایا ہے؛یوں بین الاقوامی جبریت پر گہری طنز کر کے خود مختاری کے تصور اور جذبے کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔''کوئی نہ ادا سنج ملا'' میرزا غالب کے حوالے سے ہے اور اس میں غالب کے مقام ومرتبے، مصائب اور ناقدری کو موضوع بنا کر المیہ تاثر اُبھارا گیا ہے۔مجموعہ''ننگے پاؤں'' پہلی بار فیروز سنز لاہور کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔

اصغر ندیم سید، ''چاند گرہن''،صفحات:۴۲۴،زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

اصغر ندیم سید نے یہ ٹیلی ڈراما سیریل''این ٹی ایم'' کے لیے لکھی اور اس نے این ٹی ایم کی پہلی اور مقبول ترین سیریل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔چاند گرہن کا پس منظر پاکستان کے جاگیردارانہ ماحول کے مسائل اور رویے ہیں؛ پیش پا اُفتادہ موضوع (اور پس منظر) کے باوجود کہانی، کردار اور مکالموں کے تیکھے پن نے اسے مقبولیت سے نوازا ہے۔اصغر ندیم سید نے اپنے مختصر دیباچے (پس پردہ چند باتیں) میں پاکستانی ٹیلی ویژن ڈرامے کی بین الاقوامی شہرت پر فخر کا اظہار کیا ہے۔''چاند گرہن'' چودہ اقساط پر مبنی ڈراما سیریل ہے۔

اصغر ندیم سید، ''دریا''،صفحات:۲۰۶،زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''دریا'' اصغر ندیم سید کے اولین ڈراما سیریلز میں سب سے نمایاں ہے۔یہ صحرائے چولستان کے پس منظر میں لکھا گیا اور چولستان میں ہی فلمایا گیا۔اصغر ندیم سید دریا کی مقبولیت اور شہرت کے حوالے سے اپنے تمہیدی کلمات میں کہتے ہیں:

> ''دریا'' نے کئی حوالوں سے ملکی اور بین الاقوامی پریس میں بے پناہ جگہ حاصل کی۔ایک تو اس کا موضوع بے حد نازک معاملے سے متعلق تھا۔ایک نکاح کے اوپر دوسرا نکاح کیسے

مسائل کو جنم دیتا ہے۔ اسے کئی سطحوں پر بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا دوفن کار جو حقیقی زندگی میں میاں بیوی ہیں۔ ڈرامے میں طلاق کے ایک منظر میں آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ جس سے پوری اسلامی دُنیا میں فتوؤں اور اس کی رد میں فتوؤں کا سلسلہ چل نکلا''۔ (ص ۷)

اصغر ندیم سید، ٹیلی ڈرامے کی دنیا میں مختلف موضوعات اور متنوع ثقافتی احساسات کے ساتھ داخل ہوئے اور کچھ ہی عرصے میں پاکستان اور پاکستان سے باہر ناظرین کے وسیع حلقے کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

امتیاز علی تاج،''انارکلی''،صفحات:۱۵۲،زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

''انارکلی''، امتیاز علی تاج کا لافانی شاہکار ہے اور اردو ڈرامے کا اہم ترین سنگ میل۔ دیباچے میں تاج کہتے ہیں:

''میں نے انارکلی ۱۹۲۲ء میں لکھا تھا۔ اس کی موجودہ صورت میں تھیٹر ون نے اسے قبول نہ کیا۔ جو مشورے ترمیم کیلئے انہوں نے پیش کیے انہیں قبول کرنا مجھے گوارا نہ ہوا''۔

انارکلی کی اولین اشاعتوں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد سلیم ملک کی تحقیق یہ ہے:

''انارکلی پہلی بار اس طرح چھپی کہ ماہ نامہ ''نیرنگ خیال'' کے تین برسوں کے چار شماروں میں، اس کے پانچ منظر شائع ہوئے؛ جو جولائی ۱۹۲۶ء سے مارچ ۱۹۳۰ء کے عرصے کو محیط ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' کی اس اشاعت کو انارکلی کا پہلا متن قرار دے سکتے ہیں؛ بعد ازاں ۱۹۳۲ء میں انارکلی، کتابی صورت میں شائع ہوئی، تو تاج نے اس میں کئی تبدیلیاں کیں،.... انارکلی،۱۹۳۴ء میں دوسری بار شائع ہوئی''۔ (محمد سلیم ملک، ڈاکٹر، سید امتیاز علی تاج، زندگی اور فن، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء ص:۱۵۳، ۱۵۷)۔

امتیاز علی تاج،''قرطبہ کا قاضی''،صفحات:۲۱۶،زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

اس مجموعے میں پانچ یک بابی ڈرامے اور گورنمنٹ کالج ڈریمیٹک کلب کے عنوان سے امتیاز علی تاج کی یادداشتوں پر مبنی ایک مضمون شامل ہے۔ امتیاز علی تاج اپنے دیباچہ میں بتاتے ہیں:

''ان پانچوں کھیلوں میں سے ایک بھی میرا طبع زاد نہیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ ترجمے کے ساتھ میں نے تصرف سے بھی کام لیا ہے۔ اسی لیے ان کھیلوں میں مغربی اجنبیت باقی نہیں رہی''۔
(ص ۷، تاریخ تحریر: ۱۰ جون، ۱۹۵۶ء)

درج ذیل ڈراموں کو ترجمہ و تصرف کے عمل سے گزار کر مجموعے میں شامل کیا گیا ہے:

''قرطبہ کا قاضی'' (ایک المیہ) از لارنس ہاؤس مین، ''خوشی'' (ایک طربیہ) از پیٹر ڈیبر ''دندان ساز کی کرسی میں'' (ایک سنسنی پیدا کرنے والا کھیل) از انتھونی آرمسٹرنگ ''بوکس اور کوکس'' (ایک نقل) از جے۔ایم۔لورٹن۔''صید وصیاد'' (ایک رومانوی کھیل) از ہنری اے ہیئر نگ۔

ان ڈراموں میں سے ''قرطبہ کا قاضی'' کو بے حد شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی۔

''گورنمنٹ کالج ڈریمیٹک کلب'' کو موضوع بنا کر امتیاز علی تاج نے اس زمانے کی شخصیات، کارناموں اور یادوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے(اس مضمون پر تاریخ تحریر: اپریل ۱۹۵۴ء ہے)

آخر میں ایک ایکٹ کا ایک فرحیہ ''سازش'' کے عنوان سے ہے جس کا فہرست میں اندراج نہیں ہے۔

امجد اسلام امجد، ''اپنے لوگ'' (طویل ڈرامے)، صفحات:۴۲۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

زیر نظر مجموعے میں چھ طویل ڈرامے: باز دید، دُکھوں کی چادر، اپنے لوگ، لیکن، دُھند کے اس پار، شام سے پہلے، شامل ہیں۔
ان ڈراموں میں ''دکھوں کی چادر'' کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی اور یہ ڈراما متعدد بار ٹیلی کاسٹ ہوا۔اس ڈرامے کو ایک حقیقی واقعے (سانحہ نواب پور) کے پس منظر میں لکھا گیا تھا لیکن امجد اسلام امجد اپنے تمہیدی کلمات میں کہتے ہیں۔''میری ذاتی رائے میں ڈراما ''اپنے لوگ'' مجموعی اعتبار سے ''دکھوں کی چادر'' سے بہتر کھیل ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام بھی اسی کھیل پر رکھا ہے''۔(ص ۵)

امجد اسلام امجد اردو ٹیلی ڈرامے کا اہم حوالہ ہیں خصوصاً جاگیردارانہ پس منظر میں پر تجسس ڈرامے تخلیق کرنا انہیں ہمیشہ مرغوب رہا ہے۔

امجد اسلام امجد، ''وقت''، صفحات: ۳۵۷، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

''وقت'' پاکستان ٹیلی ویژن سے بطور ڈراما سیریل نشر ہوا تھا؛ اور اسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔''وقت'' کا موضوع: امجد اسلام امجد کے اکثر ڈراموں کی طرح جاگیردارانہ سماج کے مسائل، مصائب اور رویے ہیں۔ڈرامے کے آغاز میں البتہ یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ ''وقت'' پاکستانی جیلوں کی صورتحال اور قیدیوں کی ناگفتہ بہ حالت کو اپنا مرکزی موضوع بنائے گا لیکن ڈرامے کی کہانی جیل سے نکل کر جاگیردار کے جبر کے احاطے میں چلی جاتی ہے اور اس احاطے میں جو ظلم، سازش اور استحصال دیکھتی اور دکھاتی ہے اس کے مقابلے میں سرکاری جیلوں کی صورتحال کم تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔

امجد اسلام امجد نے ''وقت'' کی ہر قسط کو دلچسپ، قابل توجہ اور پر تجسس بنانے کیلئے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

انور سجاد، ''نگار خانہ''، صفحات: ۴۳۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''نگار خانہ'' کے فلیپ پر قارئین کیلئے اچھی خبر یہ ہے کہ ''ہیں تو یہ بنیادی طور پر ٹیلی ویژن ڈرامے ہی، لیکن قارئین کیلئے انہیں

دوبارہ تحریر کیا گیا ہے تاکہ انہیں روانی میں پڑھا جا سکے، کہانی کا لطف اور ڈرامے کا مزہ بھی۔ یہ انداز کوئی اتنا نیا نہیں۔ ہماری روایت میں یہ انداز پہلے سے موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ٹیلی کہانیاں سکرین پلے سے زیادہ قریب ہیں''۔ ٹیلی ویژن سکرپٹ کو کتابی صورت دیتے ہوئے ڈراما نگار نے انہیں دوبارہ لکھنے کی جو زحمت کی اس سے پڑھنے والوں کا واقعی بھلا ہوا اور ڈراموں کی قرأت میں روانی اور آسانی آ گئی، کاش! دیگر ڈراما نگار بھی اس زحمت سے گزرتے تو اپنے قارئین کو قرأتی دقتوں سے بچا لیتے۔

''نگار خانہ'' میں ''وقت اے وقت''، ''چمکی''، ''آسیب''، ''ث۔ثمر''، ''ہار''، ''مہرو یا جیناں''، ''سراب پرست''، ''روما'' کل آٹھ ڈرامے شامل ہیں، جن میں سے کچھ کی کہانی اور کچھ کردار اب تک ٹیلی ویژن ناظرین کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ انور سجاد ہر ڈرامے کے آغاز میں ڈراما ٹیلی کاسٹ ہونے کی تاریخ بھی ضرور درج کرتے ہیں، اس طریقے کی پاسداری بھی دیگر ڈراما نگاروں کے ہاں ہونی چاہیے تھی۔

انور سجاد''صبا اور سمندر''، صفحات:۵۱۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

اس مجموعے میں ''رات کا پچھلا پہر''، ''پکنک''، ''کوئل''، ''صبا اور سمندر''، ''بینا کی دنیا''، ''یہ زمین میری ہے''، ''روشن روشنی''، ''جنم دن''، اور ''گمنام'' کے عنوان سے کل نو ڈرامے شامل ہیں۔

انور سجاد، افسانے اور ناول کی دنیا میں فکر، اسلوب اور کہانی کی پیش کش کے حوالے سے انفرادیت رکھتے ہیں۔ ڈرامے کے میدان میں انور سجاد نے اپنی انفرادیت خاصی حد تک برقرار رکھنے کے باوجود ٹی۔وی ڈرامے کے وضاحتی پیٹرن اور حکومتی پالیسی کی حدود کا خیال رکھا ہے؛ جس کے باعث ڈراموں کا انور سجاد، افسانوں اور ناولوں کے انور سجاد سے زیادہ نہ سہی تو کچھ نہ کچھ مختلف ضرور نظر آتا ہے۔

عام طور پر کتابی ڈراموں میں منظر نگاری، ڈراما سکرپٹ کے عام طریقے کے مطابق سرسری اور روکھے پھیکے انداز میں سامنے آتی ہے لیکن زیرِ نظر مجموعے میں منظر کا بیان افسانوی انداز میں ہوا ہے، جس سے (کتابی) ڈراموں میں دلچسپی بڑھی ہے کیونکہ انہیں پڑھے جانے میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔ کتاب کی ایک انفرادیت یہ بھی کہ کتاب کو کسی ایک شخص کے نام معنون کرنے کے بجائے ہر ڈرامے کا انتساب کسی ایک شخصیت کے نام کیا گیا ہے، اس طرح نو ڈراموں کے نو انتساب ہیں۔

انیق احمد''آب ودانہ''، صفحات:۳۵۱، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

انیق احمد کی ڈراما سیریل ''آب ودانہ'' تیرہ قسطوں پر مشتمل تھی، اس کی پذیرائی اس طرح تو نہ ہو سکی جیسے مقبول عام ڈراما سیریلز کی ہوتی رہی ہے لیکن سنجیدہ ناظرین نے اسے پسند کیا، اور انصاف پسند ناقدین نے اسے رد نہیں کیا۔

انیق احمد، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے بیٹے ہیں، ''آب ودانہ'' کتابی صورت میں شائع ہوا تو اس کا فلیپ اشفاق احمد نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا اور قارئین کو اطلاع دی کہ انیق احمد سعادت مند بیٹے ہیں لیکن ڈراما انہوں نے خالص اپنی مرضی اور اپنے نقطہ نظر سے

لکھا ہے، ماں باپ سے مدد اور مشورہ لیا نہ ان کی تقلید کی۔ ''آب و دانہ'' دیکھتے اور پڑھتے ہوئے اشفاق احمد کی یہ رائے خاصی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔لیکن سوچنے کے انداز، قناعت کے درس، صوفیانہ مزاج کے کردار، انیق کے ہاں کچھ نہ کچھ وہی ہیں جو اشفاق اور بانو کے ہاں زیادہ فکری گہرائی اور فنی پختگی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

بانو قدسیہ،''آدھی بات''، صفحات:۸۸ ۷، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

''آدھی بات''، بانو قدسیہ کے سات سٹیج ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ڈراموں کے نام درج ذیل ہیں:

آدھی بات، منزل منزل، اہل کرم، مختار نامہ، ستم گر تیرے لیے، اک تیرے آنے سے، بزدل۔

ان میں سے پانچ ڈرامے ۶۸۔۱۹۶۰ء کے درمیان سٹیج ہوئے جب کہ دو ڈرامے بزدل اور مختار نامہ سٹیج نہ ہو سکے۔

بانو قدسیہ ڈرامے میں واقعات کو بڑے سلیقے سے بنتی ہیں اور کرداروں کو محبت کے ساتھ اُبھرتے اور اپنا تشخص قائم کرنے کا موقع دیتی ہیں۔ڈرامے کے مکالمے حقیقی بات چیت کے قریب ہوتے ہیں اور کرداروں کی نفسی کیفیت سے حدت حاصل کرتے ہیں۔

کتاب کا انتساب ''سید تلقین شاہ'' کے نام ہے۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن، سنگ میل پبلی کیشنز سے ہی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا؛ جس کے فلیپ پر بانو قدسیہ نے اپنے سٹیج ڈراموں کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلی بار ان کا ڈراما ''اہل کرم'' راولپنڈی میں سٹیج ہوا تھا۔

بانو قدسیہ،''پیا نام کا دیا''، صفحات:۳۹۱، زیر نظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''پیا نام کا دیا''، تیرہ اقساط پر مبنی ٹیلی ویژن ڈراما سیریل کا کتابی روپ ہے۔اس ڈرامے کی مرکزی کردار ایک مشہور فلمی گلورہ ''ستارہ'' ہے اور ساری کہانی اس کے مصائب کے گرد گھومتی ہے۔اپنے اس کردار کے متعلق بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> ''ستارہ ٹوٹے ہوئے سیارے کی زندگی بسر کر رہی ہے.... جو گرتا رہتا ہے، ٹوٹتا رہتا ہے لیکن جس میں کوئی ثقل موجود نہیں، کوئی سمت نہیں۔وہ پبلک Glory کا فگر ہے۔جس کی ذاتی زندگی سوائے ٹینشن کے اور کچھ نہیں''۔(ص۴)

بانو قدسیہ کے مطبوعہ ٹیلی ڈراموں میں تیرہ اقساط پر مبنی یہ واحد ڈراما سیریل ہے۔

بانو قدسیہ،''تماثیل''، صفحات:۵۲۰، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

اس کتاب میں ڈراما سیریز تماثیل کے بارہ ڈرامے اور چھ دیگر ڈرامے شامل ہیں۔

تماثیل کے عنوان سے ڈراما سیریز ۱۹۸۱ء میں نشر ہوئی، اس میں قیدِ حیات، شہر کا راستہ، دو سورج، دیمک، فسادی، دشمن جاں، خانہ بدوش، مڈل کلاس، جنگل کی آگ، دلدل، رسم وفا اور ندی ناؤ سنجوگ کے نام سے بارہ ڈرامے دکھائے گئے۔متفرق ڈراموں میں صبح کا

تارا (۱۹۶۷ء) سہارے (۱۹۶۸ء) ادھورا (۱۹۸۲ء) کیا اسے جانتے ہیں (۱۹۸۹ء) انکشاف (۱۹۶۸ء) اور دیار وفا (۱۹۷۱ء) ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ گویا تماثیل کی کتابی صورت میں ہمارے سامنے بانو قدسیہ کے ڈرامے کا ارتقاء ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۸۱ء تک موجود ہے۔اور اپنے خالق کے تخلیقی انہماک کو بڑی خوش دلی سے خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔

بانو قدسیہ، ''حوا کے نام''، صفحات: ۴۱۱، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

''حوا کے نام'' میں شامل کھیل زیادہ تر پاکستان ٹیلی ویژن کی دو ڈراما سیریز ''حوا کے نام'' اور ''نیا دور'' سے لیے گئے ہیں۔ بانو قدسیہ کتاب کے پہلے صفحے پر لکھتی ہیں:

> ''کبھی جو کسی نم آلود پتھر کو اٹھائیں تو اس کے نیچے ایک دنیا آباد نظر آتی ہے اور اچانک روشنی میں آ جانے پر جو افراتفری اس مخلوق میں نظر آتی ہے، وہی آج کل مشرقی معاشروں کا حال ہے.... مشرقی معاشرہ جو ترقی کی سرچ لائیٹ میں آیا تو ساتھ ہی عورت اور خاص کر مڈل کلاس کی عورت اور بھی پریشانی کا شکار ہوئی ہے۔ یہ تمام کھیل ایسے افراد کے متعلق لکھے گئے جن کے ہاتھ سنگ گراں تلے آئے اور انہیں واویلا مچانے اور دکھ بانٹنے کا اذن بھی نہ ملا'' (ص ۷)

''حوا کے نام'' سیریز سے نو اور ''نیا دور'' سیریز سے آٹھ ڈرامے لیے گئے ہیں۔شروع میں آزادی نسواں کے عنوان سے بانو قدسیہ کی وہ تقریر بھی شامل ہے جو ۱۹۷۱ء میں خواتین کا سال منانے پر ٹیلی کاسٹ ہوئی تھی۔اس تقریر اور ڈراموں میں بھی بانو قدسیہ کا عورتوں کی آزادی کے حوالے سے مخصوص نقطہ نظر موجود ہے جو زیادہ آزادی چاہنے والی خواتین (خصوصاً خواتین تنظیموں) کیلئے قابل قبول نہیں ہے۔

بانو قدسیہ، ''دوسرا قدم''، صفحات: ۵۲۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

''دوسرا قدم''، بانو قدسیہ کے خوبصورت اور خاصی حد تک مقبول عام بارہ ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس میں ڈراما دھوپ جلی، کچا راستہ، مور پنکھ، دیے کی آنکھ، بھروسہ، ایک واقعہ، دلبر کی قیمت، موت سے پہلے، اک میری وجہ سے، مایا داس، تحفظ اور اندھے دن شامل ہیں۔ دھوپ جلی اور مور پنکھ خصوصی طور پر پسند کیے گئے اور متعدد مرتبہ ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ دوسرا قدم کے ڈرامے ہماری شہری اور دیہاتی زندگی کے دُکھوں خصوصاً عورتوں کے مصائب کو سامنے لاتے ہیں۔ ساتھ ہی معاشرے کے تضادات اور تفخرات سے پیدا ہونے والی صورتحال اور رشتوں ناتوں میں پڑتی دراڑیں بھی تقریباً ہر ڈرامے میں جلی یا خفی طور پر موجود ہیں۔

بانو قدسیہ، ''سورج مکھی''، صفحات: ۱۶۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

اس مجموعے میں دوڈرامے سورج مکھی اورخزاں کی آمدشامل ہیں۔سورج مکھی چاراقساط اورخزاں کی آمددواقساط پر مشتمل ہیں۔ دونوں ڈرامے پسند کیے گئے اوراب بھی ناظرین کی یادداشتوں میں ان کے کچھ نہ کچھ حصے ضرورمحفوظ ہوں گے۔''سورج مکھی''اصل میں ہمارے معاشرے کے ہرمعمولی شخص کا المیہ ہے۔ ہمارے ہاں بہتر وہی ہے جوکسی بھی اعتبار سے کم ترنہیں ہے۔خزاں کی آمد،ایک نوبالغ، سادہ، دیہاتی اور گونگے بچے کا قصہ ہے،جس کے جذبات اوراحساسات میں بیداری آتے ہی وہ ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہوجاتا ہے۔رومان سے صدمے تک اورصدمے سے وجدکی کیفیت تک کا سفراس نوبالغ نے بڑی تیزی سے طے کرلیا۔

بانوقدسیہ،''فٹ پاتھ کی گھاس''،صفحات:۶۳۲،زیرنظرایڈیشن:۲۰۰۰ء

''فٹ پاتھ کی گھاس''، بانوقدسیہ کے تیرہ طویل ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے جو پاکستان ٹیلی ویژن سے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۷ء کے دورانیے میں پیش کیے گئے تھے۔''فٹ پاتھ کی گھاس'' کی اشاعت پہلی بار ۱۹۸۹ء میں فیروزسنز لاہور کے زیراہتمام ہوئی تھی (کتاب کے صفحات تھے: ۶۳۲+چندصفحوں پرڈرامے کے فنکاروں کی تصاویربھی تھیں)اس مجموعے میں درج ذیل ڈرامے شامل ہیں:

چٹان پرگھونسلہ،سراب،زردگلاب،انجانے میں،شکایتیں حکایتیں،کھل جاسم سم،سانول موڑمہاراں،آنکھ مچولی،فٹ پاتھ کی گھاس،رات گئے،علی بابااورقاسم بھائی،اچھےدن کا انتظار،یہ جنوں نہیں تو کیا ہے؟

بانوقدسیہ کے یہ طویل ڈرامے: سنجیدگی،فکرواسلوب کی پختگی،صراحت سے موضوع کو کھولنے کے انداز اور وضاحت سے کرداروں کے باطن کے انکشاف سے اردوڈرامے کا یادگارواقعہ بن گئے ہیں۔

حجاب امتیازعلی،''سوکھے پتے''،صفحات:۱۴۴،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۹ء

''سوکھے پتے''، حجاب امتیازعلی کے پانچ سٹیج ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ان ڈراموں کے مکالموں اورمنظرناموں پرحجاب کا مخصوص افسانوی اسلوب حاوی ہے۔اس مجموعے میں درج ذیل ڈرامے شامل ہیں:

بہاریں جنوں اورموٹرپمپ،سوکھے پتے،جنگ اور بچہ،پنجرہ،نیا گھر۔

ڈراما جنگ اور بچہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں ہے۔

رضی ترمذی سید،''مثال کے طورپر''(منظوم تمثیلات)،صفحات:۳۰۳،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۴ء

''مثال کے طورپر'' سیدرضی ترمذی کے درج ذیل سات منظوم ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے:

خیال کی دوری،آشوب آگہی،بیستوں اورہوا،دام شنیدن،اجنبی زندگی،ازل سے ابدتک،ڈاکٹرفاسٹس۔

سیدعابدعلی عابدکی ان ڈراموں کے بارے میں رائے یہ ہے:

''رضی اصلاً شاعر ہے۔ وہ کسی واقعے کو منظوم نہیں کرتا، بلکہ اس پرایک منظوم تمثیل نازل ہوتی

ہے.... اس مجموعے کی سات تمثیلات میں انسانی زندگی کے بیشتر بنیادی رخ ،معنوی علامتوں
اور علامتی رمزوں کے ذریعے ہمارے سامنے آجاتے ہیں''۔(فلیپ)

زیرنظر مجموعے میں رضی ترمذی سید کی منظوم تمثیلات کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اجمل ،سید عابد علی عابد اور محمد صفدر کے مضامین اور حمید شیخ کی تقریظ بھی شامل ہے۔مختار صدیقی پس سرورق یہ رائے دیتے ہیں:''یہ منظوم کھیل محض نظمیں یا کھیل نہیں روحانی وارداتیں ہیں، جو صرف انسانیت کے علمبردار پروارد ہوسکتی ہیں''۔

مستنصر حسین تارڑ،''پرواز''،صفحات:۲۰۸،زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''پرواز''، پاکستان ٹیلی ویژن کی پانچ اقساط پرمبنی ایک منی ڈراما سیریل تھی۔ پرواز کا شمار مقبول عام سیریلز میں تو نہیں ہوا لیکن یہ اپنے موضوع، پلاٹ کی نسبت، کرداروں کے تشخص اور فعالیت کے باعث اہم ڈراما تھا۔مستنصر نے اس سیریل میں عام اور فارمولا سیریلز کے مصالحے استعمال نہیں کیے۔ کتابی صورت پانے کے بعد ڈراما''پرواز'' کو جہاں مستنصر کے مخصوص قارئین کا حلقہ میسر آیا وہاں مطبوعہ ڈرامے کے مداحین نے بھی اس کی پذیرائی کی۔

مستنصر حسین تارڑ،''شہپر''،صفحات:۱۵۰،زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

''شہپر''،ایک ڈراما سیریل تھا جو پاکستان ائیرفورس کی خدمات کے پس منظر میں بنایا گیا تھا۔اس مقصدی ڈراما سیریل کومستنصر حسین تارڑ نے اپنے خاص ڈرامائی اور افسانوی انداز سے دلچسپی ،رومان اور مہم جوئی کا حامل بنائے رکھا۔ڈرامے میں کیڈٹ اکیڈمی کے تربیتی دورانیے ،وطن کیلئے عملی خدمات اور جاں نثاری کے جذبات کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ،''مورت''،صفحات:۲۱۵،زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''مورت''، چھ ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس میں شامل ڈرامے یہ ہیں:
مورت، دشت تنہائی،عبث بدنام کیا، پانی کا قیدی،مہک،جنگل میں راستہ۔

مستنصر نے پہلے صفحے میں اپنا یہ تاثر پیش کیا ہے کہ ٹی وی ڈراما نگار کا اصل مدعا اس کا ڈراما پڑھ کر سامنے آتا ہے، ورنہ عمومی صورت حال یہ ہے کہ بعض اوقات ڈراما نگار کا لکھا ہوا مسودہ (اس کی تحریر اور توقع سے) زیادہ بہتر طریقے سے ڈرامائی تشکیل پاتا ہے اور کبھی بلکہ اکثر اوقات پروڈیوسروں اور اداکاروں کے ہاتھ ڈرامے کی ایسی شکل سامنے آتی ہے۔ جسے دیکھ کر ڈراما نگار اور اس کے مداحوں کو رونا آتا ہے۔

زیرنظر مجموعے میں ڈراموں کا سکرپٹ کو افسانوی بیان اور لہجہ دے کر مصنف نے ڈراموں کو پڑھے جانے کی صفت بھی دے دی

ہے۔سوقاری ڈرامے کی قرأت کے مشکل مقام سے بڑی آسانی اورروانی سے گزرجاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ،''ہزاروں راستے''،صفحات:۳۷۳،زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

ڈرامہ سیریل ہزاروں راستے کے''تھیم سانگ'' کےطور پر مجیدامجد کی نظم''ہزاروں راستے ہیں'' گونجتی تھی:

ہزاروں راستے ہیں ،منزلیں ہیں ۔۔۔ سمندر اور صحرا بھی ہیں حائل

مگر رہبر ستارے کی شعائیں ۔۔۔ ہیں ہر رہرو کے سینے کی متاعیں

ڈراما''ہزاروں راستے'' کی کہانی پر اس نظم کے اثرات قائم ہیں اور کہانی نظم کی معنویت کو کرداروں اور واقعات سے باندازِ دگر دریافت اور منکشف کرتی ہے۔''ہزاروں راستے'' موضوع ،کردار نگاری اور صورت واقعہ کی پیش کش کے حوالے سے عمومی ٹی وی ڈراما سیریلز سے مختلف ہے۔

منٹو،سعادت حسن،''منٹو ڈرامے''،صفحات:۸۲۴،زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

سعادت حسن منٹو،ریڈیو کے لیے بھی ایک تواتر سے باقاعدہ ڈرامانما فیچرز لکھتے رہے۔زیرنظر مجموعہ ان سب ڈراموں اور فیچرز کا کلیات ہے۔ڈراموں کی اس کلیات میں منٹو کے نو مجموعے شامل ہیں: ا۔منٹو کے ڈرامے۔۲۔آؤ۔۳۔کروٹ۔۴۔تین عورتیں۔ ۵۔افسانے اور ڈرامے ۶۔جنازے۔۷۔کٹاری۔۸۔پھندنے۔۹۔تلخ اور شیریں

پہلے مجموعے''منٹو کے ڈرامے'' کے مختصر پیش لفظ میں منٹو نے ریڈیائی ڈرامے سے اپنے تعلق اور ریڈیائی ڈرامے کے تکنیکی مسائل کی جانب اشارہ کیا ہے۔

> ''میں اس وقت تک سو سے اوپر ریڈیائی فیچر اور ڈرامے لکھ چکا ہوں جو آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ ہو چکے ہیں۔اس مجموعے میں صرف اٹھارہ ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ان کی تکنیک جیسا کہ آپ کو ان کے مطالعے سے معلوم ہوگا،عام ریڈیائی ڈراموں سے مختلف ہے۔مناظر کی تبدیلی میں جو دقت پیش آئی تھی،میں نے چند طریقوں سے دور کرنے کی سعی کی ہے۔میں جانتا ہوں کہ یہ طریقے پیشہ ور نقادوں اور قدامت پرست تمثیل نگاروں کو پسند نہیں آئیں گے مگر ان کی حرف گیری اس وقت تک بالکل فضول ہوگی جب تک ان دقتوں کو دور کرنے کیلئے نئے طریقے ایجاد نہ ہوں،جو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں پیش آتی ہیں''(ص ۱۱)

پہلے مجموعے کا آخری ڈراما:منٹو کے مشہور افسانے''ہتک'' کی ریڈیائی تشکیل ہے۔دوسرے مجموعے''آؤ'' کے ڈرامے مزاحیہ ہیں۔چوتھے مجموعے تین عورتیں کے ڈرامے فقط عورتوں کے متعلق ہیں،اس مجموعے کا دیباچہ فقط ایک فقرہ ہے:

''پیش لفظ: یہ ہے کہ عورت خود قصہ آدم کا پیش لفظ ہے''۔

چھٹے مجموعے ''جنازے'' میں دنیا کی سات مشہور شخصیات کے آخری لمحات کو ڈرامائی خاکوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ساتواں اور آٹھواں مجموعہ (کٹاری اور پھندنے) ایک طویل ڈرامے پر مشتمل ہیں۔ ''کٹاری'' ریڈیو کے مائیک کیلئے نہیں، فلم کے کیمرے کیلئے لکھا گیا تھا۔ آخری مجموعے ''تلخ، ترش، شیریں'' میں کارل مارکس پر ایک دلچسپ نیم ڈرامائی شکل کا مختصر فیچر ہے۔ اس مجموعے کے دیگر دو ڈرامے ''انصاف'' اور ''غالب'' اور سرکاری ملازمت ہیں۔ فنی حوالے سے دیکھیں تو مجموعی طور پر افسانہ نگار منٹو، ڈراما نگار منٹو سے بہت بلند نظر آتا ہے۔ منٹو کے ڈرامے رجحان ساز ثابت نہ ہو سکے۔

یونس بٹ، محمد، ڈاکٹر، ''مس فٹ''، صفحات: ۲۹۴، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''مس فٹ''، ایک مزاحیہ ڈراما سیریز ہے جو ورکنگ ویمن ہوسٹل میں ہونے والی بوالعجبیوں کو موضوع بناتی ہے۔ اس عنوان سے چودہ کہانیاں نشر ہوئی تھیں اور زیر نظر مجموعہ انہی پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر محمد یونس بٹ کے متعدد مزاحیہ ڈراما سیریلز/سیریز سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیے ہیں اور انہیں قارئین کا ایک حلقہ (ناظرین کے ساتھ ساتھ میسر آ گیا ہے)۔ دیگر معروف کتابوں کے نام یہ ہیں:

فیملی فرنٹ، لاف پیک، گھر مستیاں، خرمستیاں۔

دوسرا حصہ:

تیسرا حصہ:

شاعری

آغا صادق، ''میں نے پھولوں کے خواب دیکھے''، صفحات:۵۰۰، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

''میں نے پھولوں کے خواب دیکھے'' آغا صادق کی نظموں کا مجموعہ ہے جو اُن کے بیٹے ڈاکٹر نوید حسن نے مرتب کیا ہے۔ آغا صادق کی نظموں میں غزل کی روایت اور علامہ اقبال کے فکری اور فنی اثرات جھلکتے ہیں۔ شہزاد احمد کتاب کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کے موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ ہیئت کی اس تبدیلی کا سراغ بھی ملتا ہے جو اقبال کے فوراً بعد اردو میں شروع ہوگئی تھی....... آغا صاحب نے زندگی کے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے، نظم اور غزل کے روپ میں کئی سوال اٹھائے ہیں، کئی جواب دیئے ہیں''۔
> (۲۲، ۲۷)

کتاب درج ذیل ابواب میں تقسیم ہے:

نوا، کیف و کرب، خلوت وجلوت، رگ سنگ، رنگ و بو، صبح صادق، مزاحیہ کلام۔

احمد حسین رشک ترابی، ''مشعل آفاق''، صفحات:۱۴۹، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''مشعل آفاق''۔ دینی اور قومی احساسات کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت کے علاوہ قرآن مجید، جنگ آزادی پاکستان، قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے سے نظمیں موجود ہیں۔ کتاب کے آغاز میں راجہ محمد شریف کا دیباچہ (بعنوان تعارف) احمد حسین رشک ترابی کی شخصیت اور فن کا تجزیہ پیش کر رہا ہے، اس تجزیے میں شاعر سے محبت وعقیدت نمایاں ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ''ان کا اصل میدان مسدس ہے، غزل کی تنگ دامنی اُن کے موضوعات کی وسعت کی متحمل نہیں ہوسکتی... وہ ''حیات اقدسؐ'' کے ایک ایک ''جزو'' کو اس موثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ''کل'' کا گمان ہوتا ہے.... رشک صاحب کے اشعار مردہ دلوں کے لیے مژدہ جان فزا ثابت ہوتے ہیں''۔ (ص ۷)

احمد شجاع پاشا، ''رسم وفا''، صفحات:۱۲۸، زیرِ نظر ایڈیشن، ۱۹۷۶ء

''رسم وفا''۔ معروف ناول نگار احمد شجاع پاشا کا شعری مجموعہ ہے۔ احمد شجاع پاشا نے اپنے شعری احساس کے اظہار کے لے صرف غزل کا ہی انتخاب کیا؛ اگرچہ ان کی شاعری کلاسیکی غزل کے عناصر سے مملو ہے لیکن تازگی کی حامل ہے۔

''رسم وفا'' کا دیباچہ سلیم اختر نے لکھا تھا؛ دیباچے سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جارہا ہے:

''احمد شجاع پاشا کی غزل کا سب سے اہم موضوع واردات قلبیہ کی عکاسی اور دردِ دل کا اظہار ہے۔ یوں سمجھے جس رومانی انداز نظر سے وہ اپنے ناولوں کے کینوس سجاتا ہے وہی مزید جلا پا کر اس کی غزل میں رمز و کنایہ کے انداز متعین کرتا ہے''۔(ص:٦،تاریخ تحریر:١٣نومبر١٩٧٥ء)

(مجموعہ رسم وفا کی یہ پہلی اشاعت ہے اوراس کی قیمت صرف ساڑھے بارہ روپے درج ہے، یہ مجموعہ ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا)

احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، صفحات:٨٤٠، زیرِ نظر ایڈیشن:١٩٩١ء

''ندیم کی غزلیں''۔احمد ندیم قاسمی کا کلیات غزل ہے؛اس میں درج ذیل شعری مجموعوں سے غزلیں اخذ کی گئی ہیں: لوحِ خاک، دوام، محیط، دشت وفا، شعلہ گل، جلال و جمال، آخر میں متفرق اشعار بھی درج ہیں۔فہرست غزل کلیات کے آخر میں دی گئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی غزل، اردو غزل کی روایت کے اثرات سے بتدریج باہر نکلی اور احساس و اظہار کی انفرادیت کے نقش محکم کرنے میں بالاخر کامیاب ہوگئی۔احمد ندیم قاسمی کی کثیر الجہت تخلیقی شخصیت کے اثرات بھی ان کی غزل کی جمالیات میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں'' (جلد اول ودوم)، صفحات:١٤١٥، زیرِ نظر ایڈیشن:١٩٩١ء

احمد ندیم قاسمی کی ٧٥ ویں سالگرہ پر سنگ میل لاہور نے جو خصوصی کتب شائع کیں، زیرِ نظر مجموعہ ''ندیم کی نظمیں'' ان میں سے ایک ہے۔احمد ندیم قاسمی کے مختلف شعری مجموعوں سے نظمیں اور غزلیں الگ کر کے ''ندیم کی نظمیں'' (دو جلدیں) اور ''ندیم کی غزلیں'' مرتب کی گئی ہیں گویا ندیم قاسمی کا شعری کلیات تین ضخیم جلدوں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

ندیم کی نظمیں (جلد اول) میں درج ذیل شعری مجموعوں کی نظمیں شامل ہیں:

لوحِ خاک (٦٠نظمیں)، دوام (٦٦نظمیں)، محیط (١٠٧نظمیں)، دشت وفا (٦٣نظمیں)۔

تمام نظموں کے آخر میں تاریخ تحریر بھی درج ہے۔اس مجموعے کی پہلی نظم ''آئندہ صدی کا انسان'' پر تاریخ تحریر مارچ ١٩٨٧ء اور آخری نظم ''ایوانِ سحر میں'' پر تاریخ تصنیف نومبر ١٩٥٢ء درج ہے۔

جلد دوم کے لیے شعری مجموعوں شعلہ گل، جلال و جمال اور رم جھم سے نظمیں اخذ کی گئی ہیں۔آخر میں رباعیات و قطعات بھی ہیں۔احمد ندیم قاسمی کی نظمیں سادہ اسلوب، موثر ابلاغ اور واضح اور کشادہ انداز پیش کش کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہیں۔ان کی نظموں میں ان کا ترقی پسندانہ سیاسی شعور، حقیقت پسندانہ معاشرتی احساس، تکریم انسان کا جذبہ اور واقعات و سانحات پر فوری ردِعمل کا غیر مبہم اظہار جھلکتا ہے۔

اختر ہوشیار پوری، ''شب گزراں''، صفحات:۱۵۱، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

''شب گزراں'' اختر ہوشیار پوری کی نظموں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں اختر ہوشیار پوری کی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۹۴ء تک کی نظمیں یکجا ہوگئی ہیں؛ اختر ہوشیار پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن وہ اپنے شعری سفر کے دوران میں خوبصورت نظمیں کہتے رہے ہیں؛ بقول امین راحت چغتائی:

> ''یہ نظمیں اپنے دور کے بتدریج بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت رومان، انقلابی رومانیت اور حقیقت پسندی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں..... اس کے ہاں ابہام نہیں ہے۔کسی نقطہ نظر کی شدت نہیں ہے اور زبان سہل ہے''۔(دیباچہ بعنوان پیش گفتار، ص ۵،۱۴، تاریخ تحریر ۵/ اپریل ۱۹۹۵ء)

چند نظموں کے عنوان یہ ہیں: صبح نو، تاج محل، دسمبر کی آخری رات، ایٹم بم، سفر کا عذاب، شکست شب، شب گزراں، کشمیر، عبادت کی رات، ۱۸۵۷ء کے شہداء کے نام، خوابوں پہ کسی کا اجارہ نہیں۔

اختر ہوشیار پوری، ''مجتبیٰ''، صفحات:۱۰۳، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۷ء

''مجتبیٰ''۔اختر ہوشیار پوری کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔اس سے پہلے ''برگ سبز'' کے نام سے ان کا نعتیہ کلام پر مبنی پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اختر ہوشیار پوری کی نعت ان کی قلبی عقیدت، فکری پختگی اور فنی سلیقے کی غماز ہے۔اپنے مختصر دیباچے بعنوان ''متاعِ فقیر'' میں وہ فنِ نعت گوئی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مجھے اس بات کا احساس رہا ہے کہ توحید و رسالت دونوں بے حد حزم واحتیاط کے موضوعات ہیں۔حدِ فاصل کا ادراک نہ ہو تو ایک لمحے میں ایمان کی حدود غلط ملط ہو جاتی ہیں اور موالفت کی بجائے مواخذہ کی ساعت آجاتی ہے..... میرا لب ولہجہ دھیما اور انکسار سے مملو ہے۔میں نے نعت جوش سے نہیں ہوش سے کہی ہے اور اپنی اوقات کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ عشق رسول، اطاعت رسول کے سوا کچھ نہیں''۔(ص ۹،۱۰، تاریخ تحریر:۸۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

اشفاق حسین، ''ہم اجنبی ہیں''، صفحات:۲۰۸، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

''ہم اجنبی ہیں''۔اشفاق حسین کا شعری مجموعہ ہے جس میں (ٹورنٹو میں کہا ہوا) ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کا کلام شامل ہے۔اس مجموعہ کا دیباچہ ''ہم اجنبی ہیں'' کے عنوان سے خود اشفاق حسین نے لکھا ہے اور اس پر تاریخ تحریر جنوری ۱۹۹۱ء درج ہے۔

ہجرت کا دکھ، وطن کی محبت، عالمی مصائب کا عفریت، ذات کی شکست وریخت، بڑھتی ہوئی بے حسی وسنگ دلی، اجنبیت کی گہری فضا اور محبت کا ڈوبتا ابھرتا احساس: اشفاق حسین کی شاعری کے اہم اور خاص موضوعات ہیں۔

''چھوڑے ہوئے قدم'' اور ''کھوئے ہوئے راستے'' ان کے تعاقب میں ہیں اور وہ خود اجنبی دیاروں کی گرفت میں ہیں؛ اس تجربے کے باعث وہ انسان کی باطنی تقسیم کی تجسیم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اصغر ندیم سید، ''جنگل کے اس پار جنگل''، صفحات: ۱۵۲، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

''جنگل کے اس پار جنگل'' اصغر ندیم سید کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

اس مجموعے کی نظمیں رومان، پراسراریت، وارفتگی اور استفساریہ لہجے سے عبارت ہے۔ شاعر بڑی سادگی سے سب کچھ کہنے کے باوجود اپنی بات کو ایک جیتے جاگتے سوال میں بدل دیتا ہے کیونکہ سوال میں جو زور ہوتا ہے وہ ''بیان'' میں نہیں ہوتا۔ فلسطین کے پس منظر میں لکھی گئی نظم: ''وہ کیا چاہتے ہیں؟'' اس امر کی نمایاں مثال ہے۔

اظہار الحق، محمد، ''پری زاد''، صفحات: ۱۶۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''پری زاد'' محمد اظہار الحق کی غزلوں، نظموں اور نثری نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس میں مسلم تاریخ کے عناصر شعری مواد میں اس طرح ڈھلے ہیں کہ شاعری کی علامتی ابعاد، استعاراتی تہہ داری اور اسلوبیاتی فضا تینوں وسعت آشنا ہو گئے ہیں۔

مجموعے کے آغاز میں قمر جمیل کا تخلیقی اسلوب میں لکھا ایک مضمون بعنوان ''سنہری زمین پر روشنی کا ایک پھول'' شامل ہے جس میں محمد اظہار الحق کی باطنی شخصیت اور شعری باطن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قمر جمیل لکھتے ہیں: ''اظہار الحق کی شاعری میں بھی ارضیت اور جہان معنی دونوں اپنا انکشاف کر رہے ہیں''۔ (ص ۱۷) کتاب کے فلیپ پر پروفیسر ممتاز حسین اور ظفر اقبال کی آرا درج ہیں۔

اعجاز فاروقی، ''سورج کی آنکھ''، صفحات: ۱۵۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۷۸ء

''سورج کی آنکھ'' اعجاز فاروقی کی ۴۳ نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔

اعجاز فاروقی کی نظمیں ان کے باطن کے ساتھ ساتھ ان کے عصر کی بھی سرگذشت ہیں۔ خصوصاً برصغیر کے ہر گہرے گھاؤ کا تخلیقی اظہار ان کی شاعری کا ایک اختصاص ہے؛ اس حوالے سے ان کی چند نظموں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

سنگ میل، جلتا جسم، کھلتی مورت، خواب کا رقص، گنبد، میرا وطن، رہائی، سورج ابل پڑیں گے۔

ایک نظم ''جست'' چاند پر انسان کے پہلے قدم کے حوالے سے بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں نظموں کی فہرست درج ہے جس میں نظموں کے عنوانات کے ساتھ تاریخ تحریر بھی لکھی گئی ہے۔

اقبال،کلیات اقبال(اردو)**،صفحات:۳۳۶،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۸ء**

کلام اقبال کے اشاعتی حقوق عام ہوجانے پر سنگ میل نے ''کلیات اقبال'' کوضخامت میں کم اور مکمل فہرست نظم وغزل کے ہمراہ شائع کیا ہے۔(فہرست کے باعث کلیات میں اقبال کی مطلوبہ نظم یا غزل تک پہنچنا آسان ہوگیا ہے)

اقبال نے بیسویں صدی کو تخلیقی اور فکری زاویے سے ہی نہیں، اشاعتی حوالے سے بھی سرگرم رکھا ہے۔اقبال کے کلام کی متعدد اور متنوع اشاعتیں اور اقبال کے حوالے سے تحقیقی وتنقیدی وفرہنگی طباعتیں برصغیر کا تاحال منفرد واقعہ ہے۔

سنگ میل نے علامہ اقبال کے کلیات کے علاوہ باقی شعری مجموعے بھی اہتمام سے شائع کیے ہیں مثلاً بانگ درا کے خوبصورت، باتصویر اور نہایت اعلیٰ ایڈیشن (قیمت:۴۵۰روپے)، کے ساتھ طلباء ایڈیشن بھی شائع کیا ہے (قیمت:۷۵روپے)، بال جبریل، ضرب کلیم کے علاوہ اقبال کی معروف نظموں شکوہ، جواب شکوہ کو بھی یکجا کر کے کتابی صورت دی ہے۔

علاوہ ازیں اقبال کے تمام مجموعوں کی شرحیں بھی طبع کی ہیں۔

بہادرشاہ ظفر، ''بیاضِ ظفر''،(مرتبہ:سلیم الدین قریشی)**،صفحات:۱۲۸،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۴ء**

''بیاض ظفر''۔ بہادرشاہ ظفر کے غیر مطبوعہ کلام اور قلعہ معلے کے روزنامچے پرمبنی مجموعہ ہے۔

''بیاض ظفر'' کے مرتب سلیم الدین قریشی نے انڈیا آفس لائبریری لندن میں اردو اور دیگر برصغیری زبانوں کے مخطوطات پر تحقیقی کام کرتے ہوئے بہادرشاہ ظفر کے نایاب خودنوشت غیرمطبوعہ کلام اور قلعہ معلے کے روزنامچے کو دریافت کیا ہے۔مرتب نے اپنے پیش لفظ میں بتایا ہے۔

> ''بیاض ظفر کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے۔البتہ اس میں درج شدہ چند غزلیں، ترمیمی واضافہ کے ساتھ ظفر کے مطبوعہ کلام میں شامل ہیں.... غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ ظفر کے فی البدیہ قطعات بھی شامل ہیں۔ظفر کے اس نئے اور غیر اصلاح شدہ کلام سے ان کی شاعری کے صحیح مقام اور مرتبہ کا تعین کرنے میں مدد ملے گی۔'' (ص:۱۲،۱۸)

قلعہ معلیٰ کا روزنامچہ بھی تاریخی حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔زیرنظر کتاب کے آخر میں مخطوطے کا عکس بھی شامل ہے۔''بیاض ظفر'' کا شمار سنگ میل پبلی کیشنز کی اہم اشاعتوں میں کیا جاتا ہے۔

بہادرشاہ ظفر،(ابوالظفر سراج الدین بہادرشاہ)**، ''کلیات ظفر'' (مکمل چار جلد)،صفحات: جلد اول و دوم:۷۳۶، جلد سوم و چہارم:۵۹۰،کل:۱۳۲۶،زیرنظرایڈیشن:۲۰۰۰ء**

''کلیات ظفر''۔آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کے تمام اردو کلام پر محیط ہے (آخر میں پنجابی زبان میں بھی کلام موجود ہے)۔ جلد اول و دوم کے آخر میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے حوالے سے عمر فیضی کا ایک تجزیاتی مطالعہ بھی شامل اشاعت ہے۔عمر فیضی نے بہادر شاہ ظفر کی شعری خصوصیات کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے حوالے سے موجود ادبی غلط فہمیوں کے ازالے کی بھی کوشش کی ہے مثلاً:

''اکثر لوگوں نے ظفر کے کلام کو ذوق ہی کا کارنامہ سمجھ لیا اور یہ غور کرنے کی بھی زحمت نہ کی کہ ذوق و ظفر میں فرق کیا ہے؟.... یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان اور محاورے کے معاملے میں ظفر کو ذوق پر فوقیت حاصل ہے.... مضمون آفرینی کے معاملہ میں ذوق کا کلام اکثر کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہو جاتا ہے مگر ظفر کا یہ حال نہیں وہ سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں اچھا شعر نکال لیتے ہیں.... استادانہ قسم کی شاعری میں بھی ظفر روح شاعری کو برقرار رکھنے پر قادر ہیں۔ان کی کوئی غزل ایسی نہیں جس میں دو چار شعر دل کش اور پرتاثیر نہ ہوں۔ برخلاف اس کے ذوق کی غزلیں عموماً سپاٹ ہیں اور ان میں سوائے ''استادی'' کے اور کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ظفر اور ذوق میں ایک اور فرق یہ ہے کہ ذوق کے یہاں شکوہ الفاظ ہے اور ظفر کے یہاں دھیما پن اور لہجہ کی گھلاوٹ''۔(ص ۷۳۴، ۷۳۵)

بہادر شاہ ظفر کی غزل روایتی موضوعات کی حامل ہونے کے باوجود ایک بادشاہ کی درویشانہ طبع اور عاشقانہ وضع کی ترجمان ہونے کے باعث اردو شاعری میں انفرادیت رکھتی ہے۔ان کی غزل میں لہجے کی خنکی اور آہنگ کی خوش رنگی کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی، موت کے جبر اور انسانیت کے زوال کا گہرا احساس پوری شدت سے موجود ہے۔

پرتو روہیلہ، ''آواز''، صفحات:۱۵۷، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''آواز''۔ پرتو روہیلہ کی ۵۶ نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ پرتو روہیلہ جدید اردو نظم کا ایک اہم حوالہ ہیں۔''آواز'' کی نظموں سے شاعر کے نئے تخلیقی امکانات سامنے آئے ہیں۔کتاب کے آخر میں جیلانی کامران کا مضمون ''پرتو روہیلہ کی نظمیں'' اور انور جمال، جمیل جالبی، محسن احسان، شان الحق حقی، ضمیر جعفری اور شہزاد احمد کی آرا شامل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

''پرتو روہیلہ نے تضاد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک نئے رنگ سخن کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یہاں قومی مسائل کو وہ جس تخلیقی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے، وہ نئی شاعری کے لیے ایک کھلا راستہ ہے''۔(ص:۱۵۴)

اس مجموعے کی چند اہم نظموں کے عنوانات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

حکایت شب، چودہ اگست، وارفتگی، پن کشن، کارزار، نردبان حسن، لغزش دست، تحسین سخن شناس، نسلوں کا سبق، کتبہ ترک محبت۔

پرتو روہیلہ، ''شکست رنگ''، صفحات:۱۷۶، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''شکست رنگ''۔ پرتو روہیلہ کی ۱۰۵ غزلوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں پرتو روہیلہ کی ابتدائی شاعری سے لے کر کتاب کی اشاعت سے دو برس پہلے تک کی شاعری یکجا ہوگئی ہے۔ان کی غزلوں میں انفرادیت، خلوص اور دردمندی ہے، ان کے ہاں کسی معاصر شعری ونظری مسلک کا تتبع یا اثرات نہیں ہیں۔ پرتو کے اشعار میں نمو بھی ہے اور معنی کے نئے امکانات کے روزن بھی ہیں۔

تصدق حسین خالد، ڈاکٹر، ''سرودنو''، صفحات:۲۹۱، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کا شمار آزاد نظم کہنے والے اولین شاعروں میں ہوتا ہے۔''سرودنو'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور کتاب میں شامل ایک شذرے پر درج تاریخ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔کتاب کے آغاز میں تصدق حسین خالد نے اپنی شعر گوئی، شعر فہمی اور جدید نظم کی جانب راغب ہونے کی کہانی سنائی ہے۔پیش لفظ سلمیٰ تصدق نے لکھا ہے؛ کتاب کا تفصیلی تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ کا تحریر کردہ ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''خالد کی انفرادیت دو خصائص پر قائم ہے۔ایک خصوصیت اس کا وفورِ احساس اور دوسری خصوصیت جس میں اولیت کی حد تک اس کا شریک کوئی نہیں ایک ہیئت کی ایجاد ہے جس کے ذریعے اردو نظم آگے بڑھنے کے قابل ہوئی۔'' (ص:۴۱)

علاوہ ازیں جسٹس اسلم ریاض حسین، عطاء اللہ سجاد، احمد ندیم قاسمی اور اعجاز حسین بٹالوی کے تاثرات اور تجزیوں پر مبنی مضامین بھی شامل ہیں۔تصدق حسین خالد کی چند نظموں کے عنوانات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

ایک خط کے جواب میں، چاند آج کی رات نہیں نکلا، کس قدر تنہا ہے تو، موج دریا، صبح ازل، پیا پردیس، یہ جہاں میرے لیے ہے، سپاہی کی دلہن، یہ تماشا گہ عالم کیا ہے؟ یہ دیوار اونچی بنانی پڑے گی، لامکاں تا لامکاں۔

تصدق حسین خالد کی نظمیں رومانیت، موسیقیت اور انفرادیت کی آمیزش سے وجود پاتی ہیں۔احمد ندیم قاسمی نے انہیں اجتہاد اور اعجاز حسین بٹالوی نے تنہائی کا شاعر کہا ہے۔ (ص ۶۹،۷۴)

جاوید شاہین، ''محراب میں آنکھیں''، صفحات:۱۵۹، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۵ء

''محراب میں آنکھیں'' جاوید شاہین کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں کے بارے میں محمد سلیم الرحمٰن

لکھتے ہیں:

''اس کی نئی غزلوں میں مزاج اوراحساس کی ایک پر جوش وحدت موجود ہےاس وحدت نے ان غزلوں کوالگ الگ اورایک دوسرے سے بے نیاز تخلیقی کاوشوں کے بجائے جلتے، سلگتے اور بجھتے رنگوں کی ایک صف بنادیا ہے۔ یہ سر بسر صف ماتم تو نہیں اور شاعر کی آواز کی حرارت اس کی واضح نفی ہے.... (جاوید شاہین کی) نظمیں خطیبانہ شوروغوغا سے تقریباً پاک ہیں اور انصاف دشمن معاشرے کی ہولنا کیوں کا ذکر شاعر نے بالکل فطری لہجے میں کیا ہے۔'' (فلیپ)

حزیں کاشمیری، ''نازونیاز''، صفحات:۱۸۴، زیرنظر ایڈیشن:۱۹۷۸ء

''نازونیاز''۔حزیں کاشمیری کا شعری مجموعہ ہے جس میں حمد،نعت کے علاوہ چالیس غزلیں، چار سہرے اور والد کا ایک قطعہ تاریخ وفات شامل ہیں۔حزیں کاشمیری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اوران کی غزل کی عمومی قوت اور مقبولیت اردو غزل کے روایتی عناصر پر مبنی ہے لیکن ان کی ذات اور زمانے کے سچے اور کھرے عکس نے ان کی غزل کو ایک خاص نہج کی انفرادیت عطا کی ہے۔زیرنظر مجموعے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا مختصر دیباچہ (حرفے چند) اور ڈاکٹر ناظر حسین زیدی کا مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اس کی غزل میں خاصی پختگی موجود ہے۔غزل کہنے کا ڈھنگ اسے آتا ہے۔عمدہ اسالیب پر قدرت حاصل ہے اور غزل کی زبان پر عبور۔حزیں کی غزل میں معصومیت اور خلوص موجود ہے جو اس کی شخصیت کا پرتو لے ہوئے ہے''۔(صفحہ نمبر درج نہیں)

کتاب عمدہ کاغذ پر سلیقے سے شائع کی گئی ہے اور ۱۸۴ صفحات کے باوجود اس کی قیمت صرف اکیس روپے ہے۔

حسن رضوی، ''کبھی کتابوں میں پھول رکھنا''، صفحات:۲۸۳، زیرنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''کبھی کتابوں میں پھول رکھنا''۔حسن رضوی کی غزلوں، گیتوں اور قومی نغموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔

مجموعے کا پہلا حصہ ''غزلیں''، دوسرا ''کوئی آنے والا ہے'' (گیت)، تیسرا ''بچوں کا گیت نگر'' اور ''خوشبوئے وطن'' ہے۔پس سرورق پر منیر نیازی کی رائے درج ہے؛ وہ کہتے ہیں:

''اس کے کلام میں جو تاثیر ہے وہ ملک کے بیرون تک جا پہنچی ہے۔اس کی گوناگوں اور متنوع مصروفیات نے اس کی فکر پر منفی اثرات مرتب نہیں کیے بلکہ اس کے اظہار میں توانائی اور کشش کا سبب بنی ہے''۔

حسن رضوی کی شاعری کا بنیادی موضوع محبت ہے اور ان کا اسلوب موضوع کا ساتھ عمدگی سے دیتا ہے۔زیرنظر مجموعے نے

ادب کے نئے قارئین (طالب علموں اور نوجوانوں) میں مقبولیت حاصل کی۔

حسن رضوی، ڈاکٹر، ''مدینے کی ہوا''، صفحات: ۱۷۴، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''مدینے کی ہوا'' نعتوں کا مجموعہ ہے۔ حفیظ تائب نے ''پیشوائی'' کے عنوان سے حسن رضوی کی نعت گوئی پر اظہار خیال کیا ہے:

''حسن رضوی کی نعت کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذات وصفات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور آپؐ سے اپنے تعلق خاطر کو خاص اپنے لہجے میں بیان کرتے ہیں.... عصری اور جدید حساسیت نے ان کی نعت کو طرفہ تازہ کاری کی راہ دکھائی ہے''۔(ص ۲۸)

زاہد ڈار، ''تنہائی''، صفحات: ۲۶۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

''تنہائی'' زاہد ڈار کی طبع زاد نظموں اور منظوم تراجم پر مبنی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے چار حصے ہیں:

قوس اول۔ عورت اور میں ۴۰ نظمیں، قوس دوم۔ لفظوں کا سلسلہ طویل نظم، قوس سوم۔ غیر ملکی شعراء کے تراجم، ۲۱ شعرا کی نظمیں، قوس چہارم۔ پابند نظمیں۔

زاہد ڈار کی شاعری نئے احساس کی حامل ہے؛ ان کی نظمیں موضوع سے پیش کش تک معاصر شاعری سے مختلف ہیں۔

کتاب میں غالب احمد کا مضمون ''حقیقت'' عورت اور مجازی لباس، کے عنوان سے شامل ہے جس میں زاہد ڈار اور ان کی نظموں کے باطنی آہنگ کو منکشف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب احمد لکھتے ہیں:

''زاہد ڈار ابھی ''حقیقت'' اور ''عورت'' دونوں کے ''مجازی لباس'' کی تلاش میں ہے۔ یہی مجازی لباس زندگی کا نیا فیشن بھی ہوگا اور نیا ادب بھی۔ زاہد ڈار کے شعری وجدان میں مستقبل کی امید اور روشنی ہے۔ اس کی شاعری، شاعری سے مبرا خالص شاعری ہے اور آئندہ اسی شاعری کا امکان ہے''۔(ص ۸)

کتاب کا فلیپ شمیم حنفی نے لکھا ہے۔

ساقی فاروقی، ''زندہ پانی سچا''، صفحات: ۶۹۵، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

''زندہ پانی سچا'' ساقی فاروقی کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام پر مبنی مجموعہ ہے۔

اس مجموعے میں ۱۹۵۵ء تا ۱۹۹۱ء کا کلام جمع کیا گیا ہے اور اس کلام کے لیے (کتاب کے عنوان: ''زندہ پانی سچا'' کے علاوہ) دو

اورعنوانات بھی درج کیے گئے ہیں: ''نخوت کے پھول'' اور ''۳۷ برس کے سوگ''

ساقی فاروقی منفرد، غیر رسمی اور بے باک لہجے کے شاعر ہیں۔ انسانی سماج اور اپنی ذات کے آڑھے ترچھے زاویے انہیں تخلیقی طور پر رواں رکھتے ہیں۔

''زندہ پانی سچا'' میں ساقی کے جن مجموعوں کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان کی تفصیل کتاب میں اس طرح درج ہے۔

پیاس کا صحرا۔۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۶ء، رادارے ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۷ء، بہرام کی واپسی ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۴ء، بلڈ بنک ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۱ء۔ ''زندہ پانی سچا'' کا دیباچہ مشتاق احمد یوسفی نے ''یہ دیباچہ نہیں ہے'' کے عنوان سے لکھا ہے اور اپنے مخصوص شگفتہ اور زیرک لہجے میں ساقی کے فن و شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اس مختصر دیباچے کے ایک موڑ پر یوسفی لکھتے ہیں:

> ''جدید مغربی شاعری اور ادبی رجحانات سے جو براہ راست واقفیت ساقی رکھتے ہیں وہ کسی اور حصے میں نہیں آئی۔ خالص اور تازہ ترین مغربی Contemporary Diction کے اگر وہ تنہا شاعر نہیں تو سب سے ممتاز شاعر ضرور ہیں''۔(دیباچہ:ص ۱۷)

سعادت سعید، ''کجلی بن''، صفحات:۱۴۸، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۸ء

''کجلی بن''۔ سعادت سعید کی نظموں کا مجموعہ ہے؛ یہ نظمیں جدید نظم کی فکری گہرائی اور فنی حسن کی حامل ہیں۔ ان نظموں کے حوالے سے اظہر غوری نے لکھا ہے:

> ''کجلی بن کی اڑتالیس نظمیں، اپنے رنگوں بھرے موضوعی رس کی وساطت سے سات نکات: (یعنی وجودیت، تہذیبی تجزیہ، تعقلاتی مجادلہ، جدلیاتی متخیلہ، سیاسی شعور، سماجی بے اطمینانی اور محبت میں عدم استحکام) کے بیان میں نظریاتی بافت کا جوہر رکھتی ہیں''۔(فلیپ)

سعادت سعید نے ''کجلی بن'' کا مقدمہ ''آزادی اور ذمہ داری کی شعریات'' کے عنوان سے لکھا ہے اور اپنا تصور شعر اور تخلیقی مسلک واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا انتساب ان الفاظ پر مشتمل ہے: ''نئی اردو شاعری کے ماخذ افتخار جالب کے نام''

کتاب کا نام ایک نظم کے عنوان ''کجلی بن'' (شائع شدہ ص:۶۶) پر رکھا گیا ہے۔

سودا، مرزا محمد رفیع، ''کلیاتِ سودا'' (بترتیب جدید)، صفحات:۴۵۰، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

اردو غزل اور قصیدے کے استاد شاعر مرزا محمد رفیع سودا کا زیر نظر کلیات مولانا عبدالباری آسی نے مدون اور ایک جامع مقدمے کے ساتھ اہل نظر کے سامنے پیش کیا تھا۔ مولانا آسی نے تحقیق و تصحیح متن کی کہانی سناتے ہوئے اپنی مشکلات کا اظہار کیا اور بتایا کہ قلمی نسخے دستیاب نہ ہو سکنے پر: ''آخر دو نسخے قلمی، ایک مطبع مصطفائی کا مطبوعہ، ایک قدیم نسخہ کشوری حاصل کر کے اسی سے اس نسخے کی تصحیح کی گئی

ہے''۔(ص ۱۸)

''کلیات سودا'' میں دیوان اردو، مدحیات، ہجویات، تضمین وگرہ بند، رباعیات وخاتمہ شامل ہیں۔

ادارہ سنگ میل نے کلیات کی اس کتابت کو برقرار رکھا ہے جو مولانا عبدالباری آسی کی پیش کردہ اور تصحیح شدہ تھی۔

شبنم شکیل، ''شب زاد''، صفحات:۱۴۳، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''شب زاد''، شبنم شکیل کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ شبنم شکیل کی غزل کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں، بیان اور لہجہ شفاف، دلاویز اور منفرد ہے۔ بانو قدسیہ ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''شبنم کی شاعری ٹھہرے ہوئے مہ وسال میں بدلے ہوئے روز وشب کی شاعری ہے.... یہ بے مہر موسموں اور گہرے پانیوں کی شاعری ہے.... اتنی اچھی شاعری کا سلیقہ ایک سارے عہد کو باعزت بنانے میں بڑی مدد کرسکتا ہے۔'' (پس سرورق)

شہرت بخاری، ''شب آئینہ''، صفحات:۳۰۳، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

''شب آئینہ'' شہرت بخاری کی (۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران میں کہی گئی) غزلوں کا مجموعہ ہے۔''شب آئینہ'' کا آغاز: حمد، نعت اور منقبت سے ہوتا ہے اور یہ تمام بھی غزل کی ہیئت میں ہی ہیں۔

شہرت بخاری کی غزل میں روایت کی تخلیقی قوت بھی ہے اور جدیدیت کی طرار لہریں بھی ہیں۔ ان کے پیرایہ اظہار میں آمد کی بے ساختگی کے ساتھ ساتھ تنقیدی تدبر وتحمل سے اپنے مضامین کو دیکھنے کا رویہ بھی موجود ہے۔

شہزاد احمد، ''ٹوٹا ہوا پَل''، صفحات:۲۰۰، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''ٹوٹا ہوا پَل'' شہزاد احمد کا شعری مجموعہ ہے؛ اس میں غزلیں، نظمیں، نثری نظمیں اور ایک طویل نظم ''ساقی نامہ'' شامل ہے۔ کتاب کے فلیپ پر شہزاد احمد کی شعری خصوصیات ان لفظوں میں بیان کی گئی ہیں:

> ''سائنس اور فلسفے کے گہرے مطالعے نے ان کی شاعری کے اندر بہت سی ایسی سمتیں پیدا کر دی ہیں جو اردو شاعری کے لیے نئی بھی ہیں اور خوش آئند بھی۔ ان کی شاعری کا تعلق بیک وقت جہانِ صغیر اور جہانِ کبیر سے ہے۔ اس لیے آنکھ اور دل کے استعارے ان کے ہاں معانی کی کئی پرتیں لئے ہوئے ہیں وہ ایک جداگانہ شخصیت، لب ولہجہ اور طرز احساس رکھتے ہیں''۔(فلیپ)

اس مجموعے کی بیشتر غزلوں اور نظموں میں موت کے تجربے کو تخلیقی سطح پر محسوس اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''ٹوٹا ہوا پَل''

بنیادی طور پر وہ پل ہے جو زندگی اور موت کے درمیان موجود بے نام ونشان منزل کو مس کرنے کی سکت رکھتا ہے۔

شہزاد احمد،''دیوار پہ دستک''،صفحات:۱۰۶۹،زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''دیوار پہ دستک''۔شہزاد احمد کا شعری کلیات ہے؛اس میں درج ذیل شعری مجموعوں سے شہزاد احمد کی غزلیں اور نظمیں اخذ کی گئی ہیں:
صدف،جلتی بجھتی آنکھیں،ادھ کھلا دریچہ،خالی آسمان،بکھر جانے کی رت۔

اس کلیات میں شہزاد احمد کا ۱۹۴۶ء سے ۱۹۸۲ء تک کا شعری اثاثہ محفوظ ہوگیا ہے۔ پہلے مجموعے''صدف'' میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۷ء تک کا کلام موجود ہے؛اس مجموعے کا ابتدائیہ مظفر علی سید نے لکھا تھا' شہزاد احمد کی غزل گوئی پر ان کی رائے یہ تھی:

''مجموعی طور پر شہزاد ان شاعروں میں سے ہے جن کے ہوتے ہوئے ہم غزل سے شاکی تو ہو سکتے ہیں' مایوس نہیں ہو سکتے۔اور لوگوں کی طرح مجھے بھی غزل کے محدود امکانات اور اس زمانے میں غزل گوئی کے مروج انداز سے گلہ پیدا ہوا ہے۔مگر وہ غزل گو جو صرف غزل گوئی نہیں کرتے،شاعری بھی کرتے ہیں۔اس بدنام صنف سخن کے لیے سپر کا کام دیتے ہیں... میرے خیال میں غزل کی آبرو،شہزاد کے سے ان نوجوان شاعروں پر منحصر ہے جن کا حال امید افزا ہے اور مستقبل مایوس کن نہیں''۔(ص۱۳،۱۴)

دوسرے مجموعے''جلتی بجھتی آنکھیں''میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کا کلام یکجا ہے؛ مجموعہ''صدف'' کی طرح یہ مجموعہ بھی صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔''جلتی بجھتی آنکھیں،،کا ابتدائیہ مختار صدیقی نے تحریر کیا؛ اردو غزل اور شہزاد احمد کی غزل گوئی پر تفصیلی اور تجزیاتی نظر ڈالنے کے بعد مختار صدیقی نے شہزاد احمد کی غزل پر یہ رائے دی:

''غزل نے گذشتہ صدیوں میں،شاعر کے محرم راز،شاعر کے ہمدم وہم نفس ہونے کے علاوہ، اس کے فکر ونظر،اس کے معلم اخلاق،اس کے ترجمان نظریات وتعصّبات کے جتنے رنگ بدلے ہیں' ان کی واضح عکاسی شہزاد کے ہاں موجود ہے، کیونکہ شہزاد کا بنیادی چشمہ فیضان،غزل کا مخصوص کردار اور غزل کی مخصوص شخصیت ہے''۔(ص۲۷۸)

مجموعہ''ادھ کھلا دریچہ''،''خالی آسمان''اور''بکھر جانے کی رت''میں غزلیں،نظمیں اور مختصر نظمیں موجود ہیں۔
شہزاد احمد کی نظمیں ان کی غزلوں کی مانند دلاویز ہیں اور غزل سے آگے کی معنوی منزل کو اپنی گرفت میں لینے کی قوت بھی رکھتی ہیں۔

ضمیر جعفری،سید،''نشاطِ تماشا''(فکاہی کلیات)،صفحات:۹۹۲،زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''نشاطِ تماشا'' سید ضمیر جعفری (مرحوم) کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی کلیات ہے جس میں ان کے آٹھ شعری مجموعے شامل ہیں۔

ضمیر جعفری نے ''ابتدائیہ'' میں ۱۹۹۰ء تک کا (کہا ہوا) کلام یکجا ہونے کی اطلاع دی ہے۔مجموعوں کے نام یہ ہیں:

ماضی الضمیر ،ولایتی زعفران،ضمیریات،ضمیر ظرافت، بے کتابے،شناخت پریڈ،دست واماں،روئے دریا سلسبیل وقصر دریا آتش۔

کلیات کا عنوان ''نشاطِ تماشا'' نظیری کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

مرا نشاطِ تماشا بس از وصالِ بہشت
بقیمت کم و بیش ثمر چہ کار مرا

سید ضمیر جعفری کے ہاں تلخی و ترشی کے بجائے ایک شگفتہ طنز ہے اور اسلوب مزاح، گھٹن اور بناوٹ کا شکار نہیں ہے بلکہ ہمیشہ آمد، بے تکلفی، ہمدردی اور خیر سگالی سے ایک رواں دواں کیفیت کا حامل رہا ہے۔

ضیاء جالندھری،''سرِ شام'' سے ''پس حرف'' تک،صفحات:۴۳۱،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''سرِشام'' سے ''پس حرف'' تک۔ضیاء جالندھری کا شعری کلیات ہے؛اس میں درج ذیل شعری مجموعے شامل ہیں:

سرِشام،نارسا،خواب سراب،پس حرف۔

چاروں مجموعوں میں نظمیں،غزلیں شامل ہیں۔مجموعہ ''سرِشام'' میں دو طویل نظمیں ''زمستاں کی شام'' اور ''سالمی'' اور آخری مجموعے ''پس حرف'' میں دو طویل تر نظمیں ''چاک'' اور ''ہم'' شامل ہیں۔ہر نظم/غزل کے آخر میں تاریخ تحریر درج ہے۔پہلے مجموعے کے پہلے گیت پر اکتوبر ۱۹۴۳ء اور آخری مجموعے کی آخری غزل پر ۲۔مئی ۱۹۹۲ء رقم کی گئی ہے۔

ضیاء جالندھری کی نظم جدید اردو نظم کا اہم حوالہ ہے۔ان کی نظمیں نئے اور متنوع موضوعات، پرتاثیر بیان، دلاویز امیجری، المیاتی فضا اور رجائی رویے و لہجے کے باعث ان کی تخلیقی انفرادیت کو محکم کرتی ہیں۔

ضیاء جالندھری کی غزل میں روایت کا رس لفظوں میں سرایت کیے ہوئے ہے لیکن معنیاتی سطح پر ان کی غزل ان کی نظم کی طرح متنوع پرتیں اور وسعتیں رکھتی ہے۔اردو غزل کو ضیاء جالندھری کی غزل سے متعدد نئے زاویے اور ذائقے حاصل ہوئے ہیں۔

طاہر سعید ہارون،ڈاکٹر،''سحر کی پہلی کرن''،صفحات:۱۴۷،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''سحر کی پہلی کرن'' ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ڈاکٹر طاہر سعید ہارون بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں روایت کی گرفت موجود ہونے کے باوجود ان کے مضامین اور آہنگ نئے ہیں۔نظموں میں ناصحانہ رویہ کسی حد تک بڑھا ہوا ہے۔کتاب کے پس سرورق پر اصغر ندیم سید کی رائے درج ہے؛ چند فقرے ملاحظہ ہوں:

''طاہر سعید ہارون ایک فطری شاعر ہیں اور انہوں نے اپنے ہنر کو سہل ممتنع کے ذریعے ثابت کیا ہے۔ان کی شاعری میں کئی لہریں اور کئی دھارے بیک وقت کروٹیں لیتے ہوئے محسوس ہوتے

ہیں... انہوں نے جو کچھ کہا فطری اور تخلیقی مطالبے پر کہا ہے''۔(پس سرورق)

طاہر سعید ہارون، ڈاکٹر، ''من موج'' (دوہے)، صفحات: ۱۲۸، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''من موج'' ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے دوہوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

''من موج'' کے دوہے واقعی من کی موج کو تخلیقی طور پر مجسم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے دوہے ''لحن'' تو پرانا ہی رکھتے ہیں لیکن موضوعات اور لفظیات بالکل نئی لیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مختصر دیباچے بعنوان ''پہلا سر'' میں لکھتے ہیں:

> ''پاکستان بننے کے بعد دوہوں میں اردو الفاظ کا سرایت کر جانا ایک قدرتی امر تھا خصوصاً حمدیہ اور نعتیہ دوہوں میں۔ ہندی زبان سے نابلد ہونے کے سبب عوام الناس میں دوہے کی مقبولیت قائم رکھنے کے لیے یہ ارتقا ناگزیر تھا۔ گیت کی طرح دوہے میں بھی اردو الفاظ کا ادغام میرے نزدیک قابل مذمت نہیں بلکہ خوش آئند ہے''۔(ص ۷)

''من موج'' کا پیش لفظ ڈاکٹر سلیم اختر نے ''دوہا نگری کا کوی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔

عابد علی عابد، سید، ''میں کبھی غزل نہ کہتا''، صفحات: ۴۰۰، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

''میں کبھی غزل نہ کہتا'' سید عابد علی عابد کا شعری کلیات ہے،اس میں ان کے دو شعری مجموعے شامل ہیں: شب نگار بنداں، بریشم عود۔ کلیات کا پیش لفظ سید مینو چہر نے لکھا جس پر تاریخ تحریر ۵ مئی ۱۹۹۲ء درج ہے؛ اس پیش لفظ میں سید عابد علی عابد کی مشکل پسندی اور روایت پرستی کے حوالے سے کی جانے والی باتوں کو کلام عابد کی روح سے بے خبری کا شاخسانہ کہا گیا ہے۔ مجموعہ شب نگار بنداں میں سید عابد علی عابد کا ۱۹۵۴ء سے پہلے کا کلام اور ''بریشم عود'' میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیان میں کہی گئی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ شب نگار بنداں کا پیش لفظ محمود نظامی نے لکھا تھا جس پر تاریخ تحریر ۱۷۔ نومبر ۱۹۵۴ء درج ہے۔ مرزا ادیب نے ''پیش لفظ سے پہلے'' کے عنوان سے اپنے تاثرات کا اظہار نہایت اختصار سے کیا ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں، مسلسل غزلیں، نظمیں، رباعیات اور ساقی نامے شامل ہیں۔

''بریشم عود'' کا پیش لفظ یوسف کامران کا لکھا ہوا ہے؛ وہ عابد علی عابد کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''ان کے ہاں بیشتر غزلوں میں ایک فضا، ایک بڑھتا ہوا تاثر، ایک پھیلتا ہوا تصور، ایک جولاں خیال کا عالم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بیشتر غزلوں کو نظم کہیے اور ہر شعر کے مزاج اور تیور دیکھیے تو ٹھیٹ غزل اور ایسی غزل جس پر عابد صاحب کی اپنی چھاپ بھی موجود اور ثقہ تغزل کی مہر بھی ثبت۔ نظموں میں بھی یہی بات کہ تسلسل خیال اور فکر مربوط کے ساتھ غزل کی سی چاشنی بھی اور زبان بھی''۔(ص: ۲۸۲، ۲۸۳)

''کبھی غزل نہ کہتا'' کے فلیپ پر منظور الٰہی کی رائے ہے جس پر تاریخ تحریر ۱۰۔جنوری ۱۹۹۳ء درج ہے۔

فہمیدہ ریاض، ''میں مٹی کی عورت ہوں''، صفحات: ۴۳۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

''میں مٹی کی عورت ہوں''۔فہمیدہ ریاض کی شعری کلیات ہے؛ اس میں درج ذیل مجموعے (مکمل صورت میں) موجود ہیں: پتھر کی زبان، بدن دریدہ، دھوپ، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟، ہمرکاب۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے درج ہے؛ وہ لکھتے ہیں:

''فہمیدہ ریاض ملایت، جبر اور گھٹن کی پیدا کردہ ذہنی پسماندگی کی فضا میں تخلیقی سفر طے کر رہی ہے۔ پاکستانی مردوں کے تنگ نظر معاشرہ میں فہمیدہ ریاض اپنی نسوانیت سے خوفزدہ ہونے کے برعکس اسی کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنا کر اپنی شرائط پر زندگی بسر کر رہی ہے جو کہ بذات خود بہت بڑا اجہاد ہے۔

فہمیدہ ریاض کا باغیانہ لہجہ فیشن کی بنا پر نہیں کہ یہ شعور حیات کے ساتھ ساتھ شعار زیست بھی ہے''۔

کلیات میں شامل مجموعہ ''دھوپ'' کا دیباچہ ''آمنے سامنے'' کے عنوان سے فہمیدہ ریاض نے لکھا ہے۔ دیباچے میں انہوں نے نظموں کے موضوعات اور زبان کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے؛ لکھتی ہیں:

''دیکھنے میں دھوپ'' کی نظموں کے کئی رخ ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان متعدد پہلوؤں کی وحدانیت کو صحیح معنوں میں محسوس کیا جا سکے۔ ادب میں داخلی اور خارجی موضوعات کی حد بندیوں کا رجحان عام ہے۔لیکن کیا اندرون ذات خود خارج کا ڈھالا ہوا پیکر نہیں؟ درحقیقت خارج اور اندرون ذات کی حد فاصل مسلسل متحرک ہے.... دھوپ کی نظموں اور گیتوں کی زبان کٹھن نہیں، پاکستان میں مروج قومی زبان سے ذرا مختلف ہے''۔(ص ۲۱۸،۲۱۹)

قتیل شفائی، ''رنگ۔خوشبو۔روشنی''، (تین جلدوں میں)، جلد اول: ''نظمیں''، صفحات: ۲۸۷، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۲ء

جلد دوم: ''کلیات گیت''، صفحات: ۴۱۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

جلد سوم: ''کلیات غزلیں''، صفحات: ۸۳۸، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''رنگ۔خوشبو۔روشنی''۔قتیل شفائی کی تین جلدوں پر مشتمل کلیات ہے۔ جسے ان کے چودہ شعری مجموعوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

جلد اول ''نظمیں''، میں قتیل شفائی کے درج ذیل آٹھ مجموعوں میں شامل تمام نظمیں موجود ہیں۔

گجر، جل ترنگ، روزن، مطربہ، چھتنار، اموختہ، برگد، سمندر میں سیڑھی۔

(اتفاقاً یا سہواً کلیات نظم میں ص ۲۹۶، ۲۹۷ پر ایک غزل بھی درج ہے)

قتیل شفائی کی نظموں میں ان کی غزل گوئی اور گیت نگاری کے واضح اثرات موجود ہیں لیکن ایک خاص نوعیت کی انفرادیت اور ایک بے ساختہ لہجہ ہر نظم میں اپنا نقش قائم کر کے نظم کو غزل اور گیت سے مختلف بنا رہا ہے۔ قتیل شفائی کی نظمیں رومان، حسن پرستی، قومی و معاشرتی مسائل و مصائب اور ذاتی دکھوں اور فکری اضطراب سے عبارت ہیں۔ چند اہم نظموں کے عنوانات یہ ہیں:

ہرجائی، کھنڈر، شمع انجمن، جشن آزادی، ایک موت، ایک برات، اوقاف ایکٹ، اندھے خواب، اے جنگ بازو!، فرار کی پہلی رات، خون کی دستک، سمندر میں سیڑھی۔

جلد دوم ''کلیات گیت''، میں قتیل شفائی کے درج ذیل مجموعوں کے گیت شامل ہیں: گھنگھرو، جھومر، ہریالی۔

قتیل شفائی کا بنیادی شعری رجحان اور تخلیقی احساس گیت کی جانب ہی تھا؛ گیت کا آہنگ کبھی ان کی غزل، کبھی نظم اور کبھی گیت کی (اصل ہیئت) میں ہویدا ہوتا ہے۔ قتیل شفائی کے گیت تاثیر، کشادگی، نفاست، ادبیت اور سرگوشی کی ایک میٹھی سی کیفیت کے حامل ہیں؛ یہ سننے میں بھی اچھے لگتے ہیں اور پڑھنے میں بھی۔

''رنگ۔خوشبو۔روشنی'' کی جلد سوم ''کلیات غزلیں''، میں قتیل شفائی کے درج ذیل مجموعوں کی غزلیں شامل ہیں:

گجر، جلترنگ، روزن، پیراہن، گفتگو، آموختہ، برگد، ابابیل۔

قتیل شفائی کی غزلیں سادہ طرز بیان میں رنگین محسوسات کی دل پذیر تجسیم ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کی نظموں کی طرح گیت کے رنگ اور آہنگ موجود ہیں۔ ان کی غزل میں عاشق، درویش، ناصح، رند اور آوارہ منش شخص کی خصوصیات بیک وقت جلوہ گر ہوتی ہیں گویا شاعر کا باطن وحدت میں نہیں کثرت میں اپنا اظہار کرنا پسند کر رہا ہے۔

قبل ازیں سنگ میل پبلی کیشنز نے قتیل شفائی کے شعری مجموعے الگ الگ کتابی صورتوں میں بھی شائع کیے تھے مثلاً:

گھنگھرو، صفحات: ۲۲۴، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

برگد، صفحات: ۲۸۸، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۵ء

''گھنگھرو''، صرف گیتوں کا مجموعہ ہے؛ اس کے پس سرورق پر احمد فراز، ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور پروفیسر محمد حسن کی آرا درج ہیں؛ ڈاکٹر راہی معصوم رضا لکھتے ہیں:

''شاعری میں مصوری اور موسیقی کو تحلیل کرنے کا کام تو تمام قدیم و جدید اچھے شاعروں نے کیا۔
مگر قتیل کے سوا رقص کو کسی نے شاعری میں تحلیل کرنے کی کوشش نہیں کی''۔

قیوم نظر، ''قلب ونظر کے سلسلے''، صفحات: ۹۷۶، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

''قلب ونظر کے سلسلے'' قیوم نظر کی شعری کلیات ہے۔اس میں قیوم نظر کی نعتیں، نظمیں، غزلیں، گیت اور پنجابی کلام شامل ہے۔ کلیات کے آخر میں ''کتاب اور صاحب کتاب'' کے عنوان سے ریاض احمد کا ایک بھرپور مضمون شامل ہے۔ ریاض احمد، قیوم نظر کوخراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قیوم نظر نے بھرپور فنی اور مجلسی زندگی گزاری ہے۔اس کا سرمایہ شعروسخن ہر لحاظ سے معتبر ہے۔ فنی اُپج، تخلیقی سرگرمی، اظہار و بیان کی روش اپنی اپنی جگہ تحسین کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس نے نظم، غزل، گیت، نعت اور انگریزی زبان سے تراجم پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ جدید نظم کے ان پیش روؤں میں سے ہے جن کا نام خالد، راشد، فیض اور میراجی کے ساتھ یا ان کے فوراً بعد لیا جاتا ہے.... قیوم نظر کا دھیما جذباتی اسلوب اور یہی دھیما اظہارِ بیان کا سلیقہ اسے ہم عصروں سے الگ مقام دلاتا ہے''۔(ص۹۷۴)

کلیات کا فلیپ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے۔کلیات درج ذیل حصوں میں تقسیم ہے:

نعتیں، گیت، غزلیں، (پنجابی) نظماں، غزلاں، (اردو) نظمیں۔عموماً تخلیقات کے ساتھ تاریخ تحریر بھی درج ہے۔

قیوم نظر کی کلیات کی اشاعت کو ادبی حلقوں نے تحسین کی نظر سے دیکھا تھا۔

کشور ناہید،''خیالی شخص سے مقابلہ''،صفحات:۱۵۲، زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۲ء

''خیالی شخص سے مقابلہ'' نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے اور کشور ناہید کی شاعری میں بڑھتے ہوئے مزاحمتی لہجے کا غماز ہے۔کشور ناہید ہر نوعیت کے جور اور جبر سے مقابلے کی کیفیت میں ہیں۔اس مجموعے کی نظموں کا موضوعاتی افق خاصا وسیع ہے۔ درج ذیل چند نظموں کے عنوانات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

بے انت یاترا، قوس قزح زرد ہے، پرچھائیں اور میں مکالمہ کرتے ہیں، خیالی شخص سے مقابلہ، بارھویں ترمیم میں ترمیم، نظریہ ضرورت کے دوران پیدا ہونے والے بچوں کا المیہ، سپیڈی ٹرائل، بیسویں صدی کا اختتامی نوحہ، جلتے دمشق و بصرہ کی بجھتی آوازیں، گرتی ہوئی دیوار برلن گنٹر گراس اور میں، اپنی جیسی عورت وزیراعظم سے مکالمہ۔

کشور ناہید کی غزلوں میں بھی نظموں کی طرح کا موضوعاتی تنوع ہے لیکن غزل کی روایتی جاذبیت برقرار ہے۔

کشور ناہید،''دشتِ قیس میں لیلیٰ''،صفحات:۱۳۱۱، زیرنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''دشتِ قیس میں لیلیٰ''، کشور ناہید کی پہلی شعری کلیات ''فتنہ سامانی دل'' کی توسیع شدہ صورت ہے۔پہلی کلیات میں پانچ شعری مجموعے: لب گویا، بے نام مسافت، نظمیں، گلیاں، دھوپ، دروازے، ملامتوں کے درمیان شامل تھے؛ زیرنظر کلیات دوم میں سابق کے

ساتھ نئے مجموعے بھی شریک ہیں۔ ''دشتِ قیس میں لیلیٰ'' میں درج مجموعوں کی تعداد آٹھ ہے اوران کے نام یہ ہیں:

لب گویا، بے نام مسافت، نظمیں، گلیاں، دھوپ، دروازے، ملامتوں کے درمیان، سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ، خیالی شخص سے مقابلہ، میں پہلے جنم میں رات تھی۔ (اس کلیات کا انتساب اعجاز احمد کے نام ان الفاظ میں ہے: جواں مرگ اعجاز احمد کے نام جو ہم ادیبوں کے تعلق کا سنگ میل تھا)

''دشت قیس میں لیلیٰ'' کشور ناہید کی باطنی مسافرت اور مزاحمتی تفکر و تحرک کی تخلیقی اور جمالیاتی دستاویز ہے۔ کشور ناہید نے غزل، نظم اور نثری نظم میں اپنی ذات اور زمانے کو منکشف بھی کیا ہے اور آئینہ بھی دکھایا ہے۔

کشور ناہید، ''سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ''، صفحات:۱۸۹، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

''سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ'' نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں بھی کشور ناہید خاموش زمینوں، سہمی عورتوں، لرزتے ہونٹوں اور الزام گرفتہ دلوں کے تشخص کی بحالی کے لیے شعری جہاد میں مصروف ہیں؛ ان کی نظم تو ہے ہی ایک رزمیہ لیکن غزل بھی ہرگز بزمیہ نہیں۔ چند نظموں کے عنوان درج ذیل ہیں:

تھکان سے پہلے کا مکالمہ، پیدائش سے پہلے کی دعا، اپنے قتل کا اعتراف، خاموش زمینوں کی شناخت، اے میرے الزام گرفتہ، خواب پہ جاگنے کا الزام، سورج کو بارش سے بچاؤ، ہم گنہگار عورتیں، جلتے ہونٹوں کا رزمیہ۔

کشور ناہید، ''فتنہ سامانی دل''، صفحات:۸۹۶، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۸۵ء

''فتنہ سامانی دل'' کشور ناہید کی شعری کلیات ہے اس میں درج ذیل پانچ شعری مجموعے ہیں:

''لب گویا''، ''بے نام مسافت''، ''نظمیں''، ''گلیاں''، ''دھوپ''، ''دروازے''، ''ملامتوں کے درمیان''۔

آغاز میں مختار صدیقی کا لکھا ہوا حرف دگر ہے جو ''لب گویا'' کی غزلوں کے حوالے سے ہے۔ ''لب گویا'' میں صرف غزلیں اور دوہے ہیں۔ ''بے نام مسافت'' میں صرف نظمیں ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''نظمیں'' دیس بدیس کی نظموں کے نثری تراجم پر مشتمل ہے، ہر شاعر کے ترجمے سے پہلے اس کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔ چوتھے مجموعے ''گلیاں'' دھوپ، دروازے'' میں غزلیں، نظمیں اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ پانچویں مجموعے ''ملامتوں کے درمیان'' میں غزلیں، ایک طویل نظم، دو نظمیں، کئی نثری نظمیں اور ''گنارا ایکلوف'' کی نظموں کے تراجم موجود ہیں۔ کشور ناہید کی شاعری وسعت، گہرائی اور تنوع رکھتی ہے، خصوصاً تیسری دنیا کی عورت کے غم اور عزم کو پوری شدت اور حدت سے پیش کرنے پر قادر ہے۔

کشور ناہید، ''لب گویا''، صفحات:۱۸۲، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۱ء

''لب گویا'' کشور ناہید کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں روایت سے جڑی ہوئی بھی ہیں اور ایک نئی روایت کے لیے راستہ بھی ہموار کر رہی ہیں۔ ان غزلوں میں بقول مختار صدیقی:

''ساری توجہ اس بات پر ہے کہ اپنے شعور اور دیگراں کے شعور کے سلسلے میں جو کچھ واردات ہیں جو کچھ بھی دیکھا اور جھیلا ہے، جو کچھ بھی تفکرات یا تردد ہیں جو کچھ بھی دل و ذہن پر متجلی ہوا ہے، اس کے لیے ایک مخصوص پیرایہ اختیار کیا جائے''۔ (دیباچہ بعنوان ''حرفِ دگر''، ص ۷)

کشور ناہید، ''میں پہلے جنم میں رات تھی''، صفحات: ۱۱۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

''میں پہلے جنم میں رات تھی''۔ کشور ناہید کی نثری نظموں، غزلوں، آزاد نظموں اور چند شعری تراجم پر مبنی مجموعہ ہے۔

۱۵ نثری نظموں میں سے چند کے عنوان یہ ہیں: چلو کسی اور کانفرنس میں چلتے ہیں، میں پہلے جنم میں رات تھی، تعلق کی بے سمتی، خداؤں سے کہہ دو۔ ۲۳ آزاد نظموں میں سے چند نظموں کے عنوانات: حاکم زادی۔ تو مجھ جیسی، عدل، عدالت، رات اندھیری، ۲۰ اکتوبر (مرتضیٰ کے قتل پر)، بوری میں بند لاش میری تھی، پریس فوٹوگرافر اور ڈیانہ، عدلیہ دری، فروکش ہے عدالت، خواب میں سفر، طالبان سے قبلہ رُو گفتگو۔ زیرِ نظر مجموعے میں صرف دو غزلیں شامل ہیں۔

تراجم کے حصے میں: جان مشکنری (جنوبی افریقہ)، رابرٹ فراسٹ، چانگ سوکو (جنوبی کوریا)، کی نظموں کے تراجم شامل ہیں (آخر الذکر کی چار نظمیں ترجمہ کی گئی ہیں)

اس شعری مجموعے میں بھی کشور ناہید کا تخلیقی وفور، مزاحمتی شدت وحمیت اور موضوعاتی و اسلوبیاتی تنوع موجود ہے۔

مظفر وارثی، ''ستاروں کی آبجو''، صفحات: ۱۳۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

''ستاروں کی آبجو''۔ مظفر وارثی کے قطعات پر مبنی مجموعہ ہے؛ اس مجموعے میں حمدیہ و نعتیہ قطعات بھی ہیں اور ادبی معاشرتی اور اصلاحی بھی۔ ان قطعات سے مظفر وارثی کے مختلف موضوعات پر تاثرات و احساسات فن کے پیکر میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ فلیپ پر نیاز احمد کی رائے درج ہے جس میں انہوں نے مظفر وارثی کو ہر معرکہ سخن کا منفرد سپاہی قرار دیا ہے۔

منو بھائی، (مترجم)، ''فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی نظمیں)''، صفحات: ۱۸۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''فلسطین فلسطین'' عربی کے مقبول عام انقلابی شاعر اور فلسطینی مفکر و مجاہد محمود درویش کی نظموں کا ترجمہ ہے۔ منو بھائی وطن میں ''بے وطن لوگوں کا شاعر۔ محمود درویش'' کے عنوان سے اپنے مضمون/ مقدمے میں لکھتے ہیں:

''درویش کی پہلی نظموں کا پہلا مجموعہ ''پروں کے بغیر پرندے'' ۱۹۶۰ء میں چھپا جب ان کی عمر

اٹھارہ سال تھی۔ دوسرا مجموعہ ''زیتون کے پتے'' ۱۹۶۴ء میں، تیسرا مجموعہ ''فلسطین سے ایک عاشق'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد ''آخر شب'' کے نام سے نظموں کا مجموعہ ۱۹۶۷ء میں چھپا.... اسرائیل کے صیہونی دانشور اگر محمود درویش کو تنظیم آزادی فلسطین سے بھی زیادہ خطرناک دشمن سمجھتے ہیں تو کچھ غلط نہیں سمجھتے۔ کیونکہ عرب دنیا کے اس مقبول ترین شاعر کا کلام فلسطینی مہاجروں اور مجاہدوں کے لیے ان کے کیمپوں، خندقوں اور مورچوں میں جنگی پرچم اور جنگی ترانوں کی حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے''۔ (ص ۱۱،۱۲)

زیرنظر مجموعے میں شامل چند نظموں کے عنوانات یہ ہیں: سپاہی جس نے سفید پھولوں کا خواب دیکھا، انقلابی اور شاعر، زیتون کے جھنڈ سے ایک آواز، گلاب اور لغت، قومی ترانے کے خالی ہاتھ، پھانسی اور نکٹائی، زمین ہم پر تنگ ہو رہی ہے، وہ مجھے مردہ دیکھنا چاہتے ہیں۔
منو بھائی کا ترجمہ، محبت، دیانت اور سلاست کی ایک عمدہ مثال ہے۔

میر تقی میر، ''کلیات میر''، صفحات: ۹۷۶ + ۲۷ = ۱۰۰۳، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

اردو کے پہلے عظیم شاعر میر تقی میر کی زیرنظر کلیات مولانا عبدالباری آسی نے مرتب کی اور اسے پہلی بار مطبع منشی نولکشور لکھنو نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ مولانا عبدالباری آسی نے ہی کلیات کا ایک مبسوط مقدمہ لکھا اور کلیات میر کی فرہنگ بھی مرتب کی جو کہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا عبدالباری آسی نے تمام دستیاب قلمی اور سابق مطبوعہ نسخوں سے متن کی تصحیح کا اہتمام کیا اور خاصی حد تک اس مشکل کام کو انجام دینے میں کامیاب رہے، تصحیح متن کے سلسلے میں مولانا آسی کو مولوی سید جعفر علی (فاضل دیوبند) کی معاونت بھی حاصل رہی۔

اس کلیات میں میر تقی میر کی غزلوں کے چھ دیوان کے علاوہ فردیات، تضمین، مثلث، مخمس، رباعیات، قطعات، نعت و منقبت اور مثنویاں شامل ہیں۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے کلیات کی پرانی کتابت کو برقرار رکھنے کے لیے اس کا عکس چھپا ہے۔ اس طرح کلیات کی وہ عبارت ہمارے سامنے ہے جس کی تصحیح کتابت خود مولانا آسی نے کی تھی۔

میراجی، ''کلیات میراجی''، (ترمیم اور اضافوں کے ساتھ) (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، صفحات: ۱۲۷۲، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

میراجی جدید اردو نظم کا اہم ترین اور روشن ترین حوالہ ہیں۔ ان کا کلام رسالوں، بیاضوں، نجی کتب خانوں میں بکھرا ہوا تھا، ڈاکٹر جمیل جالبی نے کم و بیش بیس سال کے عرصے میں اس کلام کو جمع کر کے ''کلیات میراجی'' کو مرتب و مدون کیا۔

کلیات میں میراجی کی ۱۳۸ نظمیں، ۱۸ غزلیں اور ۲۹ منظوم تراجم شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، میراجی کے ریزہ ریزہ کلام کی جمع آوری کے حوالے سے اپنے دیباچے (مرقوم: ۱۹۸۸ء) میں کہتے ہیں:

''اس کلیات میں میراجی کا وہ سارا کلام شامل ہے جو کتابی صورت میں اب تک شائع ہو چکا ہے

اور وہ سارا کلام بھی جو غیر مطبوعہ اور جناب اختر الایمان کے پاس تھا۔اس میں ''حلقہ چشم سیاہ'' نامی بیاض کا کلام بھی شامل ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس ہے.... اس کلیات میں وہ کلام بھی شامل ہے جو مختلف رسائل و جرائد کے صفحات پر بکھرا ہوا تھا۔اس کلیات میں کم و بیش کتابی صورت میں چھپے ہوئے کلام کے برابر وہ کلام شامل ہے جو پہلی بار ''کلیات میراجی'' میں شامل ہوا ہے۔ میں نے اس کلام کو ریزہ ریزہ جمع کیا ہے اور اس جمع آوری میں بیس سال کا عرصہ لگا ہے''۔(ص ۳۰)

زیرِ نظر ایڈیشن، کئی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے اور جمیل جالبی نے یہ عندیہ بھی دیا ہے کہ میراجی کا اگر مزید کلام دریافت اور بازیافت ہوا تو اسے بھی کلیات کے اگلے ایڈیشن میں شامل کر لیا جائے گا۔

ناصر زیدی، ''ڈوبتے چاند کا منظر''، صفحات:۱۱۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۷۷ء

''ڈوبتے چاند کا منظر''۔ناصر زیدی کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۷۶ء میں (گیارہ سو کی تعداد میں) شائع ہوا تھا،۱۹۷۷ء میں اس کا دوسرا (زیرِ نظر) ایڈیشن بھی گیارہ سو کی تعداد میں چھپا تھا۔ اس مجموعے کے فلیپ پر احسان دانش، قمر جمیل، احمد ہمیش، گوہر نوشاہی، ذکاء الرحمٰن، مسرت پراچہ اور ستار طاہر کی مختصر آرا درج ہیں۔احسان دانش لکھتے ہیں:''ناصر زیدی نسلِ نو کے نمائندہ غزل گو ہیں، ان کی جوانی، جوان تغزل کی تخلیق کر رہی ہے اور ہر آنے والا دن ان کی فکر کو زیادہ سے زیادہ روشن، خیال دے کر جا رہا ہے''۔

''ڈوبتے چاند کا منظر''۔کی غزلیں ناصر زیدی کے بنیادی شعری رویے اور آئندہ کی شعری پیش رفت کے امکانات کی ترجمان ہیں۔

وحید قریشی، ''نقدِ جاں''، صفحات:۹۷، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۶۸ء

''نقدِ جاں'' ڈاکٹر وحید قریشی کا پہلا شعری مجموعہ ہے؛ جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات، دوہے اور فارسی کلام شامل ہے۔ اولین مجموعہ کلام ہونے کے باوجود ڈاکٹر وحید قریشی کے کلام میں پختگی، احساس میں گہرائی اور فکر میں جدت و ندرت قاری کو چونکا دیتی ہے۔اس مجموعے کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا؛ پیش لفظ سے چند سطریں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کا یہ شعری مجموعہ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک نہایت قیمتی ضمیمہ ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تنقید کے تخلیقی پہلوؤں کا جواز بآسانی مل جاتا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری کو کچھ کم اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذات میں ڈوب کر اشعار کہے ہیں.... موضوعات کے ضمن میں بھی ڈاکٹر صاحب نے تنوع اور رنگا رنگی کا بہت خوب مظاہرہ کیا ہے۔ان کے ہاں دیہاتی زندگی کے پس منظر پر البیلی محبت کے نقوش بھی ابھرے ہیں، تاریخ اور تہذیب کے پس منظر پر فکر و وجدان کی

شوخ لکیریں بھی نمودار ہوئی ہیں اور انہوں نے آج کی ھاؤھو، شوریدہ سری اور تہذیب کے انحطاط آمیز اور زوال آمادہ مظاہر کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک خنک، میٹھی، سبک اور اثر انگیز زبان میں!''۔ (ص:۱۰، تاریخ تحریر: ۷۔ اپریل ۱۹۶۵ء)

کتاب کا معیارِ طباعت نہایت عمدہ ہے؛ ذوالفقار احمد کی بنائی ہوئی تصاویر کتاب کا حصہ ہیں۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ کاغذ اعلیٰ اور عبارت اغلاط سے پاک ہے۔ ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب سنگ میل کے آئندہ کے طباعتی معیار کی پیشن گوئی کر رہی ہے۔

یحییٰ امجد، (انتخاب و ترجمہ)، ''چینی شاعری''، صفحات: ۳۰۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

اس کتاب میں یحییٰ امجد نے چین کی تین ہزار سالہ شاعری کا انتخاب، ترجمہ اور شعرا کا تعارف و تجزیہ کلام پیش کیا ہے۔ اپنے پیش لفظ میں یحییٰ امجد نے قدیم اور جدید چینی شاعری کی خصوصیات کو اختصار سے پیش کیا ہے، ان کا تاثر یہ ہے: ''قدیم چینی شاعری بالغ نظر عوام کی شاندار تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ چین کی جدید شاعری انقلاب کے تجربے کی شاعری ہے'' (ص۱۰)

کتاب کے پہلے حصے میں کلاسیکی دور کے اہم ترین شعرا اور متفرق میں نسبتاً کم اہم شعرا کی نظموں کے ترجمے اور تعارف و تجزیہ شامل ہے؛ دوسرے حصے میں جدید شعرا اور متفرق میں کم اہم شاعروں کو نمائندگی دی گئی ہے۔

یوسف کامران، ''سفر تمام ہوا''، صفحات: ۱۰۹، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۴ء

''سفر تمام ہوا'' جواں مرگ شاعر یوسف کامران کا شعری مجموعہ ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ یوسف کامران تیز اور تلخ لہجے اور صاف و کھرے انداز میں اپنی ذات اور زمانے کے دکھوں کو تخلیقی سطح پر ظاہر کرتے ہیں اور موثر ابلاغ کے ذریعے قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔ ''سفر تمام ہوا'' میں منو بھائی کا مضمون ''اے یادِ یار۔ پھر ادھر اک بار دیکھنا اور کشور ناہید کا مضمون ''یا الٰہی مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو'' یوسف کامران کی بے وقت موت اور فکر و شخصیت کے حوالے سے شامل ہیں۔

سفر نامہ

آصف جیلانی، ''وسط ایشیائی آزادی، نئے چیلنج''، صفحات:۱۴۸، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''وسط ایشیائی آزادی، نئے چیلنج''۔ نو آزاد وسط ایشیائی مسلمان ریاستوں کا سفر نامہ ہے؛ آصف جیلانی نے ۱۹۹۲ء میں وسط ایشیا کا سفر کیا اور اپنی سفری یادداشتوں کو بی بی سی لندن کی اردو نشریات میں سلسلہ وار پیش کیا (زیر نظر سفر نامہ اس نشریاتی سلسلے کا کتابی روپ ہے)

آصف جیلانی نے اپنے سفر کے مشاہدات و تجربات کے ساتھ ساتھ وسط ایشیا کی تاریخ، جغرافیہ، سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد مسلم ریاستوں کی سیاسی و تہذیبی حالت کو دستاویزی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سفر نامے میں افسانوی و رومانی لہجہ اور رنگین واقعاتی پیرایہ مفقود ہے۔ یہ سفر نامہ وسط ایشیا کی نئی آزاد شخصیت کو دریافت کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سفر نامے کے چند ابواب کے عنوان درج ذیل ہیں:

پتھروں کا شہر، غالب محلّہ، از بک تہذیب نئے نرغے میں، بابر کی جنم بھومی، از خوب گراں خیز، وسط ایشیا کا کویت؟۔

آصف فرخی، ''شہر علامات''، صفحات:۲۷۶، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

''شہر علامات''، جرمنی کے شہر ''برلن'' کا سفر نامہ بھی ہے اور حضر نامہ بھی۔ آصف فرخی کو ۱۹۸۶ء میں برلن جانے کا موقع ملا؛ انہوں نے اپنا سفر اور قیام نامہ جولائی ۱۹۸۷ء تک تحریر کر لیا تھا۔ کتاب کے دیباچے (مرقوم: نومبر ۱۹۹۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آصف فرخی برلن گئے تو ''دیوار برلن'' کی صورت میں دو سیاسی و تہذیبی منطقوں کی تقسیم موجود تھی؛ اور ''دوسری جنگ عظیم کے مابعد اور سرد جنگ کی بے لفظ، مہیب علامات کا سایہ اس شہر پر بہت واضح تھا'' (ص ۷) آصف فرخی نے شہر کے یہی حالات اور کیفیتیں ملاحظہ اور محسوس کیں اور اس شہر کو اس کی پرت در پرت اور تہہ در تہہ کیفیات کے باعث شہر علامات قرار دیا۔ سفر نامے کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

آتش زیر پا، نسخہ برلن، برلن میں بے خواب، زندان سے دیوار تک، شہر علامات، بیاض برلن، سرگذشت برلن، دوسری جگہوں کا وقت، چھوڑی ہوئی منزل، برلن کو سلام۔

آصف فرخی کا سفر نامہ دیگر سفر ناموں سے مختلف ہے لیکن دلچسپ، دلاویز، اور خیال انگیز ہے؛ برلن کی پوری شخصیت اپنی باطنی گہرائی اور وسعت کے ساتھ مصنف کے تاثرات اور تفکرات سے آمیز ہو کر ''شہر علامات'' کی صورت اختیار کر لیتی ہے؛ قاری کے لیے یہ ''شہر علامات'' اجنبیت کے بجائے اپنائیت اور ابہام کی جگہ وضاحت رکھتا ہے۔

اختر مموزکا، محمد، ''پیرس ۲۰۵ کلومیٹر، صفحات:۵۰۳، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

مصنف نے اپنے پیش لفظ (مرقوم: ۱۴ جون ۱۹۸۲ء) میں اپنا اور اپنے سیاحت نامے کا تعارف کرایا ہے، سفر نامے کے متعلق بتاتے ہیں:

''پیرس ۲۰۵ کلومیٹر'' سفر ناموں کی بھیڑ میں ایک اور سفر نامے کا اضافہ نہیں بلکہ یہ سیاحت نامہ، ۴۱ ڈالر میں ۲۵ ہزار کلومیٹر کی مسافتوں، ۱۸ دیسوں کی سیاحتوں، ۸۴۷ اجنبیوں سے ملاقاتوں اور چند بیبیوں سے چاہتوں کا چشم دید گواہ ہے''۔(ص ۵)

پیرس ۲۰۵ کا انداز ہلکا پھلکا اور مزاج تفریحی ہے، عام قارئین کے لیے اس میں دلچسپی کے کئی سامان موجود ہیں۔

اختر ممونکا، ''سفر تین درویشوں کا''، صفحات: ۲۴۶، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''سفر تین درویشوں کا'' سات ملکوں کا سفر نامہ ہے، یہ سفر مصنف نے اپنے دو دوستوں، سید محمد غالب اور صلاح الدین لغاری کے ساتھ پی آئی اے کی ملازمت کے دوران میں کیے۔ جن ملکوں کے سفر کیے گئے؛ ان کے نام ہی سفر نامے کے ابواب ہیں: تھائی لینڈ، سنگاپور، ملیشیا، انڈونیشیا، آسٹریلیا، جاپان، فلپائینز۔

زیر نظر سفر نامہ: ان خطوں کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ پر لطف واقعات، شخصی حلیوں، مسافروں کی رنگین سرگرمیوں، فکاہی رنگوں اور بے باک بیانوں سے مزین ہے۔

اشفاق احمد، ''سفر در سفر''، صفحات: ۲۵۹، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

''سفر در سفر'' ایک مختلف اور منفرد سفر نامہ ہے جو پہلی غالب پبلشرز لاہور نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان سفر در سفر اس لیے ہے کہ:

''مصنف جھیل سیف الملوک پر جاتے ہوئے بیک وقت دو سفر طے کرتا ہے۔ ایک جسمانی اور دوسرا ذہنی اور دونوں کا احوال بڑی چابک دستی اور فنکارانہ مہارت سے بیان کرتا ہے۔

''سفر در سفر'' میں ماضی کی جانب مصنف کی پیش قدمی سے سفر نامہ صرف جغرافیائی حالات کا قصہ نہیں رہا بلکہ رفتگاں کی یادوں اور باتوں کے طفیل اس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسن پیدا ہو گیا ہے.... اشفاق احمد کے سفر نامے ہمہ گیریت کے حامل ہیں اور ان کے اسلوب کی خوشنمائی سفر ناموں کو ان کی شخصیت کی مانند مرنجاں مرنج بنا دیتی ہے''۔

(منور مقبول عثمانی، ''اشفاق احمد، فن اور شخصیت''، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، غیر مطبوعہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، سن ۱۹۸۹ء، صفحہ ۴۹، ۱۷۸)

امجد اسلام امجد، ''ریشم ریشم''، صفحات:۱۷۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

''ریشم ریشم'' امجد اسلام امجد کا دوسرا سفر نامہ ہے؛ پہلا ''شہر در شہر'' تھا۔ ریشم ریشم چین کے اس سفر کی روداد ہے جو مصنف نے پاکستانی ادیبوں کے ہمراہ ۱۹۹۱ء میں کیا تھا۔ اس سفر نامے کو افسانوی یا فکاہی انداز سے دلچسپ بنانے کے بجائے چین کی تہذیبی روح، بے پناہ ترقی پذیری اور پاک چین دوستی کی بھرپور اور فنکارانہ عکاسی سے دلاویز بنایا گیا ہے۔ احباب کے تذکرے اور ان کے شخصی تجزیے بھی سفر نامے میں رونق پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ ''ریشم ریشم'' ایک شاعر، ڈراما نگار اور کالم نگار کا مشاہداتی بیان ہے۔ سو تینوں جہتوں کی خوبیاں سفر نامے میں موجود ہیں۔ سفر نامے کے تین ابواب ہیں: چین میں پندرہ دن، ہانگ چو، شنگھائی۔

کتاب کا مختصر دیباچہ چین کہانی کے نام سے ہے اور انتساب: پاک چین دوستی کے نام ہے۔

امجد ثاقب، ''گوتم کے دیس میں''، صفحات ۲۱۴، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''گوتم کے دیس میں'' امجد ثاقب کا سفر نامہ نیپال ہے۔ یہ سفر نامہ عام سفر ناموں سے مختلف ہے، اس میں مصنف نے نیپال کی تہذیبی روح اور ثقافتی باطن کو ہویدا کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ، جغرافیہ اور فلسفے کو بھی بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف کے تخلیقی اسلوب نے دستاویزی مواد کو جمالیاتی مطالعہ بنا دیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے مختصر دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''امجد ثاقب نے جس طور نیپال کو غربت، دکھ اور مہاتما بدھ سے منطبق کیا ہے، یہ زاویہ یقیناً ہر اس شخص سے جدا ہے جو آج تک نیپال گیا ہے.... اگرچہ میں نے بھی نیپال نگری میں چند روز قیام کیا تھا اور اس کا احوال لکھا تھا۔ ثاقب کے ''گوتم کے دیس میں'' پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمارا احوال تو سرسری تھا اور اصل نیپال تو اب ان کی آنکھوں سے دیکھا''۔ (تاریخ تحریر: ۳۰ جنوری ۲۰۰۱ء)

کتاب کے فلیپ پر عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کی آرا ہیں۔

انتظار حسین، ''زمین اور فلک اور''، صفحات: ۱۷۶، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

اس مجموعے میں ہندوستان کے تین سفروں کا احوال ہے۔ کتاب کے آخر میں انتظار حسین نے ''معذرت کا ڈیڑھ حرف'' کے عنوان سے اپنے سفروں کی تقریب یہ بیان کی:

> ''مارچ اپریل کے مہینوں میں پہلا حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے عرس کی تقریب میں ۷۸ء میں، دوسرا جامعہ ملیہ کے مختصر افسانہ سیمینار کی تقریب سے ۸۰ء میں، تیسرا جامعہ ملیہ کے میر سیمینار کی تقریب سے''۔ (ص ۱۷۱)

ہندوستان کے سفر کے حوالے سے ان کا تجزیہ اور ترکیب درست نظر آتی ہے، کہتے ہیں:

''جب سفر کسی ایسے دیس کا درپیش ہو جس کے سلسلے میں آپ کے کچھ ذہنی تحفظات ہوں۔ ایسی صورت میں مسافر کبھی کبھی بالکل ہی خالی ہاتھ واپس آتا ہے۔ اس باب میں یہ کم سفر یہ کہتا ہے کہ اے مسافر عزیز! اپنے سفر کو اپنی ذہنی تحفظات سے رائیگاں مت کر۔ حالتِ سفر میں دل کو کشادہ رکھ اور ذہن کے دریچوں کو کھلا چھوڑ دے۔ ہر بستی کی اپنی ہوا اور اپنی مہک ہوتی ہے۔.... اور ہر سفر کے اپنے رنج ہوتے ہیں اور اپنی صلاحیتیں''۔(ص ۱۷۳)

زیرِ نظر سفر نامے میں اسلوب پر کہیں افسانہ، کہیں ادبی کالم، اور کہیں رپورتاژ کے انداز حاوی ہیں۔

انتظار حسین، ''نئے شہر پرانی بستیاں''، صفحات: ۱۶۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

''نئے شہر پرانی بستیاں'' انتظار حسین کے سفری یادداشتوں پر مبنی سات مضامین ہیں۔ یہ مضامین عام سفر ناموں کے انداز سے ہٹ کر لکھے گئے اور انتظار حسین نے اپنے مخصوص اسلوب میں مختلف بستیوں کے احوال اور اپنے تاثرات کو پیش کیا ہے۔

''نئے شہر پرانی بستیاں'' کے پہلے دو باب ''نئے شہر میں پرانا آدمی'' اور ''نیا تیرتھ'' انگلستان کے حوالے سے ہیں؛ ''جمنا سے کاویری تک'' کا باب ان کی ہندیاترا ہے؛ ''ایک پھیرا ایران کا'' ایران اور ''مندروں کے نگر میں'' کھٹمنڈو کے حوالے سے ہیں؛ اگلا باب: ''اردو دیار ہند میں'' ہے اور آخری باب: ''پورب گئے پچھّم گئے'' ناروے کی سیاحت کا ثمر ہے۔

انتظار حسین کے سفر ناموں میں ماضی کی سیاحت بھی آمیز ہو جاتی ہے اور یوں سفر ناموں کو ایک نیا بعد مل جاتا ہے؛ افسانے کا حسن اور داستان کا ذائقہ اس پر مستزاد ہے۔

اے۔ بی۔ اشرف، ڈاکٹر، ''ذوق دشت نوردی''، صفحات: ۳۱۶، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

''ذوق دشت نوردی'' ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف کا کئی ممالک پر مبنی سفر نامہ ہے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں غیر ضروری تفاصیل، غیر متعلق افسانوی بیانات، دعوتوں کے ذکر اور ملنے جلنے والوں کی اسم شماری اور سراپا نگاری سے اجتناب کیا ہے جس کے نتیجے میں وہ ۳۱۶ صفحے کی کتاب میں ۱۳ جگہوں کا سیاحتی نگار خانہ سجانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

''ذوق دشت نوردی'' میں درج ذیل ممالک کا منظر نامہ اور ان کے حوالے سے مصنف کا تاثر نامہ موجود ہے:

برطانیہ، ترکی، یونان، یوگوسلاویہ، اٹلی، آسٹریا، چیکوسلاویکیہ، ہنگری، بلغاریہ، شام، اردن، عراق، مصر۔

اپنی سفر نامہ نگاری کے حوالے سے اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں:

''میں کوئی پیشہ ور سفر نامہ نگار نہیں ہوں۔ نہ افسانہ طراز ہوں.... ان ملکوں کی سیر کے بعد سوچا کہ

اپنے تجربوں میں دوسروں کو شریک نہ کرنا بخل ہے.... زیب داستان کے لیے بڑھا کر میں نے دلچسپی کا سامان پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بس یہ کچھ یادداشتیں ہیں، کچھ نوٹس ہیں، کچھ معلومات ہیں.... میں نے کوئی مربوط اور مسلسل سفر نامہ نہیں لکھا بلکہ ہر ملک کی یادداشتیں الگ الگ لکھی ہیں اور ہر ملک کی سیر کا الگ عنوان قائم کیا ہے''۔ (دیباچہ: ''عبارت مختصر'' ص:۱۱، تاریخ تحریر: یکم جنوری۱۹۹۱ء)

ڈاکٹر اے۔ بی اشرف نے ترکی میں خاصا وقت گزارا لہٰذا ترکی کی سیاحتی یادداشتیں زیادہ ہیں؛ انہوں نے ترکی کی جگہوں، منظروں اور لوگوں کا ذکر بڑے والہانہ پن سے کیا ہے؛ وہ تمام اسلامی ممالک میں ترکی کو ملکی معاملات اور شخصی رویوں کے باعث سب سے بہتر قرار دیتے ہیں۔

اے حمید، ''امریکانو''، صفحات:۴۹۱، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

امریکانو۔ اے حمید کا امریکا کے حوالے سے سفر نامہ بھی ہے اور حضر نامہ بھی۔

''امریکانو''۔ میں اے حمید نے امریکا کے قدرتی اور تہذیبی مناظر کی پیشکش تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ وہاں کی زندگی کو اس کی تمام تر مسرتوں، فرقتوں اور قباحتوں کے ساتھ سفر نامے میں جلوہ گر ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ''امریکانو''۔ واقعتاً سفر نامہ ہے حالانکہ اسے ایک مقبول عام ناول نگار اور افسانہ نگار نے لکھا ہے؛ سفر نامے کا کوئی بھی باب کسی نیم رومانی ناول کا حصہ نظر نہیں آتا۔ اس سفر نامے میں پاکستانیوں کے لیے دلچسپی کے ساتھ عبرت کے بھی کئی پہلو ہیں۔

سفر کے تحرک نے تحریر کی روانی کو بڑھایا ہے اور حضر کے پہلو نے اس جہانِ دگر سے سرسری گزرنے نہیں دیا۔

پروین عاطف، ''ٹپر واسنی''، صفحات:۲۹۶، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''ٹپر واسنی''۔ پروین عاطف کا ایسا سفر نامہ ہے جس میں مشرق و مغرب میں پھیلے کئی شہر اپنی روایات، معاصر حالات، مناظر اور تہذیبی و شخصی مظاہر کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس سفر نامے میں ان شہروں کا ذکر ملتا ہے: لکھنو، لندن، ارجنٹینا، ایمسٹرڈیم، بنکاک، بیکنگ، ٹوکیو، ہیروشیما وغیرہ۔ ''ٹپر واسنی'' میں خارج و داخل باہم آمیز ہو کر اپنے نقش مرتسم کرتے ہیں۔ پروین عاطف کتاب کے آغاز میں اپنی سفر نامہ نگاری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''اپنی طرح اپنی تحریر کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی یہ چند تجربات ہیں۔ مسافری کے جی چاہا آپ سے شیئر (Share) کروں آگے آپ کی صوابدید پر اور ایسا تو کبھی ممکن ہی نہیں کہ کوئی مسافر سفر پہ نکلے تو صرف باہر باہر کا سفر کر کے (کذا: کرے) اور اپنے اندر کی دنیا کہیں اور چھوڑ

جائے''۔(ص:۲)

کتاب کا ''تعارف'' ممتاز مفتی نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے اور پروین عاطف کی شخصیت اور تخلیقی سرگرمی کا تجزیہ کیا ہے۔ پروین عاطف کا اندازِ نظر دوسروں سے مختلف اور اسلوبِ تحریر منفرد، دلچسپ اور پڑھے جانے کی خوبی سے متصف ہے۔

حسین احمد پراچہ، ڈاکٹر، ''کنارے کنارے''، صفحات:۱۴۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''کنارے کنارے'' کئی ملکوں اور شہروں کا سفرنامہ ہے؛ اختصار اور سلاست اس کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ سفرنامے کے دس ابواب دس کناروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کنارِ بحرِ روم، کنارِ نیل، کنارِ کیم، کنارِ ٹیمز، جھیل کنارے، کنار بردیٰ، کنار بحرِ اسود، کنار بحرِ احمر، کنارِ زمزم زمزم، کنارِ کوثر۔

احمد ندیم قاسمی اپنے مختصر دیباچے (بعنوان خیرِ مقدم) میں لکھتے ہیں: ''وہ اپنے سفر کے دوران ملکوں اور شہروں کے ''کنارے کنارے'' چلتے ہیں مگر دراصل ان کے اندر اتر کر چلتے ہیں''۔(ص:۴) لالہ صحرائی اپنے پیش لفظ (بعنوان حرفِ دعا) میں کہتے ہیں:

> ''مصنف نے دورانِ سفر چشمِ بصارت کے علاوہ اپنی چشمِ بصیرت کو بھی کھلا رکھا ہے۔ وہ جب کبھی کسی نئے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔ اس ملک کی ماضی تا حال تاریخ کے چند جلی واقعات کو ہلکے پھلکے انداز میں اختصار کے ساتھ ضرور بیان کرتے ہیں۔ موقعہ بموقعہ وہاں کے معاشرتی احوال پر بھی لطیف انداز میں تبصرہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم کہیں بھی اپنے طرزِ بیان کو بوجھل نہیں ہونے دیتے''۔(ص:۶)

''کنارے کنارے'' ایک مکمل سفرنامہ ہے، یہ نہ تو محض جغرافیائی حقائق نامہ ہے، نہ طویل افسانہ اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ کسی نیم رومانی ناول کا باب نظر آتا ہے۔

خالد جاوید مشہدی، سید، ''اے اللہ میں حاضر ہوں''، صفحات:۳۳۶، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''اے اللہ میں حاضر ہوں'' سید خالد جاوید مشہدی کا سفرنامہ حجاز ہے؛ جو پہلے نوائے وقت ملتان کے ایک ادبی ثقافتی ایڈیشن ''روہی رنگ'' میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک قسط وار چھپتا رہا ہے۔ اس سفرنامے کے حوالے سے مجید نظامی کی رائے یہ ہے:

> ''اے اللہ میں حاضر ہوں'' دو عمروں کی کہانی ہے جو خالد جاوید مشہدی نے اپنے والدین اور پھر دوستوں کے ہمراہ کیے۔ مشہدی صاحب بنیادی طور پر صحافی ہیں اور تحریروں کے عام فہم ہونے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ تاہم ان کے سفرنامے میں بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جملوں کی خوبصورتی کی طرف زیادہ توجہ دی ہے جس سے اگرچہ عمدہ نثر پارے تو یقیناً وجود میں

آئے ہیں مگر ابلاغ کے تقاضے متاثر ہوئے ہیں۔انہوں نے سفرنامے میں تاریخ اور جغرافیے کی جو پیوندکاری کی ہے اس سے کتاب میں خوشگوار جامعیت پیدا ہوگئی ہے''۔(دیباچہ: ص۱۶)

مجید نظامی (مدیر نوائے وقت) کے علاوہ اس سفرنامے کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی، شیخ ریاض پرویز اور ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی کے تاثرات اور آراء بھی کتاب میں شامل ہیں۔

مصنف نے اہم تاریخی مقامات کی تصاویر بھی کتاب میں شامل کی ہیں۔کتاب کے کل ۱۳۵ابواب ہیں جن میں چند کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مکہ میرا شہر، کعبہ میرے آگے، جب در کعبہ کھلا، گنبد ابیض سے گنبد خضریٰ تک، مسجد نبوی کل سے آج تک، یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، مسجد نبوی سے مسجد عائشہ تک، خدا حافظ اے سرزمین بطحا۔

زیرنظر سفرنامہ، سفرناموں کی اس روایت کا امین ہے جن میں ادبی اور دستاویزی دونوں زاویے اور ذائقے موجود ہوتے ہیں۔

رضا علی عابدی، ''جرنیلی سڑک''، صفحات:۳۱۶، زیرنظر ایڈیشن:۱۹۹۵ء

''جرنیلی سڑک''۔ایک دستاویزی سفرنامہ ہے، جس کا پہلا روپ نشریاتی تھا، دوسرا روپ کتابی ہے۔

ضابطے کے صفحے پر یہ وضاحت درج ہے:

> ''جرنیلی سڑک کے عنوان سے پاکستان میں یہ کتاب بی بی سی اردو سروس الیکٹرنل بزنس اینڈ ڈویلپمنٹ گروپ اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔اس کے تمام حقوق بی بی سی لندن کے نام محفوظ ہیں''۔

اس سفرنامے میں گفتگو کا عنصر، سفر کا تحرک اور تاریخ کا تاثر یکجا ہوگئے ہیں۔رضا علی عابدی کے تخلیقی اسلوب اور موضوع سے والہانہ تعلق کے باعث ریڈیو سکرپٹ ادب پارے کے درجے پر پہنچ گیا ہے۔اس سفرنامے اور دستاویزی ریڈیو پروگرام کے حوالے سے مصنف نے اپنے دیباچے بعنوان ''کتاب ایک خراج'' میں بتایا ہے:

> ''وادی پشاور سے سرزمین بنگالہ تک پندرہ سو میل لمبی یہ باضابطہ سڑک ساڑھے چار سو سال پہلے ہندوستان کے افغان بادشاہ شیر شاہ نے بنائی تھی۔بعد میں اسے انگریز حکمرانوں نے وہ شکل دی جس میں آج یہ موجود ہے۔۱۹۸۷ء میں بی بی سی لندن کی اردو سروس نے اس سڑک کو موضوع بنا کر ایک ریڈیائی دستاویزی پروگرام نشر کیا اب وہی پروگرام کتاب کی شکل اختیار کر رہا ہے''۔
>
> (ص۷، تاریخ تحریر:۱۸ستمبر۱۹۸۷ء)

سفرنامہ ''جرنیلی سڑک'' ریڈیو پروگرام کے طور پر بھی مقبول ہوا اور کتابی صورت میں ڈھل کر بھی داد سمیٹنے میں کامیاب رہا۔

رضا علی عابدی، ''جہازی بھائی''، صفحات:۱۳۵، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

''جہازی بھائی'' جزیرہ ماریشس کا سفر نامہ ہے لیکن سفر نامے کی عام ہیئت اور اسلوب سے مختلف ہے۔

رضا علی عابدی نے ''جہازی بھائی'' میں ماریشس کے آباد ہونے، مخلوط معاشرہ کے بننے اور معاصر صورتحال کے ابھرنے کو اپنا بنیادی موضوع بنایا ہے۔ ''جہازی بھائی'' سے مراد وہ ہندوستانی باشندے ہیں جو جہازوں میں بھر کر ماریشس میں نہایت سخت مشقت کرنے کے لیے لائے گئے تھے۔ رضا علی عابدی کی اس کتاب کی بدولت اہل پاک و ہند ان لوگوں کی تاریخ و تہذیب اور مسائل و مصائب کی ایک جھلک ضرور دیکھ لیں گے جو نو آبادی استعماریت کی بنیادوں میں صرف ہوئے اور جن کی نسلیں ایک مخلوط تہذیب کا حصہ بن گئی ہیں۔

چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: بچھڑے ہوؤں کی کہانیاں، مزدوروں کے اہرام، غلاموں کے سجدے، فرانسیسی میں بھوجپوری کی ملاوٹ، اردو کے گیسو، ماریشس کا شانہ، غالب اور ماریشس، نعت، رحمت اور عورت۔

رضا علی عابدی، ''ریل کہانی''، صفحات:۲۲۸، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

''ریل کہانی''۔ ریل گاڑی کے مسافر کا تاثر نامہ اور برصغیر میں ریلوے کے نظام کا احوال نامہ ہے۔

رضا علی عابدی نے بی بی سی لندن کی اردو سروس کے ایک دستاویزی پروگرام کی تشکیل کے لیے کوئٹہ سے کلکتہ تک کا سفر کیا؛ بقول عابدی: ریل گاڑی سے یہ سفر مارچ ۱۹۹۶ء کے اوائل میں کوئٹہ سے شروع ہوا اور ایک ماہ بعد کلکتہ پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔ (ص:۸)

اس پروگرام کی غرض و غایت یہ تھی کہ برصغیر میں ریل گاڑی کے سفر اور اس سفر کے خوشگوار و ناگوار پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ریلوے کے نظام کی مختصر تاریخ اور ریل کے سفر کے دوران راہ میں آنے والے شہر و دیہات کے تہذیبی و معاشرتی رنگ بھی ادبی اور جمالیاتی پیرائے میں سامنے آجائیں۔ رضا علی عابدی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

''ریل کہانی''۔ ایک نگار خانہ ہے جس میں کوئٹہ سے کلکتہ تک کی تمام اہم اور غیر اہم بستیاں، جنگل، ویرانے اور ثقافتیں جلوہ گر ہیں، صرف یہی نہیں ریل کے مسافروں کی ذہنی کیفیت، نفسیاتی رویے، سماجی معاملات، معاشرتی صورتحال اور ریل گاڑی کے ملازموں، کارکنوں، پلیٹ فارم کے قلیوں، غریب اور جفاکش لائین اور کیبن مینوں، بد دماغ اور رشوت خور افسروں کی خارجی و داخلی زندگیوں کی متحرک و متنوع تصویریں سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ بعض تصویروں کا کینوس تو کوئٹہ سے کلکتہ تک پھیلا ہوا ہے۔

''ریل کہانی'' کے چند ابواب کے عنوان درج ذیل ہیں:

آپ کہاں گم ہو گیا، رُک: جہاں کوئی نہیں رکتا، فلم دیکھو عذاب لو، محمد سلطان کی کہانی، وہ جو ہنی مون پر نہیں گئی، رام لال افسانے والے، ریل کہانی، آخری سٹیشن، محنت کشوں کو سلام۔

رضا علی عابدی، ''شیر دریا''، صفحات:۳۴۱، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''شیر دریا''۔ایک ریڈیائی سفر نامے کا کتابی روپ ہے۔ رضا علی عابدی نے بی بی سی لندن کی اردو سروس کے ایک سلسلہ وار پروگرام کے لیے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کیا اور اپنے تاثرات قلم بند کر کے پہلے اپنے سامعین اور پھر اپنے قارئین کو سنائے۔ یہ سفر لداخ سے شروع ہو کر سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں ختم ہوتا ہے کتاب کے پیش لفظ میں رضا علی عابدی لکھتے ہیں:

> ''تبت والے کہتے ہیں کہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے، اسی لیے انہوں نے اسے شیر دریا کا نام دیا ہے.... حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب دریا کی کہانی نہیں، اس کے کنارے بسنے والوں کی ہزار داستان ہے۔ کہیں یہ دریا دکھ دیتا ہے، کہیں سکھ بانٹتا ہے اور کہیں سکھ چھینتا ہے .... دریائے سندھ کے کنارے بسنے والوں کی زندگی ویسی نہیں جیسی بعض دوسرے علاقوں میں ہے۔ یہ لوگ مشکل حالات میں دلیری سے جی رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دریا سے زیادہ یہ لوگ شیر ہیں''۔
> (ص:۸، تاریخ تحریر:۱۵۔اگست ۱۹۹۳ء)

''شیر دریا''۔ایک مختلف نوعیت کا سفر نامہ ہے؛ معلومات کے حوالے سے دستاویزی اور اسلوب و پیش کش کے زاویے سے ادبی، مصنف کے ذاتی تاثرات نے اسے محض ''حقائق نامہ'' بننے سے بچالیا ہے۔ شیر دریا افسانوی انداز اختیار نہ کرنے کے باوجود، دلچسپ اور پر تجسس ہے۔ سفر نامے کے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: چاندی کی لکیر، پیالے میں موتی، گل خاتون کا جہیز، سڑک کے راستے انقلاب، وحشت کی سرحد، عورتیں ہماری، مسیحا ان کے، دریا چپ ہے، ایک پیر، ایک پل، بھکر دیس بھی دیکھ، سندھ کا جیا پا۔

رضا علی عابدی، ''کتب خانہ''، صفحات:۱۶۹، زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''کتب خانہ''۔ایک ایسا سفر نامہ ہے جو کتب خانوں کے احوال جاننے کے مقصد سے کیے جانے والے سفر، تلاش اور تحقیق کو سامنے لاتا ہے۔ اس کتاب کا ذیلی عنوان یہ ہے: ''برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں''۔

رضا علی عابدی نے اپنے دیباچے میں بتایا کہ ''کتب خانہ'' بی بی سی لندن سے نشر کیے جانے کے لیے مرتب ہوا؛ یہ ''پروگرام'' صرف چودہ ہفتوں کے لیے شروع ہوا تھا لیکن ۱۴۰ ہفتوں تک جاری رہا۔ (دیباچے پر تاریخ تحریر ۵ فروری ۱۹۸۵ء درج ہے) ''کتب خانہ'' کا پیش لفظ رالف رسل نے لکھا ہے اور رضا علی عابدی کی پیشکش اور اسلوب کی تعریف کی ہے (پیش لفظ پر ۴ فروری ۱۹۸۵ء کی تاریخ درج ہے) ''کتب خانہ'' روایتی معنوں میں تو سفر نامہ نہیں ہے لیکن ایک خاص مقصد کے لیے کیے جانے والے سفر کے احوال کو دستاویزی مواد اور تخلیقی اُسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

رفیق ڈوگر، ''اے آب رودگنگا''، صفحات: ۲۴۵، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

''اے آب رودگنگا'' رفیق ڈوگر کا سفر نامہ ہند ہے۔ رفیق ڈوگر بنیادی طور پر صحافی ہیں، زیرِنظر سفر نامے میں ان کا زاویہ نگاہ صحافیانہ اور انداز بیان ادیبانہ ہے۔ اس سفر نامے میں من گھڑت رومانی قصوں کے بجائے سنگین حقیقتوں کی عکاسی ہے۔ بقول محمد طفیل:

> ''اے آب رودگنگا، پہلا سفر نامہ ہے جس میں مسافر پر کوئی عورت عاشق نہیں ہوتی۔ مسافر پاک دامنی اور صاف دلی کے ساتھ واپس آ جاتا ہے۔ ان کے دل پر درد کے گھاؤ ہیں۔'' (فلیپ)

سفر نامے کے چندابوب کے عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

تاریخ کے نقش قدم پر، سکھوں کے درمیان ایک شام، ہوئی مدت کہ غالب مرگیا، بھارتی قوم کی جبری تشکیل، غریب الطبع آگرہ، ۱۸۰۰ء کی واپسی، جہاں دلی آباد تھی، جمہوریت کی کمزوری، اے آب رودِگنگا۔

رفیق ڈوگر، ''اور نیل بہتا رہا''، صفحات: ۲۳۲، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

''اور نیل بہتا رہا''۔ انگلستان، فرانس اور مصر کا سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے میں ادبی ذائقہ بھی ہے اور سیاسی وصحافتی زاویہ بھی، اسی طرح مصنف کا انداز فکاہی بھی ہے اور تجزیاتی بھی۔ ''اور نیل بہتا رہا''۔ عمومی اور روایتی سفر ناموں سے مختلف ہے۔ مصنف کے اسلوب میں پڑھے جانے کی خوبی موجود ہے۔ چندابواب کے عنوانات یہ ہیں: ہمارا لندن پلان، گورے غلام، شہیدوں سے مذاق، لندن جو ایک شہر تھا، پیرس کی ایک شام، آنسوگیس سے استقبال، ارض تہذیب کا سفر، فالتوفرعون اور نیل بہتا رہا، ابوالہول کی ناراضگی، گدھوں سے عقیدت۔

سعید آسی، ''آگے موڑ جدائی کا تھا''، (سفرنامہ چین)، صفحات: ۱۶۰، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

سعید آسی بحیثیت ایک اخبار نویس کے چین گئے تو انہوں نے چین کی قومی و سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ وہاں کے مناظر، مقامات، تہذیب اور لوگوں کے رویے بھی دیکھے اور انہیں زیرِنظر سفر نامے میں سمو دیا۔ کتاب کے دیباچے ''حرف اول'' میں مصنف نے اپنے سفر نامے کی تحریر اور اشاعت کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سفر نامے پر ایک صحافی کا نقطہ نظر، سوچ، احساس اور اسلوب اسے دیگر سفر ناموں سے مختلف بنا رہا ہے۔ کتاب کے چندابواب کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

جڑواں جوڑا، سپنوں کا سفر، وقت کے ساتھ ساتھ، حجاب، ایجاب، من مندر کی مورتی، محبت زندہ باد۔

سلمٰی اعوان، ''یہ میرا بلتستان''، صفحات: ۲۸۰، زیرِنظر ایڈیشن: ۱۹۸۸ء

یہ میرا بلتستان''۔ سلمٰی اعوان کے بلتستان میں قیام اور بڑی محبت سے اس کے مناظر ومظاہر اور اشخاص کے مشاہدے کا ثمر نورس ہے۔ سلمٰی اعوان نے نہ صرف بلتستان کے سفر اور قیام کی یادداشتیں رقم کیں بلکہ وہاں کے مسائل ومصائب اور تہذیب وثقافت کو

دستاویزی اور تخلیقی انداز سے روشن کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ سلمیٰ اعوان کے فن افسانہ نے اس سفرنامے میں کہانی کے ذائقے کو شامل کر کے اسے پڑھے جانے کی خوبی سے نواز دیا ہے۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اک جہاں سب سے الگ''، صفحات:۲۷۲، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''اک جہاں سب سے الگ'' ڈاکٹر سلیم اختر کا ''سفرنامہ امریکہ'' ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر افسانہ نگار بھی ہیں اور محقق و نقاد بھی.... اس سفرنامے میں یہ دونوں حیثیتیں اپنے اپنے طور پر اپنا اپنا رنگ جما رہی ہیں۔ سفرنامے کے آغاز میں تحقیق و تنقید کا پیرایہ حاوی ہے اور امریکہ کی دریافت، وہاں کے اصلی باشندے (ریڈ انڈینز)، سفید فاموں کے مظالم اور غلط بیانیاں صراحت اور تحقیقی دیانت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا سفرنامہ اپنے مواد اور اسلوب کے حوالے سے عام سفرناموں (خصوصاً مغربی ممالک کے اردو سیاحت ناموں) سے قطعاً مختلف ہیں۔ سفرنامہ ''اک جہاں سب سے الگ'' امریکہ کے مناظر ہی نہیں، تہذیبی مظاہر اور سیاسی، معاشرتی اور حکومتی مسائل و معاملات کو بھی موضوع بناتا ہے اور امریکہ کے خارج اور باطن کو مکمل طور پر نہ سہی، جزوی طور پر نہایت گہرائی اور تیقن سے منکشف کرتا ہے۔

ش۔ فرخ، ''زرخیز پتھر''، صفحات:۱۳۹، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۶ء

''زرخیز پتھر''۔ ہندوستان کا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں ش۔ فرخ نے ہندوستان کے کئی شہروں اور جگہوں کے تہذیبی رنگوں کو ایک نفیس فنکار کی طرح یکجا کر دیا ہے؛ ش۔ فرخ صحافی ہیں لیکن ان کا سفرنامہ صحافی کے تجزیوں کے بجائے ادیب کے محسوسات پیش کر رہا ہے۔ ش۔ فرخ نے ایک غیر متعصب لیکن سچے پاکستانی اور ایک دردمند اور حساس انسان کے طور پر ہندوستان کی معاشرتی شخصیت کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سفرنامے میں ابواب قائم کرنے کی بجائے اسے ناول کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ سفرنامے میں دلچسپ واقعات اور کردار بھی ہیں؛ دکھ بھرے منظر اور مصائب میں گھرے افراد بھی نظر آ رہے ہیں؛ خصوصاً خواجہ غریب نواز کے شہر (اجمیر شریف) میں غریبوں کی حالت، پڑھنے والے کو دکھی اور مضطرب کر دیتی ہے۔

ش۔ فرخ، ''نئی دنیا پرانی دنیا''، صفحات:۳۰۳، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۹ء

''نئی دنیا، پرانی دنیا'' امریکہ اور انگلستان کا سفرنامہ ہے؛ انگلستان کو پرانی دنیا اور امریکہ کو نئی دنیا کہا گیا ہے۔ سفرنامے میں انگلستان اور امریکہ کے مشاہدے کو پیش کرنے کے ساتھ ان خطوں کا تہذیبی تجزیہ بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے، لیکن ان تجزیوں سے سفرنامے کے متحرک اور منظرنامے کی جمالیات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ ''نئی دنیا، پرانی دنیا'' کے حوالے سے مشفق خواجہ کی رائے یہ ہے:

> ''اس سفرنامے میں اکثر جگہ تجسس اور بعض جگہ تحیر کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ اسی تجسس اور اسی تحیر نے اردو کو ایک زندہ رہنے والا سفرنامہ عطا کیا ہے''۔ (پس سرورق)

سفر نامے کے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: لندن کی پیرانہ سالی، بھورا بھورا برمنگھم، حسن کا مندر، یہ لوگ وابستگیوں کا روگ نہیں پالتے، ہالی وڈ کی ادھیڑ بن، ریڈ انڈین کا بسیرا، دو معاشروں کا سنگم۔

عباس برمانی، ڈاکٹر، ''میرا سندھو سائیں''، صفحات: ۲۳۲، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''میرا سندھو سائیں'' کے بارے میں ڈاکٹر عباس برمانی بتاتے ہیں:

> ''میرا سفر سکردو سے شروع ہوتا ہے اور ڈیلٹا کے علاقے گھارو میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلسل سفر نہیں ہے کئی سفروں کا مجموعہ ہے.... یہ روداد، یہ کتھا کسی ایڈونچر کی نہیں، یہ عقیدت کا سفر ہے۔ محبت کا سفر ہے اور تاریخ کا سفر ہے۔'' (ص ۱۴)

اس سفر نامے کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں دریائے سندھ کے کنارے موجود اور معدوم بستیوں کے منظر، واقعات اور تاریخی تذکرے اسی روانی سے قاری کے سامنے آتے ہیں جو دریائے سندھ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''میرا سندھو سائیں'' ایک مختلف نوعیت کا سفر نامہ ہے اس میں منظر اور ناظر ایک ہو گئے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اس سفر نامے کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''عباس برمانی اور سندھو سائیں اصل میں دونوں ایک ہی وجود کے دو نام ہیں چنانچہ ہم یہ سفر کتھا کبھی عباس کی زبانی سنتے ہیں اور کبھی سندھ بولنے لگتا ہے''۔ (پس سرورق)

چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: میرا سندھو سائیں.... سنگھے کھبب سے مہران تک، سندھ کنارے بشام کی ایک شام، وادی سندھ کی تہذیب کا مرکز، دنیا کا قدیم ترین میٹرو پولس موئن جو داڑو، دیبل، سسی کا شہر بھنبھور، سندھو کی قدیم گزرگاہ اور بحیرہ عرب۔

عطاء الحق قاسمی، ''شوق آوارگی''، صفحات: ۳۱۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

''شوق آوارگی'' عطاء الحق قاسمی کا سفر نامہ یورپ و امریکا ہے جو نہایت شگفتہ مزاجی اور سلیقہ مندی سے رقم کیا گیا ہے۔ اس سفر نامے میں مغربی زندگی بھی نظر آتی ہے اور اہل مغرب کے ذہنی رویے اور باطنی تعصّبات بھی (خصوصاً جو وہ اہل مشرق کے لیے رکھتے ہیں) ''شوق آوارگی'' مصنف کی ابتدائی ادبی زندگی کا حاصل اور مستقبل کے مزید تخلیقی امکانات کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید بتاتے ہیں:

> ''عطاء الحق قاسمی کا یورپ اور امریکہ کا سفر نامہ ''شوق آوارگی'' انیس برس قبل جناب احمد ندیم قاسمی کے ادبی مجلّے ''فنون'' میں قسط وار شائع ہوا، مگر کتابی صورت میں اس کی اشاعت کی نوبت آج آئی ہے.... ''شوق آوارگی'' کی صورت میں اردو سفر نامہ ایک نئی جہت سے روشناس ہوا.... میرے نزدیک ''شوق آوارگی'' کو اردو سفر ناموں میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے''۔ (پس سرورق)

سفر نامے کے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: نیویارک کی آخری ملاقات، یہ آئس لینڈ ہے، رفاقتوں کا ڈوبتا سورج، نہروں کا شہر، ماریا کی کہانی، روشنیوں میں ڈوبا ہوا پیرس، اولڈ پیپلز ہوم میں، میونخ سے استنبول تک، ارضِ روم میں، اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے؟

درج بالا چند عنوانات سے سفر کے تنوع اور موضوعات و واقعات کی رنگارنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''شوق آوارگی'' کتابی صورت میں پہلی بار سنگ میل پبلی کیشنز سے ہی شائع ہوا۔

غازی صلاح الدین، ''میرے دریا، میرے ساحل'' (سفرنامچے)، صفحات: ۲۸۸، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''میرے دریا، میرے ساحل'' میں سفری یادداشتوں پر مشتمل مضامین ہے جنہیں مصنف اور ناشر کی جانب سے سفرنامچے قرار دیا گیا ہے؛ پس سرورق پر ادارے کی جانب سے یہ تعارف اور رائے درج ہے:

> ''غازی صلاح الدین کے یہ ''سفرنامچے'' چالیس ہفتوں تک روزنامہ ''جنگ'' کے سنڈے میگزین میں شائع ہوئے۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحافی کے پیشہ وارانہ اور ذاتی دوروں کی یادوں کا ایک غیر مربوط سلسلہ ہیں اور ان میں مصروف اور پہچانے ہوئے مقامات کے علاوہ اجنبی اور کسی حد تک نامعلوم مناظر کی تصویریں بھی شامل ہیں''۔

غازی صلاح الدین کا اسلوب سادہ، عام فہم اور خوبصورت ہے؛ فوری ابلاغ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فردوس حیدر، ''دائروں میں دائرے''، صفحات: ۱۲۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

بنکاک کا یہ سفرنامہ ناول کے انداز میں لکھا گیا ہے، سو اس میں سفرنامہ کا ذائقہ بھی ہے اور ناول کی دلچسپی بھی۔

ہاجرہ مسرور نے کتاب کے فلیپ پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا:

> ''فردوس حیدر نے یہ کہانی لکھتے ہوئے تھائی لینڈ کے تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی ماحول کے ساتھ وہاں کے رہن سہن اور کھان پان، تہوار اور عقائد کو بھی فراموش نہیں کیا بلکہ سب کو خوش اسلوبی کے ساتھ کہانی کے مرکزی کرداروں میں پرو دیا ہے''۔

فرید احمد پراچہ، ''یہ فاصلے یہ رابطے''، صفحات: ۲۶۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

''یہ فاصلے یہ رابطے'' یورپ، امریکا، افغانستان اور کشمیر کا سفرنامہ ہے۔ فرید احمد پراچہ نے ان خطوں کو ایک سیاح کی نظر سے بھی دیکھا ہے اور ایک دینی اور سیاسی رہنما کے طور پر بھی۔ دونوں طرح کے مشاہدات زیرِ نظر سفرنامے کا حصہ ہیں۔

فرید احمد پراچہ کا اسلوب علمی بھی ہے اور ادبی بھی، سلاست اور روانی اس کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ سفرنامے کے تیس ابواب ہیں،

درج ذیل چند عنوانات سے سفر نامے کے جغرافیائی اور موضوعاتی تنوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

برطانیہ، زندہ درگور، جو دیکھیں ان کو یورپ میں...، جرمنی، اداس روحیں، ڈنمارک، گوالہ بستی، بحری قزاقوں کی سرزمین ناروے، نیاگرا۔ آب رقصاں کی موسیقی، یہ تہذیب جواں مرگ، زمین جہاد افغانستان، لاہور سے ہرات تک، کشمیر جل رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر، ''کوہِ دماوند''، صفحات:۹۶، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''کوہ دماوند'' قرۃ العین حیدر کے سفرِ ایران کا ثمر ہے۔ وہ ایک پبلشنگ ہاؤس کے لیے ملکہ فرح دیبا کی کہانی مرتب کرنے ایران گئی تھیں۔ ''کوہ دماوند'' ۔ایک رپورتاژ ہے لیکن قرۃ العین حیدر کے تخلیقی ہنر نے اس میں کئی افسانوں کا ذائقہ پیدا کر دیا ہے۔

اس رپورتاژ کے دو حصے ہیں: پہلا حصہ ایران کے مختلف شہروں کے سیاحتی تاثرات پر مبنی ہے، دوسرا حصہ شہنشاہ ایران اور ملکہ فرح دیبا کی مختصر داستان حیات ہے جو قرۃ العین نے روایتی طریق کے بجائے اپنے مخصوص تخلیقی انداز اور تاریخی وعصری شعور کے ساتھ رقم کی ہے۔

مصنفہ کا ایران سے آبائی تعلق اور تہذیبی یگانگت کا احساس بھی عبارت واشارت میں جلوہ گر ہے۔ اس رپورتاژ کا زبان واسلوب تخلیقی اور پیرایہ اظہار غیر رسمی ہے۔ اردو اور فارسی کا شعری آہنگ حسب معمول کبھی خفی، کبھی جلی، نثری جملوں میں اپنی موجودگی برقرار رکھتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں سلمیٰ صدیقی کا ایک مضمون ''قرۃ العین حیدر اور اس کا ادب: ایک نظر میں'' شامل ہے جس میں ماسوائے زیرِ نظر رپورتاژ، قرۃ العین کے تمام ادب پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

قمر علی عباسی، ''لندن لندن''، صفحات:۵۳۹، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

''لندن لندن'' ۔قمر علی عباسی کا لندن کے حوالے سے ایک شگفتہ اور دلچسپ سفر نامہ ہے۔ واقعات کے لطف نے اس کی ضخامت کو عبور کرنے میں قاری کی بڑی فیاضی سے مدد کی ہے۔ بقول شفیق الرحمٰن:

> ''قمر علی عباسی کا سفر نامہ ''لندن لندن'' بھی کئی دوسرے سفر ناموں سے کسی حد تک مختلف ہے۔ طرزِ اظہار کی شگفتگی اور مکالموں کی برجستگی نے اس سفر نامے کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ کردار نگاری بھی قابل تحسین ہے''۔

''لندن لندن'' لندن کے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی رنگوں کو سنجیدہ تجزیاتی انداز سے پیش کرنے کے بجائے فکاہی اسلوب میں سامنے لاتا ہے۔ چند ابواب کے عنوان:

لندن میں صدارت کی پیشکش، فرانسیسی حسینہ کا ساتھ، آپ مصنف ہیں خواتین نے چھو کر دیکھا، میدان جنگ میں اسلحے کے بغیر، مارگریٹ آرتھر مس مستوری نکلیں، بہادر علی بین الاقوامی ناول قرار دیا گیا، لندن کہیں نہ تھا ہر طرف پاکستان تھا۔

کرامت بخاری، ''تا بہ خاکِ کاشغر''، صفحات: ۲۸۷، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

''تا بہ خاکِ کاشغر'' چین کا سفر نامہ ہے۔ چین کے حوالے سے سفر نامہ نگار کے تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیبی صورتحال بھی اس تحریر میں منکشف ہورہی ہے۔ اس سفر نامے کے تین ابواب ہیں: نیا جادہ ریشم، پتھروں کا جنگل، گلزارِ عدن۔

کتاب کے فلیپ پر محمد اجمل نیازی کی رائے درج ہے، جس میں انہوں نے زیرِ نظر سفر نامے کو خوبصورت، خیال انگیز اور پر لطف قرار دیا ہے اور کرامت بخاری کو ایک ایسا سفر نامہ نگار کہا ہے جو اپنے قاری کو اپنے تجربے میں شریک کرتا ہے اور اسے مسافرت کے احساس سے نوازتا ہے۔

کشور ناہید، ''آجاؤ افریقہ''، صفحات: ۲۱۵، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۷ء

''آجاؤ افریقہ'' ۔ قیامِ افریقہ کے سولہ دنوں کی روداد ہے۔ کشور ناہید نے ۱۹۸۵ء میں نیروبی میں منعقدہ خواتین کی کانفرنس میں شرکت کی تھی، زیرِ نظر سفری روداد اسی کانفرنس کی یادداشتوں اور خواتین کے عالمی مسائل اور جدوجہد کا احوال ہمارے سامنے لاتی ہے۔ کانفرنس میں شریک نمایاں خواتین کی خدمات کا تذکرہ اوران سے ملاقاتوں اور مکالموں کی تفصیل بھی کتاب میں موجود ہے۔

''آجاؤ افریقہ'' ۔ روایتی انداز کا سفر نامہ نہیں ہے؛ مصنفہ نے اپنے دیباچے میں اسے سفر نامہ یا آپ بیتی کہنے کے بجائے چودہ ہزار عورتوں کی داستان/ جگ بیتی قرار دیا ہے۔ ''آجاؤ افریقہ'' میں کانفرنس کی تفصیلات کے علاوہ افریقہ کی جگہیں، رسمیں اور مختلف فکری و اخلاقی جہتیں بھی ظاہر ہورہی ہیں۔

لطف اللہ خان، محمد، ''زندگی، ایک سفر''، صفحات: ۲۳۲، سن اشاعت ندارد

''زندگی، ایک سفر'' محمد لطف اللہ خان کا سفر نامہ یورپ ہے، یہ سفر ۱۹۵۴ء میں کیا گیا تھا۔ مصنف کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں کیا گیا سفر تقریباً نصف صدی بعد تحریر کیا گیا؛ مصنف نے یہ مشکل تحریری مرحلہ اپنے کاغذات، دستاویزات حتیٰ کہ معمولی کاغذی پرزہ جات کو سنبھال کر رکھنے کی عادت کے باعث سر کیا۔ ''زندگی ایک سفر'' کی درج ذیل فہرست ابواب سے سفر کے تنوع اور ممالک کی تعداد کا پتا چلتا ہے۔ ابتدائی تیاریاں، لبنان، سوئٹزرلینڈ، مغربی جرمنی، اسکینڈی نیویا، ہالینڈ اور بیلجیئم، انگلینڈ، فرانس، اٹلی۔

آغاز میں ''چند معروضے'' کے عنوان سے ایک دیباچہ ہے جس میں مصنف نے اپنی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں خصوصاً کمپیوٹر کمپوزنگ اور اردو املاء کے متعلق اپنے نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں۔

''زندگی ایک سفر'' میں دستاویزی انداز اور جمالیاتی اسلوب ہم آہنگ ہیں۔ مصنف لمحہ موجود کے عقب میں ماضی کی ان گنت پرتیں دیکھنے اور دکھانے پر قادر ہے۔ بقول مصنف: سفر نامے میں شامل ہر واقعہ مبنی بر حقیقت ہے۔

محمد خالد اختر (تلخیص وترجمہ) ''ابن جبیر کا سفر''، صفحات:۲۲۴، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۴ء

''ابن جبیر'' ایک ہسپانوی عرب تھا؛ علم اور سیاحت سے اسے گہرا لگاؤ تھا، اس کا زمانہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کے اقتدار کے عروج کا زمانہ تھا؛ اس نے ۱۱۸۳ء اور ۱۱۸۵ء کے درمیان قرونِ وسطیٰ (مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، شام) کا سفر کیا اور سفر کے دوران ہی اپنے سفر نامے کا زیادہ حصہ رقم کیا۔

محمد خالد اختر نے عربی میں لکھے گئے اس سفر نامے کے انگریزی ترجمے (از: جے۔سی براڈ ہرسٹ: ۱۹۵۱ء) کا اردو میں تلخیص و ترجمہ اپنے مخصوص نثری اسلوب میں پیش کیا ہے۔ یہ تلخیص و ترجمہ ۱۹۶۲ء میں حنیف رامے کے ماہنامے ''نصرت'' میں بالاقساط چھپنا شروع ہوا۔ محمد خالد اختر نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> ''ابن جبیر کا سفر نامہ میں نے بڑے انہماک اور حیرت سے پڑھا۔ اس بوڑھے اندلسی عالم اور سیاح نے میرے دل کو موہ لیا، اور میں اس کی سادہ، متین اور پرکشش شخصیت کے جادو تلے آ گیا۔ میں نے ایسی کتاب پہلے کبھی نہ پڑھی تھی.... ابن جبیر کے سے عالم اور سلجھے ہوئے ساتھی کی معیت میں بارھویں صدی کی پرآشوب اور حیرت ناک اسلامی دنیا کی سیر کرنا ایک بے حد روح پرور تجربہ تھا۔ جب کتاب ختم ہوئی اور میں ابن جبیر سے اس کے شہر غرناطہ میں جدا ہوا، تو میرا دل واقعی بھاری تھا''۔ (ص ۵، ۶)

اس سفر نامے کے ابواب کے عنوان درج ذیل ہیں:

غرناطہ سے مکہ معظّمہ، قیام مکہ معظّمہ، حج بیت اللہ، قیام مدینہ منورہ، مدینہ منورہ سے بغداد، بغداد سے دمشق، دمشق ۔ جنت بلاد اسلام، قیام دمشق، مسیحی شام میں، مکہ سے سسلی اور مسینہ، مسینہ (سسلی) سے المدینہ اطرابنش اور غرناطہ۔

محمد خالد اختر کی تخلیقی شخصیت نے اس ترجمے کو طبع زاد کتاب کے رتبے پر پہنچا دیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''اندلس میں اجنبی''، صفحات:۴۲۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

''اندلس میں اجنبی''۔ مستنصر حسین تارڑ کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ ہسپانیہ، سپین یا اندلس میں مسلمانوں کا وجود، اقتدار اور تمدن صدیوں تک موجود رہے لیکن آج اس وطن میں پہنچنے والا مسلمان ایک اجنبی ہے؛ مستنصر نے اس اجنبی کا تاثر نامہ مرتب کیا ہے، لیکن یہ فقط تاثر نامہ نہیں ہے؛ کرنل محمد خان کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے قدیم اور جدید سفر ناموں کا سنگھم ہیں۔ ان میں پرانے سفر ناموں والی معلومات بھی ہیں اور ماڈرن سیاح کا چمکتا ہوا مشاہدہ بھی۔ اس کا قاری بیک وقت

ماضی اور حال میں سفر کرتا ہے۔ ماضی کا نقشہ جمانے کے لیے مستنصر تاریخ کا سہارا لیتا ہے اور حال کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں اختلاف رائے ممکن ہے کہ خود مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن دوسری صورت میں نہیں کہ مستنصر کا مشاہدہ کھرا، خالص اور ناقابل تردیدہ ہے'' ۔(ص:۱۰)

جغرافیائی معلومات، تاریخی حقائق وحادثات اور مصنف کے تاثرات کو اس کا اسلوب ہم آہنگ کر رہا ہے اور سفر نامے کے لیے ایک نئی جہت کا در کھول رہا ہے۔ ''اندلس میں اجنبی'' کا مطالعہ ایک علاقے کا ہی نہیں، اپنی ذات اور شکست ذات کا مطالعہ بھی ہے۔

سفر نامے کے چند ابواب کے عنوان ملاحظہ ہوں: محبتوں اور اذیتوں کی جانب، گرم خوشبو کی شام، مدینہ سالم، قرطبہ، دور افتادہ اور تنہا، ہجوم نخیل، الحمرا میں ایک رات، اندلس میں اجنبی۔

مستنصر حسین تارڑ، ''تتلی پیکنگ کی''، صفحات:۴۳۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۳ء

''تتلی پیکنگ کی''۔ چین کا سفر نامہ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے نہ صرف چین کو دیکھا بلکہ اسے محسوس بھی کیا ہے؛ اسی لیے شاعرانہ احساس اور اسلوب سفر نامے میں رچا بسا ہے۔ یہ سفر نامہ برادر ملک کے متنوع خطے، سیاسی، سماجی اور تہذیبی رویے اور آئندہ کے امکانات پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سفر نامے کے چند عنوانات دیکھیے:

تتلی اور تارڑ... ریت کے پرندے پرواز کرتے ہیں، گریٹ وال آف چائنہ، ایک مردہ اژدھا، بوڑھا کنفیوشس اور گیت گانے والا جھینگر، مٹی کے سپاہیوں کی فوج.... دنیا کا آٹھواں عجوبہ.... شی آن عجائب گھر.... مٹی کا سپاہی زندہ ہوتا ہے، شنگھائی عجائب گھر کا فسانہ عجائب، چینی ادیب ایک بڑا ناول نہیں لکھ سکتے.... کیوں؟ عظیم ماؤ کے حنوط شدہ چہرے کے سامنے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''چترال داستان''، صفحات:۲۵۶، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۲ء

''چترال داستان''۔ گلگت، وادی گوپس، وادی پھنڈر، درہ شیندور، چترال اور کافرستان کا سفر نامہ اور منظر نامہ ہے۔

مستنصر سفر کے بہاؤ اور منظر کے تحرک کو اپنی گرفت میں لینے والے سفر نامہ نگار ہیں؛ زیرِ نظر سفر نامہ وطن عزیز کے ایک اہم گوشے کے حسن سے اردو کے زاویہ نثر کو روشن کر رہا ہے۔ چند ابواب کے عنوان ملاحظہ ہوں: وادی گوپس کے ڈائنا سورس اور سونے کے پرندے، وادی پھنڈر حشر اور دریائے غذر، غدر، بارست کے چشمے کا سیون اپ، درہ شندور کے سنہری گھنے گم ہوگئے، مستوج کا قلعہ، بلند چنار اور ''یاک سرائے'' کو جانے والا راستہ، گرم چشمہ اور اجڑتی بدخشانی بستی، کافرستان ایک سٹیج اور اس کے کردار... کافر کردار۔

مستنصر حسین تارڑ، ''دیوسائی''، صفحات:۳۲۸، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۲ء

زیرِنظر سفرنامے کی ذیلی سرخی ہے... ''دنیا کے بلند ترین میدان دیوسائی کے پار''۔سفرنامے کے چند ابواب کے عنوان ملاحظہ ہوں:

پھولوں سے بھرا مقام، مے خانہ شمال کے رِند سکردو روڈ پر، دغاباز سکردو فلائیٹ، مردہ کوہ پیماؤں کے بوٹ، سنولیک پر خیمے میں لاش، دیوسائی کی برفیں پگھلتی نہ تھیں، اور.... دیوسائی کی برفیں پگھل رہی ہیں،.... لچھمن جھیل برف میں قید، ''کے ٹو۔مشابرم۔چوغولیزا کے سامنے''، تارڑ ریچھ، سلجوق ریچھ اور سمیر ریچھ وغیرہ، مرتضےٰ چوکی کی کارواں سرائے میں رات اور ایک دشمن فوجی سے ملاقات، دیوسائی کی دیومالائی رات میں سفر.... ایک ریچھ کے لیے.... ایک بادل.... ایک پھول کے لیے۔

درج بالا عنوانات: سفرنامے کے موضوعات کے تنوع، مقامات کے تحیر، اسلوب کی افسانویت اور فضا کی شگفتگی ظاہر کر رہے ہیں۔ ایک باب: ''مرتضےٰ چوکی کی کارواں سرائے میں رات اور ایک دشمن فوجی سے ملاقات''۔مخصوص پاکستانی رویوں کی عکاسی کر رہا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''سفر شمال کے۔سوات و خنجراب''، صفحات:۱۹۶، زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۳ء

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفرناموں سے نہ صرف بیرونی ممالک کے منظروں کو اندرون ملک متعارف کرایا بلکہ اندرون ملک کے حسن خداداد کو بھی ہمارے نگاہ و دل پر آشکار کرنے کی کوشش کی۔زیرِنظر سفرنامہ بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے، جس میں سوات اور خنجراب کی سفری روداد پیش کی گئی ہے اور بیان میں وہی حسن ہے جو ان وادیوں میں بڑی فراوانی سے موجود ہے۔

سوات اور خنجراب۔پاکستانی شمال کے الف لیلہ ہیں؛ جہاں مناظر نے ایک طلسم ہوش ربا صدیوں سے قائم کر رکھی ہے؛ مستنصر حسین تارڑ نے اس الف لیلہ اور اس طلسم کو اپنے جادو نگار قلم سے لفظوں میں مجسم کرنے کی کوشش کی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے یہاں سفرنامہ اور افسانہ متوازی چلتے ہیں؛ مناظر اور اشخاص ان دونوں کے ایسے مرکزی کردار ہیں جن کی قلب ماہیت ہوتی رہتی ہے؛ کبھی مناظر اشخاص میں اور کبھی اشخاص مناظر میں بدل جاتے ہیں؛ اور خود مصنف..... ناظر بھی ہے اور منظر بھی اور حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔(غائب ہونے سے مراد مصنف کی غیر موجودگی نہیں ہے)

مستنصر حسین تارڑ، ''سنولیک''، صفحات:۵۰۴، زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۰ء

''سنولیک'' کا ذیلی عنوان ہے: ''بیافو، ہیسپر، دنیا کے طویل ترین برفانی راستے پر سفر کی داستان۔اس سفرنامے میں جن مقامات کا ذکر آیا ان میں سے چند یہ ہیں: اسکولے، بشام اور سکردو، جھیل صد پارہ، کے ٹو موٹل، اسکولے روڈ، دریائے برالڈو، اپالی گان، پکورہ، تھنگل، قیصر گراؤنڈ، بیافو گلیشئیر، نملا، مانگو، سنولیک، ہیسپر گلیشئیر، وادی نگر، کریم آباد ہنزہ۔

مستنصر حسین تارڑ نے ان علاقوں کا حسن ہی رقم نہیں کیا، ان کا ماحول، مصائب اور ''سیاحوں'' کے بے حس رویے بھی تحریر کیے ہیں جو خوبصورت علاقوں اور تحیر خیز جگہوں کے باشندوں کی حالت بدلنے پر اس لیے راضی نہیں کہ یہ جیتا جاگتا عجائب گھر جسے وہ بڑی دور سے دیکھنے آتے ہیں، ختم نہ ہو جائے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''شمشال بے مثال''، صفحات: ۲۳۸، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۴ء

''شمشال بے مثال'' بقول مستنصر ''دنیا کی تنہا ترین جگہ'' کا سفر نامہ ہے۔ ''شمشال بے مثال'' شگفتہ منظروں کے ساتھ اداس، تنہا اور خاموش جگہوں کا متحرک بیانیہ ہے۔ اس سفر نامے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہر منظر کے اندر ایک مسرت بھرا فلسفہ اور ہر واقعے میں ایک خوش باش منظر موجود ہے۔ سفر نامے کے چند ابواب کے عنوان ملاحظہ ہوں: درہ شمشال کا گلاب شہر، گلگت دربار، ہنزہ دربار، کارگل کہانی اور عشق آتش، شمشال کا سفر آسان ہوگیا، شکر جوئی،... میٹھے پانی کا تالاب، گرم چشمہ کے آبی چراغ....، شمشال کا زرد جھما کا.... سرسوں بھری وادی اور چینی شہزادیاں، میں دنیا کی تنہا ترین جگہ پہنچ گیا تھا، خوشی کی تلاش ہی دراصل خوشی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''کے ٹو کہانی''، صفحات: ۴۲۹، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۴ء

''کے ٹو کہانی''۔ اسم بامسمٰی ہے۔ مناظر، مظاہر، مقامات، افراد اس بھری پرُی کہانی کے ابھرتے ڈوبتے کردار ہیں؛ مرکزی کردار مصنف کا ہے۔ مصنف کے تاثرات کہانی کی باطنی گہرائی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سفر کا ہر موڑ ایک نقطہ عروج ہے لیکن اس کے بعد سفر ختم ہوتا ہے نہ کہانی، اور ایک نیا موڑ اور ایک نیا نقطہ عروج سامنے آجاتا ہے۔ مصنف کے انداز بیان نے ''کے ٹو'' کے اردگرد کی تمام بستیوں کو قارئین کی بستیوں کے قریب لا کھڑا کیا ہے؛ بعض اوقات تو یہ بستیاں آپس میں مدغم ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ ''کے ٹو کہانی'' کے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: پچھلی شب میں نے شاہ گوری کو خواب میں دیکھا، اور یہ خواب اور کس کس نے دیکھا، تو چلیں کے ٹو، گرم چشمے، میمیں اور منصوبہ بندی، میں دنیا کی تنہا ترین جگہ سے خوشی لینے جارہا ہوں، سنولیک، گلابی رنگ کے کھیت اور تھنگل میں منگل، نیلی جھاڑیوں والے میدان میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی سے ملاقات، شاہ گوری پر شاندار سورج طلوع ہو رہا ہے۔

عنوانات سے محسوس ہوتا ہے کہ ''کے ٹو'' ایک طلسم ہے اور ''کے ٹو کہانی'' ایک رومان۔

مستنصر حسین تارڑ، ''نانگا پربت'' (بلتستان داستان)، صفحات: ۴۱۶، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۴ء

''نانگا پربت'' میں تین سفروں کی ترتیب (اور چند عنوان) کچھ یوں ہے: پہلا سفر: سکردو سے چپلو، جھیل کچورا سے راکاپوشی تک، وادی ہنزہ کا چراغاں، بیس کیمپ نانگا پربت۔ دوسرا سفر: گلگت گیم، ترشنگ، پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں، روپل گلیشیئر کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیمہ اور سردرات، لاتوبولو، بیس کیمپ، نانگا پربت پر تارڑ پرچم۔ تیسرا سفر: ہوشے۔ ۶۲ کلومیٹر، وادی شکر، دیوسائی اے دیوسائی۔

زیر نظر سفر نامہ۔ نانگا پربت ایسے افسانوی مقام کا افسانوی بیان ہے؛ گو مقامات و واقعات حقیقی ہیں لیکن مصنف کے مخصوص اسلوب سے سفر نامہ ایک رومانی ناول کے ماحول اور پیرایہ اظہار کے قریب آ گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ، ''نیپال نگری''، صفحات: ۳۴۸، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''نیپال نگری''۔ نیپال کا سفر نامہ ہے لیکن اسم با مسمیٰ ہے؛ مستنصر ''نیپال میں اجنبی'' نظر نہیں آتے بلکہ وہاں کے باشندے محسوس ہوتے ہیں؛ سیاحت کے ساتھ گندھا ہوا محبتوں اور رفاقتوں کا بیان اس خیال کو تقویت دیتا ہے۔

مستنصر نے نہایت شگفتہ پیرائے اور اپنے مخصوص افسانوی اسلوب میں نیپال کے تمام حسین اور رنگین مناظر، تہذیبی مظاہر اور شخصی رویوں کو پردیسی کی طرح نہیں، گھر کے بھیدی کی طرح پیش کیا ہے۔ چند ابواب کے عنوان دیکھیے:

زندہ دیوی... کماری کماری... درشن درشن، بھاگ متی اور بھاگ بھری، کھٹمنڈو کا دھوکا بازار، شراب خانے میں قمار خانے میں میرے بغیر نہ جانا، جس کو دیکھا قمار میں دیکھا، انا پورنا کے پجاری.... بدھ کے بیوپاری، تبت کے شاہ جی اور مغل شاہ زادی، دربار مرگ... شراب حاضر کباب غائب، تھمل میں حمل، سکھ سسرال، آخری قماری، خماری اور کماری.... اٹھ فرید استیا، ناگ دیوتا ایک متروک خدا....،

مستنصر حسین تارڑ، ''ہنزہ داستان''، صفحات: ۲۹۵، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''ہنزہ داستان'' وادی ہنزہ کا افسانہ بھی ہے اور سفر نامہ بھی۔

اس سفر میں کاغان سے قراقرم تک سفر نامہ نگار کے حسن جمال اور قصہ گوئی کی تسکین کے لیے مناظر بھی ہیں اور نت نئے واقعات بھی۔ مستنصر واقعات و مناظر کو اس طرح آمیز کرتے ہیں کہ بالکل ایک مختلف نوعیت کا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔ سفر نامے کے چند عنوانات یہ ہیں: کاغان میں اور کرسمس کی شام میں ہنزہ، ٹیکشلا کے بدھ، مانسہرہ کی خانم اور مائی انڈس، شیر دریا سندھ اور ہم، ایک قراقرمی گاؤں جو ہمارے نقشوں میں نہیں تھا، ہنزہ داستان۔

مستنصر حسین تارڑ، ''یاک سرائے''، صفحات: ۴۴۸، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

مستنصر حسین تارڑ نے قارئین کو اردو سفر نامے کی صنف کی جانب ہی متوجہ نہیں کیا بلکہ اپنے خوبصورت اسلوب سے پاکستان کے حسین مناظر اور دلاویز خطوں کی طرف بھی اہل وطن کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب رہے۔ اس سفر نامے میں جن علاقوں کا ذکر ہے وہ یہ ہیں: بشام، قراقرم، گلگت، سوختہ آباد، پامیر، روات، وادی بروغل، درہ درکوت۔ (دو ابواب کے دلچسپ نام: پامیر کی یاک سرائے میں، وادی بروغل میں یاک مذاکرات) اس سفر نامے میں مستنصر کا مخصوص افسانوی انداز اور شگفتہ لہجہ ان علاقوں کے حسین زاویوں کو مزید تیکھا کر کے پیش کر رہا ہے۔

ممتاز چٹھہ، پروفیسر، ''جلال و جمال''، صفحات: ۳۵۳، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''جلال و جمال''۔ پروفیسر ممتاز چٹھہ کا سفر نامہ حج ہے؛ انہوں نے یہ مبارک سفر ۱۹۹۴ء میں کیا تھا۔

پروفیسر ممتاز چٹھہ کا سفر نامہ حجاز.... ایک خاتون کی عقیدتوں، محبتوں اور مقامات مقدسہ کی روشن ساعتوں کی ایک ادبی اور دستاویزی

کہانی ہے۔مصنفہ نے اپنے تاثرات کے ساتھ ساتھ حج اور سرزمین حجاز کے بارے میں اہم معلومات کو بھی سفر نامے کا حصہ بنایا ہے۔
''جلال و جمال'' کے۱۰۲ مختصر اور تفصیلی ابواب ہیں (ان میں ابتدائیہ اور اظہار تشکر بھی شامل ہے) چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔حج کا مفہوم، حج زمانہ جاہلیت میں، کعبۃ اللہ،سوئے حرم،حرم کعبہ اور ہم،سوئے دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم، درِ مصطفیٰؐ پر حاضری، حاضری مزار منور اور زیارت کے آداب، ناقابل فراموش عید،طواف کا انوکھا تجربہ،فضائے حسن و عشق۔پروفیسر ممتاز چھٹہ کا اسلوب خوبصورت ہے اور اس میں قدیم رنگین اور شعری اسالیب نثر کا پرتو نظر آتا ہے۔

منیر فاطمی،''دیواروں کے پار''،صفحات:۳۱۸،زیر نظر ایڈیشن:۱۹۹۰ء

''دیواروں کے پار''منیر فاطمی کے دو سفرناموں،گرد بار (سفر نامہ ایران) اور خواب سفر (سفر نامہ ہند) کا مجموعہ ہے۔
منیر فاطمی کے سفر نامے میں جمالیاتی اور دستاویزی دونوں طرح کے زاویے اور ذائقے موجود ہیں۔''گرد بار'' ایران کا سفر نامہ ہے اور اس میں ایران کا تہذیبی پہلو زیادہ روشن ہے؛ خواب سفر، ہندوستان کا سفر نامہ ہے، وراس میں تہذیبی پہلو کے ساتھ ادبی زاویہ بھی خوب جگمگا رہا ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کتاب کے مقدمے بعنوان''اسلوبیاتی انفرادیت کا سفر نامہ نگار''میں لکھتے ہیں:

> ''میرے نزدیک اس کے دروں بینی اور بیرون بینی کی خصوصیت نے ہی اس سے ایسا سفر نامہ تحریر کروایا ہے جس میں معلومات کا خزانہ بھی ہے اور فنکارانہ اظہار بھی... اس کے سفر نامے واقعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں کے اعتبار سے سب سے الگ تھلگ بھی ہیں اور انفرادیت کے حامل بھی''۔(ص۱۴)

ان سفرناموں کے حوالے سے عاصی کرنالی کے''تاثرات'' بھی کتاب میں شامل ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''منیر فاطمی نے اپنے سفر ناموں میں قدیم اور جدید سفر ناموں کے اسالیب کا بیک وقت تتبع کیا ہے ان کے یہاں سیر و سیاحت کے بیان میں کہانی کا انداز ہے لیکن بعض مقامات پر انہوں نے شعوری طور پر اطلاعات و معلومات جمع کی ہیں اور انہیں ریاضی کی قطعیت کے ساتھ پیش کیا ہے''۔(ص۳۱۷)

آپ بیتی، طنز ومزاح، مضامین، مکاتیب

آزاد،محمد حسین،مولانا،''آبِ حیات''،صفحات:۴۳۶،زیرنظرایڈیشن:۲۰۰۰ء

''آبِ حیات'' اردو کا ایسا نثری کلاسیک ہے جس کا بنیادی موضوع یعنی ''تاریخ'' مصنف سے انصاف اور ذوق تحقیق کا طلبگار تھا جو بدقسمتی سے اسے نہ مل سکا؛ البتہ آزاد نے اپنے دیباچے میں جو ارادہ اور اعلان کیا تھا۔اس حوالے سے خاصی حد تک سرخرو ہوئے۔ آزاد کا ارادہ یہ تھا:

> ''جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف ذکروں میں متفرق مذکور ہیں۔انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو،اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو''۔(ص ۸)

آزاد ان تصویروں کو اپنے جادو نگار قلم سے پیش کرنے میں کامیاب رہے۔

آبِ حیات میں اردو زبان کے حوالے سے مولانا آزاد کے ''اعلان'' جدید لسانیات کے نزدیک ناقابل قبول ہیں،اسی طرح غالب کو ذوق سے کم تر قرار دینے کی کاوش بھی ناقدین وقارئین ادب کے نزدیک ایک ''بزرگانہ جسارت'' ہے جسے لطف بیاں کے لیے پڑھا تو جاسکتا ہے لیکن قبول نہیں کیا جاسکتا۔

آبِ حیات، پاک وہند میں متعدد اداروں نے اپنے اپنے انداز میں طبع کی۔سنگ میل نے اسے اچھے رنگ روپ میں شائع کیا۔

آزاد،محمد حسین،مولانا،''نیرنگ خیال''،صفحات:۱۵۵،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۳ء

''نیرنگ خیال'' کا پہلا حصہ، پہلی بار ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔کچھ ہی عرصے میں یہ کتاب نہ صرف ساری اردو دنیا میں مقبول و معروف ہوگی بلکہ تعلیمی نصابات کا بھی حصہ بن گئی اور اس کی یہ دونوں حیثیتیں آج تک برقرار ہیں۔

زیرنظر ایڈیشن میں ایک مبسوط اور تحقیقی مضمون بعنوان ''نیرنگ خیال کے مطبوعہ نسخے'' اور ایک تنقیدی مضمون ''نیرنگ خیال کا ادبی مرتبہ'' شامل ہیں (لیکن ان مضامین کے لکھنے والے کا نام شامل نہیں ہے) مضمون ''نیرنگ خیال کے مطبوعہ نسخے'' کے مصنف نے نیرنگ خیال کے حصہ دوم کے بارے میں بتایا ہے۔

> ''نیرنگ خیال'' حصہ دوم، دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ وکٹوریہ پریس) کے پورے چالیس سال بعد ۱۹۲۳ء میں آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد کے دیباچے اور اضافے کے ساتھ پہلی بار

چھپا۔.... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''نیرنگ خیال'' کے حصہ دوم کے پانچ مضامین کیا واقعی آزاد کے لکھے ہوئے ہیں یا محض خاکے اور نوٹس ان کے ہیں اور ان خاکوں میں رنگ آغا محمد طاہر نے بھرا ہے؟.... ''نیرنگ خیال'' حصہ دوم کے مرقعوں کو کامل طور پر آزاد کی تحریر قرار دینا مشکل ہے۔اس میں آزاد اور نبیرہ آزاد (آغا طاہر) دونوں کی محنت اور کاوش فکر شامل ہے''۔(ص ۷،۹،۱۰)

آغا ناصر، ''گمشدہ لوگ''، صفحات: ۲۳۷، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''گمشدہ لوگ''، شخصی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں آغا ناصر نے اپنی قریبی اور محبوب شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔اس مجموعے میں فیض احمد فیض، ذوالفقار علی بخاری، خواجہ معین الدین، صادقین، مصلح الدین، سلیم احمد، ریاض فرشوری، اطہر علی اور غفاری بیگم کے حوالے سے آغا ناصر کی یادداشتیں، تاثرات، عقیدتیں اور فکری اقدار مجسم ہوئی ہیں۔اپنے پیش لفظ بعنوان ''وہ جو ہم تم میں نہیں'' میں آغا ناصر لکھتے ہیں:

> ''میری زندگی میں چند ایسے ساتھی، دوست اور بزرگ ہیں جو لگتا ہے دنیا کے جھمیلوں میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔یہ گمشدہ لوگ ہی اس کتاب کی تحریروں کا موضوع ہیں۔ان تحریروں کو ادب کی کس صنف میں شامل کیا جانا چاہیے اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔یہ شخصی خاکے ہیں یا فکائیہ (فکاہیہ) مضامین ہیں۔یا کچھ اور میرے نزدیک تو یہ تحریریں صرف میرے احساسات اور تاثرات کے اظہار کے ذریعہ ہیں ایسے گمشدہ لوگوں کے بارے میں جو زندگی میں میرے محبوب رہے''۔(ص ۸، تاریخ تحریر: دسمبر ۱۹۹۹ء)

الطاف حسین حالی، مولانا، ''حیات جاوید''، (تلخیص: ڈاکٹر سلیم اختر)، صفحات: ۱۸۴، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۳ء

''حیات جاوید'' سرسید احمد خان کی سوانح ہے اور اسے مولانا حالی نے محنت، محبت اور عقیدت سے مرتب کیا ہے، شاید اسی لیے سوانح کی تاریخی حیثیت کو تسلیم بھی کیا جاتا ہے اور اس پر مختلف اعتراضات اور سوالات بھی اٹھائے جاتے ہیں۔''حیات جاوید'' اپنی اشاعت اول سے آج تک تخلیقی ادب، تنقید اور تاریخ کے شعبوں میں موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ابتدائیے میں صحیح لکھا ہے: ''حیات جاوید'' اس قومی ہیرو کے حالات زندگی، تحریک اور اس سے جنم لینے والے نزاعات پر پہلی، مستند، مفصل اور جامع تصنیف ہے''۔(ص: ۳) ''حیات جاوید'' کا زیر نظر ایڈیشن تلخیص شدہ ہے اور یہ مشکل مرحلہ ڈاکٹر سلیم اختر نے طے کیا ہے۔بڑی تقطیع کے پون ہزار صفحات کو تقریباً ایک سو ستر صفحوں میں اس طرح سمیٹنا کہ کتاب کی روح اور مصنف کے افکار اور الفاظ برقرار رہیں، کوئی آسان کام نہ تھا۔''حیات جاوید'' میں شامل حالی کے دونوں دیباچوں کو ان کی تاریخی اہمیت کے باعث مکمل صورت میں برقرار رکھا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ''اختتامیہ'' کے عنوان سے ''حیات جاوید'' کا بھرپور تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔

انتظار حسین، ''چراغوں کا دھواں''، صفحات:۳۶۱، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

''چراغوں کا دھواں'' انتظار حسین کی یادوں کے پچاس برس ہیں۔ کتاب کے پہلے باب میں پاکستان اور ہندوستان کی گولڈن جوبلی کا ذکر ہے کہ اس موقع پر انتظار حسین کو یادوں کے پچاس برس دھرانے کی فرمائشیں پاک و ہند کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک سے بھی موصول ہوئیں؛ سو یوں ''چراغوں کا دھواں'' مرتب اور مجسم ہوا۔ ان یادوں کا آغاز میرٹھ سے پاکستان ہجرت کرنے کے عظیم، دل گیر اور رقت انگیز سفر سے ہوتا ہے اور پھر پھیلتا چلا جاتا ہے: نئے ملک کے حالات اور تعمیرِ نو، ادب اور ادیب، سیاست اور صحافت، عسکری اقتدار اور سقوط مشرقی پاکستان، سماجی اور علاقائی کھینچا تانی اور حکمرانوں کی من مانی تک یادوں کے دائروں اور باتوں کے سلسلے وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انتظار حسین کے اسلوب میں کہانی کا لطف، دوستانہ اور مخلصانہ بے تکلفی، سادگی و پرکاری، باتیں کرنے کا شوق اور گذشتہ کو ''کہے'' اور ''سنے'' جانے کا ذوق حسبِ معمول موجود ہے، ساتھ ہی ایک ایسی شگفتگی بھی ہے جو اداسی کو قنوطی نہیں ہونے دیتی اور دل کے تار ہلاتی ہے پر طبیعت کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔

انتظار حسین، ''ملاقاتیں''، صفحات:۳۵۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''ملاقاتیں''۔ ادبی شخصیات پر مختصر مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۸۶ شخصیات پر مختصر مضامین ہیں اور دوسرے میں ۳۱۔ ادبی شخصیات کی وفات پر لکھے جانے والے تعزیت نامے (تعزیتی کالم) ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اصل میں روزنامہ ''مشرق'' کے لیے لکھے گئے کالم ہیں جو انتظار حسین کے تخلیقی اسلوب کے باعث فقط ''صحافتی'' نہیں رہے بلکہ ادبی رتبے پر پہنچ گئے ہیں۔ چند کالموں میں انتظار حسین نے ادیبوں کے انٹرویوز کو سوالاً جواباً پیش کرنے کے بجائے خوبصورت اور قابلِ مطالعہ مضمون کی صورت دے دی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے معاصر ادبی تاریخ کی جھلکیاں محفوظ ہو گئی ہیں۔

انعام الحق، ائیر کموڈور (ر)، ''ایام رفتہ''، صفحات:۳۱۵، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۹۹ء

''ایام رفتہ''۔ ائیر کموڈور (ر) انعام الحق کی خودنوشت سوانح ہے۔ انعام الحق اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''یہ میری زندگی کی سرگذشت ہے۔ اس میں آپ بیتی کے علاوہ جگ بیتی بھی شامل ہو گئی ہے۔'' (ص ۷)

''ایام رفتہ'' ایک ایسے شخص کی خودنوشت جس نے اپنی ہمت سے اپنی منزلت میں اضافہ کیا اور اسلام، پاکستان اور مشرقی اقدار سے محبت و عقیدت کا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا۔ اس خودنوشت میں (انعام الحق کے بیان کے مطابق) واقعی جگ بیتی کے عناصر خاصے بڑھ گئے ہیں جس سے خودنوشت کا مخصوص ذائقہ اور زاویہ کسی حد تک متاثر ہوا ہے۔ ایام رفتہ کے مزاج اور موضوعات کا اندازہ اس کی فہرست ابواب سے بھی ہو جاتا ہے، چند ابواب کے عنوان یہ ہیں: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، تبلیغی جماعت اور تقسیم ہند، پاکستان آنے کے بعد

پاکستان ائیرفورس میں ملازمت، ڈائریکٹر جنرل پبلک لائبریریز پنجاب، رائے ونڈ۔ آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔

اے حمید، ''داستان گو۔اشفاق احمد''، صفحات:۲۲۳، زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۶ء

اے حمید، اشفاق احمد کے دیرینہ اور گہرے دوست تھے، زیرنظر کتاب میں انہوں نے اپنے دوست کے حوالے سے نہ صرف اپنی یادداشتیں رقم کی ہیں بلکہ اشفاق احمد کے فکری، باطنی، ادبی اور سماجی خدوخال کو بھی واقعات اور اپنے ذاتی تاثرات سے روشن کیا ہے۔

اشفاق احمد نے کسی زمانے میں ''داستان گو'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، اسی حوالے سے کتاب کا نام ''داستان گو'' رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کتاب ''اشفاق بیتی'' کے ساتھ ساتھ اے حمید کی بکھری ہوئی اور نامرتب آپ بیتی بھی محسوس ہوتی ہے۔

اے حمید، ''قصہ آخری درویش کا''، صفحات:۲۳۷، زیرنظرایڈیشن:۲۰۰۰ء

''قصہ آخری درویش کا''۔ اے حمید کی اکتیس شگفتہ تحریروں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اے حمید افسانے، ناول، اخباری کالم، یادداشتیں اور تاثرات بڑی فراوانی سے لکھتے رہے ہیں۔ زیرنظر مجموعے میں درج بالا تمام اصناف کے ذائقے بڑی خوبی سے یکجا ہو گئے ہیں۔ ''قصہ آخری درویش کا''۔ طنزومزاح کی دنیا کا ایک منفرد مجموعہ ہے جس میں خودنوشت سوانح کے زاویے بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے سب سے خوبصورت مثال ''بھگت کبیر اور کیلے'' ہے (جو اردو کے فکاہی ادب کی ایک نہایت شائستہ تحریر شمار ہونی چاہیے)۔ چند دیگر شگفتہ مضامین کے عنوانات یہ ہیں: قبر کا پرمٹ، کامیڈین کی ٹریجڈی، ڈرامہ سسی پنوں جدید، گوریلے کا انجام، گنجے کی واپسی، دکھیا خانم کے دوخط، جانوروں کا فلمی ایوارڈ، ایک دن کی بادشاہت، قصہ آخری درویش کا، باقی پردہ سیمیں پر۔

اے حمید کا اسلوب سادگی وسلاست کا حامل ہے اور طنزیہ پیرایہ کسی کی دل آزاری اور توہین کا مرتکب نہیں ہوتا۔

اے حمید، ''لاہور کی یادیں''، صفحات:۳۹۲، زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۲ء

''لاہور کی یادیں''۔ ایک منفرد اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں خودنوشت سوانح، تاریخ، افسانہ اور تذکرہ سب باہم آمیز ہو کر ایک نئے روپ میں ڈھل گئے ہیں۔ اے حمید نے لاہور میں جو کچھ دیکھا، پایا اور سہا، سب کچھ ایک شگفتہ اور سوانحی اسلوب میں پیش کر دیا۔

اس کتاب میں لاہور کے باغ، مکان، گلیاں، ریستوران، فلم سٹوڈیوز، تھیٹر کمپنیاں، سینما گھر، کالج، لائبریریاں، اکھاڑے، تکیے، ''دروازے'' اور چہرے اپنی اسی آب وتاب کے ساتھ قاری کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں جس طرح ماضی میں اے حمید کے نگاہ ودل کے روبرو تھے؛ کل کی طرح آج بھی ''لاہور'' اے حمید کے لیے ''شہرالف لیلیٰ'' ہے۔

بانو قدسیہ، ''مردابریشم''، صفحات:۱۵۷، زیرنظرایڈیشن:۱۹۸۹ء

''مردابریشم''۔ قدرت اللہ شہاب پر لکھا گیا ایک خوبصورت طویل تاثراتی مضمون ہے، جس میں قدرت اللہ شہاب کی شخصیت

میں خیر کے عناصر کی فراوانی کے حوالے سے بانو قدسیہ نے اپنی عقیدت کو مجسم کیا ہے۔

''مردِ ابریشم'' میں قدرت اللہ شہاب کی شخصیت و خاندان کے ساتھ ساتھ بانو قدسیہ نے اپنے گھرانے خصوصاً اشفاق احمد کے حوالے سے بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔قدرت اللہ شہاب کے لیے اشفاق احمد کی محبت وعقیدت کو بھی کتاب میں روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔کتاب میں موضوع ومواد کی مناسبت سے تصاویر بھی شامل ہیں۔

حجاب امتیاز علی،''تصویر بتاں''،صفحات:۲۳۴،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''تصویر بتاں''۔حجاب کے تاثراتی مضامین،خاکے،اور ذاتی ادبی زندگی نیز معاصر ادبی رویوں کے تذکرے پر مبنی ایک دلچسپ کتاب ہے۔آغاز میں حجاب کا ایک نوٹ درج ہے:''میں ایک زمانے سے اپنے ملنے والوں کی قلمی تصویریں کھینچنے کی عادی رہی ہوں..... ظاہر ہے ایسی تصویر ہر کسی کی کھینچی نہیں جاسکتی تاوقتیکہ کردار میں کوئی نرالا پن نہ ہو''۔(ص ۷)''تصویر بتاں'' میں شامل متفرق اور متنوع مضامین میں چند کے عنوانات یہ ہیں:زندگی کی پگڈنڈیاں،ہم سفر(امتیاز علی تاج کے قتل پر)،لیل ونہار،شاعر مشرق سے میری ملاقات، میں اور میرا فن،میری ادبی زندگی کی ابتداء،تحفے،ادب میں جدت(جدیدیت پسندوں پر طنز)اکثر مضامین کا انداز افسانوی اور اسلوب تخلیقی ہے۔ذاتی تاثرات پر مبنی مضامین کا زیرِنظر مجموعہ بھی حجاب کی مقبول عام کتابوں میں شامل ہے۔

حجاب امتیاز علی،''لیل ونہار''،صفحات:۱۶۸،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۹۸ء

''لیل ونہار''۔حجاب امتیاز علی کے روزنامچے(ڈائری)کے چند اوراق کا مجموعہ ہے۔

''لیل ونہار'' میں(حجاب کی ذاتی ڈائری سے)۲۵مئی ۱۹۴۲ء سے لے کر ۲۸مئی ۱۹۴۳ء تک کے اندراجات لیے گئے ہیں۔ حجاب کی انتہائی ذاتی اور گھریلو نوعیت کے اس روزنامچے میں بھی ان کے افسانوی اسلوب کی رنگینی اور رعنائی موجود ہے۔حجاب کی شخصیت کا خلوص،سادگی،فطرت پسندی،اور محبت ومروت ڈائری کے اوراق میں ہویدا ہے۔لیل ونہار۔میں تصنیف وتالیف،مطالعہ کتب،ادب و ثقافت،اور احباب کے حوالے سے بے حد اختصار کے ساتھ مختلف تذکرے ہیں لیکن سیاسی منظرنامے کی ہلکی سی جھلک بھی موجود نہیں؛ فقط خارج اور داخل کے حسین اور رومان انگیز منظر ہی ڈائری کا حصہ بن سکے ہیں۔

داؤد رہبر،''باتیں کچھ سریلی سی''،صفحات:۱۸۸،زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

''باتیں کچھ سریلی سی'' سرسنگیت کے حوالے سے لکھے دلچسپ اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے۔

اس مجموعے میں موسیقار مسلمان گھرانوں،بیسویں صدی کے ہندو گائیکوں اور نسوانی آوازوں پر مضامین کے علاوہ سروں، راگوں اور سنگیت کی قسموں پر بھی اظہار خیال ہے۔

مصنف نے اپنے مشاغل موسیقی پر بھی لکھا ہے اور برصغیر سے باہر ہندوستانی سنگیت کی سرگرمیوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مصنف کی رواں دواں اور شگفتہ نثر نے موسیقی سے متعلق اس کتاب کو ایک ادب پارہ بنا دیا ہے۔ مصنف کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرنظر پاکستانی ایڈیشن سے پہلے یہ کتاب چھپ کر بھارت کے اہل فن سے داد حاصل کر چکی ہے۔ (ص ۹)

داؤد رہبر، ''پراگندہ طبع لوگ''، صفحات: ۳۲۲، زیرنظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''پراگندہ طبع لوگ'' ایسے شخصی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں مصنف کی ذات، احساسات، اور کسی حد تک سوانح بھی جلوہ گر ہے۔ انتظار حسین نے اپنے دیباچے میں کتاب کے منفرد اور مختلف ہونے کے بارے میں لکھا:

> ''یہ دوسری قسم کی کتاب ہے۔ اسے Portraits کی گیلری کہہ لیجئے۔ چہروں کی ایک پوری ندی۔ ایک مرقع۔ رنگ رنگ کے لوگ۔ اور جسے دیکھو پراگندہ خاطر، پراگندہ دل۔ کوئی سنکی، کوئی خبطی، کوئی خفقانی، کوئی مراقی اور کوئی سچ مچ کا دیوانہ۔ داؤد رہبر کو ماڈل ٹاؤن لاہور سے بوسٹن تک کے سفر میں کیا کیا آدم ملا ہے اور انہوں نے کس سادگی اور بے تکلفی سے اس خلقت کو بیان کیا ہے''۔ (ص ۵، ۶)

مصنف کے مختصر دیباچے پر تاریخ تحریر ۱۸۔ اگست ۱۹۹۵ء درج ہے۔

داؤد رہبر، ''سلام و پیام (مکاتیب)''، صفحات: ۴۹۹، زیرنظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

''داؤد رہبر کے خطوط کا یہ مجموعہ اعجاز حسین بٹالوی اور ضیاء محی الدین کی کوششوں سے مرتب ہوا۔ مجموعے کے شروع میں اعجاز حسین بٹالوی کا پیش لفظ (یک الف بیش نہیں......) اور ضیاء محی الدین کا مضمون (کبیرے کا پنچھی) داؤد رہبر کی شخصیت، پردیس میں قیام اور مکاتیب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

داؤد رہبر نے اپنے مختصر دیباچے میں امریکہ میں سکونت، نامہ نویس کے محرکات اور خطوط کی جمع آوری کا احوال بیان کیا ہے۔ داؤد رہبر کے مکاتیب میں ان کے مضامین کی طرح ادبیت، شگفتگی، والہانہ پن اور شائستگی بڑی فراوانی سے ہے نیز احباب کے مراتب کا احساس اور اپنے خلوص کا اظہار بھی ہر خط میں موجود ہے۔

مجموعے میں شامل زیادہ خطوط علمی، ادبی، صحافتی اور ثقافتی شخصیات کے نام ہیں۔ چند شخصیات کے نام درج ذیل ہیں:

ضیاء محی الدین، خادم محی الدین، مولانا صلاح الدین احمد، ن۔ م راشد، اعجاز حسین بٹالوی، آغا بابر، عاشق حسین بٹالوی، جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، مشفق خواجہ، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، مالک رام، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، غلام رسول مہر، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ، قیوم نظر، ڈاکٹر وزیر آغا، شاہد احمد دہلوی، مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر

اسلم فرخی، ڈاکٹر آصف فرخی ۔مکتوب الیہم کا مختصر تعارف بھی مجموعے کے آغاز میں موجود ہے۔

داؤد رہبر، ''نسخہ ہائے وفا''، صفحات: ۳۲۰، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

زیرِ نظر مجموعے میں داؤد رہبر کی فلسفیانہ مضامین، شخصی خاکے، دیس اور پردیس کی یادیں اور راگ رنگ کی باتیں ذاتی اور سوانحی انداز میں گھل مل کر ایک نئے ادبی اور اسلوبی ذائقے کو متشکل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ مجموعے میں شامل اکثر مضامین ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء کے دوران میں لکھے گئے تھے۔مولانا صلاح الدین احمد کتاب کے تفصیلی تعارف میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر رہبر نے اپنے ان پارہ ہائے انشاء میں زندگی کے سادہ حقائق کو جس انداز سے لطافتِ بیان کا لباس پہنایا ہے، وہ کچھ انہیں سے خاص ہے۔ وہ ہماری زبان میں اس نوع کی نگارشات کے مجدد ہیں۔لیکن مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ ان کے اس چراغ سے چند اور چراغ بھی جلیں گے اور وہ اسلوب جو آج ایک ایجادِ لطیف ہے، کل ایک روایت سدید کا درجہ اختیار کر لے گا''۔(ص ۱۱)

سردار محمد چودھری، ''متاعِ فقیر''، صفحات: ۲۰۴، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

''متاعِ فقیر'' سردار محمد چودھری کی خودنوشت سوانح ہے جو انہوں نے بڑے سیدھے سادے انداز میں بیان کی ہے۔ سردار محمد چودھری نے اپنے بزرگ، دیہی ماحول، تعلیم، ترقی اور ایک اہم عہدے (انسپکٹر جنرل آف پولیس پنجاب) تک پہنچنے، ریٹائرمنٹ اور مہلک بیماریوں کا سامنا کرنے تک کی ساری کہانی کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ قاری واقعات کے وقوع کا اپنے آپ کو ''شاہد'' محسوس کرنے لگتا ہے۔انداز بیان ادبی اور جمالیاتی نہیں ہے لیکن پڑھنے جانے کی خوبی ضرور رکھتا ہے۔اشفاق احمد کا اس خودنوشت کے حوالے سے تاثر کچھ یوں ہے: ''سردار محمد چودھری کی خودنوشت پڑھتے وقت خود مصنف کی جو تصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ ایک سچے مگر غریب مسلمان اور دردمند پاکستانی کی تصویر ہے''۔(پس سرورق) کتاب کے دیباچے (عرض مولف) پر ۱۵۔اگست ۱۹۹۸ء کی تاریخ درج ہے۔

سعیدہ مشکور، ''بیگم کی ڈائری''، صفحات: ۲۲۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

''بیگم کی ڈائری''۔مشکور حسین یاد کی بیگم سعیدہ مشکور کا روزنامچہ ہے، جس کا مرکزی موضوع خود مشکور حسین یاد ہیں۔

زیرِ نظر ڈائری اپنی طرز کی منفرد، مختلف، دلچسپ، رنگین لیکن مقصدیت کی حامل کتاب ہے۔بیگم کی ڈائری کا ذیلی عنوان ''شادی شدہ زندگی کی رومان پرور لطافتوں سے بھرپور کتاب'' ڈائری میں موجود خصوصیات کو واضح کر رہا ہے۔کتاب کا دیباچہ سعیدہ مشکور اور مشکور حسین یاد کے ایک دلچسپ مکالمے پر مبنی ہے۔ناشر نے اپنے شذرے میں لکھا ہے:

> ''اس کتاب کو پڑھ کر ایک پرلطف تجسس یہ بھی پیدا ہوتا ہے اور اخبارات و رسائل میں اس پر

خوب بحث بھی چلی کہ یہ تصنیف اصل میں ہے کس کی؟ بیگم سعیدہ مشکور کی یا ان کے معروف انشاء پرداز خاوند سید مشکور حسین یاد نے اس کو تحریر کیا ہے۔ ہم نے اخبارات و رسائل کی بحث سے اور مشکور حسین یاد کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تصنیف خواہ کسی کی ہو یہ ڈائری بیگم سعیدہ مشکور کے بغیر لکھی نہیں جا سکتی تھی''۔ (ص:۱۹)

بیگم کی ڈائری۔ ازدواجی زندگی کی شگفتہ کیفیتوں کا ایک شائستہ اظہار ہے۔

سلمان بٹ، ''سفید بال''، صفحات:۲۰۲، زیرِ نظر ایڈیشن:۱۹۸۶ء

'سفید بال'' خوش مزاج و خوش فکر ادیب سلمان بٹ (مرحوم) کے سینتالیس انشائیوں پر مبنی مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق سلمان بٹ کی تحریروں میں: ''موضوعات کا نیا پن بھی ملتا ہے اور انشائیے کی جملہ خصوصیات بھی موجود ہیں'' (پیش لفظ بعنوان ''سلمان بٹ، قہقہہ اور انشائیہ'' ص:۱۰، سن تحریر ۱۹۸۶ء) مشکور حسین یاد کی رائے یہ ہے:

''سلمان بٹ کا مزاج اس اعتبار سے قطعی طور پر ایک انشائیہ نگار کا مزاج تھا کہ وہ زندگی کو اپنے حوالے سے بھرپور انداز میں دیکھنے کا ہمیشہ متلاشی رہتا تھا''۔ (فلیپ)

چند انشائیوں کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

لفٹ، باتھ روم، سفید بال، کتابی کیڑے، قصہ کرسی کا، نوید اذیت، خطبہ صدارت، کچھ مونچھوں کے بارے میں، دن منانا۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، ''کلام نرم و نازک''، صفحات:۳۳۶، زیرِ نظر ایڈیشن:۲۰۰۴ء

''کلام نرم و نازک'' ڈاکٹر سلیم اختر کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سلیم اختر نے بتایا کہ زیرِ نظر مجموعے کا ایک حصہ ''کلام نرم و نازک'' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا؛ دوسرا حصہ غیر مطبوعہ رہا (اور اس کے لیے عنوان طنزانیہ تجویز کر رکھا تھا)۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضامین کو فقط طنزیہ تحریریں کہا اور ان میں مزاح ہونے سے انکار کیا ہے؛ نیز انہیں اپنی سوشل کمٹ منٹ کا مظہر اور ایک نوع کے ''کڑوے بادام'' کہا ہے۔ (ص ۶، ۷)

کتاب میں فکر تونسوی کا ایک شگفتہ دیباچہ ''پہلے مجھے پڑھیے'' اور سید ضمیر جعفری کا پیش لفظ بعنوان ''پیش دستی'' بھی شامل ہے۔ ضمیر جعفری کے پیش لفظ پر تاریخ تحریر ۸۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء درج ہے۔ مجموعے میں شامل چند مضامین کے عنوانات یہ ہیں: زندگی برباد کرنے کا نسخہ، خاوند کو خوار کرو، بیوی کو بیزار کرو، منافقت۔ بہترین خوبی ہے، سی آئی اے۔ مجھے خرید لو، کس رزق سے موت اچھی ہے؟ استحصال کی جنت، زنانہ کرکٹ میچ، کمنٹری۔ بے اولاد کے فوائد، مجھ سے میرے دوستوں کو بچاؤ۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مضامین میں اصلاح احوال کا جذبہ، طنز کی کاٹ، خلوص کا عنصر اور تنقید کی خوبی آمیز ہو گئی ہے۔ طنزیہ ادب میں ''کلام نرم و نازک'' اہمیت کا حامل رہے گا۔

شفیق الرحمٰن، ''مجموعہ شفیق الرحمٰن''، (دوجلدیں)، پہلی جلد: صفحات: ۶۳۱، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء
دوسری جلد: صفحات: ۷۰۳، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

''مجموعہ شفیق الرحمٰن''۔ شفیق الرحمٰن کی تمام طنزیہ ومزاحیہ تخلیقات پر مبنی کلیات ہے جو کہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ شفیق الرحمٰن سنگ میل کے اشاعتی قافلے میں ذرا تاخیر سے شامل ہوئے۔ کلیات کی اشاعت سے قبل سنگ میل پبلی کیشنز نے شفیق الرحمٰن کی تمام کتب شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ (گو کلیات کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں ہوئی لیکن طنز ومزاح کے شعبے میں دو جلدوں پر مشتمل کلیات کا شائع ہونا خاصا اہم واقعہ ہے اسی سبب سے اسے توضیحی فہرست میں شامل کیا گیا ہے ورنہ توضیحی فہرست کی ترتیب وتدوین ۲۰۰۲ء تک محدود ہے)

کلیات کی پہلی جلد میں شفیق الرحمٰن کے درج ذیل مجموعے شامل ہیں: کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں۔

پہلے مجموعے ''کرنیں'' کا دیباچہ حجاب امتیاز علی نے لکھا تھا اور اس پر سن تحریر ۱۹۴۲ء درج ہے۔ دیباچے سے ایک اقتباس:

> ''ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی کہانیوں میں تکلف اور پیچیدگیاں مطلق نہیں ہوتیں۔ ان کے رومانی اور تفریحی، دونوں قسم کے افسانوں میں اک بے ساختگی اور روانی ہے۔ افسانہ واقعات سے زیادہ کرداروں کے طرزِعمل سے نشو ونما پاتا ہے۔ وہ کرداروں کے ذہنی تجزیے سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے۔ ان کے خارجی طرزِعمل سے لطف و دلچسپی پیدا کرتے ہوئے تیزی سے گزر جاتے ہیں''۔ (ص۶، ۷)

زیر نظر کلیات ''مجموعہ شفیق الرحمٰن'' کی دوسری جلد میں درج ذیل مجموعے شامل ہیں:

پچھتاوے، مزید حماقتیں، دجلہ، دریچے، انسانی تماشا۔ شفیق الرحمٰن کی مزاحیہ کہانیاں اور مضامین شگفتگی اور شائستگی کے امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔ شفیق الرحمٰن طنز ومزاح کے تمام حربے بروئے کار لاتے ہیں لیکن اپنی عبارت واشارت میں عام آدمی کی ذہنی سطح ہمہ وقت سامنے رکھتے ہیں۔ ان کا طرزِ اظہار فطری اور سادہ ہے؛ نیز ہر قسم کی شخصی، تہذیبی اور ادبی ''مقامیت'' سے بچا ہوا ہے۔

ضمیر جعفری، سید، ''ضمیر حاضر، ضمیر غائب''، صفحات: ۲۸۷، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

''ضمیر حاضر، ضمیر غائب''۔ سید ضمیر جعفری کی ذاتی ڈائری کے چند منتخب حصوں پر مشتمل ہے؛ ان منتخب حصوں میں ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۰ء کے واقعات کا روزنامچہ مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

> ''زیر نظر کتاب میری ڈائری کے چند برس کے اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ نہ میری پوری زندگی ہے، نہ پورا سچ ہے۔ یہ چند جھلکیاں ہیں۔ ڈوبتی ابھرتی۔ دوڑتی بھاگتی۔ حاشیے۔ لکیریں!!'' (ص۷،

تاریخ تحریر: یکم جنوری ۱۹۸۸ء)

اس ڈائری کا اسلوب مصنف کے ابتدائی ادبی دور کا غماز ہے لیکن اس میں وہ بے ساختگی، وارفتگی اور شگفتگی موجود ہے جو بعد ازاں ان کے شعر و نثر کی خاص پہچان بنی۔ ایک عام آدمی کی خارجی تگ و دو اور ایک حساس شخص کی باطنی سرگذشت تخلیقی شان کے ساتھ ان اوراق میں ہویدا ہے۔ اس ڈائری کی سب سے خوبصورت، پرتاثیر اور دل پذیر عبارت وہ ہے جو ضمیر جعفری نے اپنی پہلی بیگم کی وفات پر لکھی (جو صرف چار پانچ برس کی رفاقت کے بعد اور پہلے بچے کی پیدائش سے ذرا پہلے جہان فانی سے کوچ کر گئیں)۔

عشرت رحمانی، ''عشرت فانی''، صفحات: ۵۲۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۵ء

''عشرت فانی'' معروف ادیب و شاعر اور براڈ کاسٹر عشرت رحمانی کی خودنوشت سوانح ہے۔ اس میں آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کا پہلو نمایاں ہے۔ عشرت رحمان نے ''حرف گفتنی'' میں خودنوشت کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے:

> ''اس کتاب میں بیشتر اس دور کے حالات و واقعات کا تذکرہ ہے جس سے میں سن شعور سے لے کر اب تک گزرا اور ان سے میرا براہ راست یا بالواسطہ، کسی بھی حیثیت سے تعلق رہا، نیز ان اکابر مشاہیر کا ذکر ہے جن سے میری ملاقات ہوئی یا ان کی ذات وصفات سے مجھے دور یا قریب کی نسبت رہی...... غرض یہ کہ یہ میرے عہد رفتہ کے ایام کی آپ بیتی ہے۔ محض انفرادی و ذاتی سرگذشت نہیں ہے''۔ (ص ۱۸، ۱۹)

اس خودنوشت میں عشرت رحمانی کی ذاتی و تعلیمی زندگی کے ساتھ ساتھ ریڈیو کی ملازمت کے تجربات، لکھنو، ڈھاکہ، لاہور اور کراچی کے علمی، ادبی، سیاسی اور نشریاتی منظر نامے اور پاک و ہند کی محترم، معتبر اور متنازع شخصیات کے تذکرے موجود ہیں۔ مصنف نے حالات و واقعات کی کثرت کو اپنی چشم دید گواہی، گہرے احساس، دیانتدارانہ اظہار اور منظّم بیانیے سے ایک وحدت میں بدل دیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کتاب کے فلیپ پر اپنی رائے دیتے ہوئے خودنوشت کے اندازِ تحریر کو نہایت ڈرامائی اور دلچسپ قرار دیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ دہلوی، مرزا، ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ''، صفحات: ۱۶۴، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

مرزا فرحت اللہ بیگ۔ اردو کے نثری اسالیب کی روشن روایت کا درخشندہ ستارہ ہیں اور ان کی تحریر ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' ایک عمدہ، شگفتہ اور شائستہ نثر پارہ بھی ہے اور ایک سہ ابعادی تہذیبی مرقع بھی۔

''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' اپنی مقبولیت کے باعث برصغیر کے تقریباً تمام اہم اشاعتی مراکز سے بارہا چھپا اور مختلف تعلیمی درجوں کے اردو نصابات میں شامل رہا۔ سنگ میل کے زیر نظر ایڈیشن میں ایک تفصیلی مضمون/ مقدمہ بھی (مصنف کے نام کے بغیر) شامل ہے؛ اس مضمون میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری اور ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے؛ اس مقدمے

سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''یادگار مشاعرہ'' کی مقبولیت اور اہمیت بیک وقت کئی اسباب کی بنا پر ہے اسے بعض ایک ایسا مضمون قرار دیتے ہیں، جس میں گذشتہ ادبی روایتوں، طور طریقوں، آداب معاشرت اور لباس وتہذیبی لوازمات کے رنگ جمع ہیں۔ اس کے مطالعہ سے تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ماضی کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ گویا تاریخی مضمون نہیں لیکن اس میں جو تاریخیت پائی جاتی ہے اور ایک خاص عہد کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی معلومات جس حسن وخوبی کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا.... یہ مشاعرہ کہیں سچ مچ منعقد نہیں ہوا تھا۔ اس کی حقیقت ایک افسانے کی سی ہے۔ لیکن اس میں مختلف کڑیوں کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ اس عہد کی مجلسی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے''۔ (ص ۴۶، ۴۷، ۴۹)

فضل علی المخلص بہ فضلی، ''کربل کتھا''، صفحات: ۲۴۶، سن اشاعت ندارد

فضل علی فضلی کی تصنیف ''کربل کتھا'' کا شمار اردو کی ابتدائی نثری تصنیفات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مقام تصنیف جنوبی ہند کے بجائے شمالی ہند ہے۔ اس کا موضوع واقعہ کربلا ہے، آغاز میں فضلی کا دیباچہ، حمد وثناء، منقبت اور قصیدہ موجود ہے۔

کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر محمد احسان الحق نے لکھا ہے جس میں وہ ''کربل کتھا'' اور اس کی اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''فضل علی فضلی شمالی ہند کا اولین صاحب کتاب نثر نگار ہے.... کربل کتھا.... مغل بادشاہ، محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء (بمطابق) ۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں تصنیف ہوئی تھی.... کربل کتھا ٹیوبن گن یونیورسٹی کے سپرینگر (Sprenger) ذخیرہ کتب میں محفوظ پڑی تھی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۶۱ء میں اس یونیورسٹی سے اس کا عکس حاصل کر کے دہلی سے اسے مفید حواشی ومقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا.... کربل کتھا کا پیش نظر متن ڈاکٹر فاروقی صاحب کے نسخے کی عکسی طباعت ہے...... کربل کتھا لسانی اعتبار سے بڑی اہم کتاب ہے.... اگر کربل کتھا کے متن میں تصرف کر کے محض املاء کی حد تک ہی جدید انداز اختیار کر لیا جائے تو یہ کتاب دور جدید کی نثر سے بہت قریب آ سکتی ہے''۔ (مقدمہ: تاریخ تحریر: ۲۹ جولائی ۱۹۸۲ء) (ص: ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۴)

کتاب کے آخر میں ایک مبسوط فرہنگ بھی موجود ہے۔

فلک پیا، میاں عبدالعزیز؛ ''آسمان اور آنسو''، صفحات: ۱۲۷، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۰ء

''آسمان اور آنسو'' میاں عبدالعزیز فلک پیا کے غیر مطبوعہ نثر پارے ہیں جنہیں زریں صلاح الدین اور حفیظ جہاں عزیز نے مرتب و مدون کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے کتاب کے آغاز میں (اور پس سرورق پر) درج ہے؛ وہ فلک پیا کی باکمال نثر نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''فلک پیا'' صاحب طرز ادیب تھے۔ انہوں نے اردو کی کلاسیکی روایت سے زیادہ جدید انگریزی اور فرانسیسی ادب سے ناطہ جوڑا۔ وہ ان دونوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ اسی سے انہوں نے اپنے اسلوب کی شمع روشن کی اور تخیل کی ایک نئی بستی آباد کر دی۔ ان کا زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا اپنا انداز تھا جس سے نثر میں خاص طرح کی شادابی آ گئی ہے۔ مشرقی ادب میں فارسی زبان و ادب اور کلام اقبال ان کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ اقبال کے ہاں ''خدا'' سے ایک خاص طرح کی بے تکلفی فلک پیا کو لبھاتی ہے۔ جسے انہوں نے اپنے منطقی انجام تک پہنچایا۔ (ص ۶)

مجموعے میں شامل نثر پاروں کے عنوان درج ذیل ہیں: افلاک سیاست، سیاست اور جائزہ گرد و پیش، آنکھ جو دیکھتی ہے، عظمت انسان اور فلسفہ فنا، مامتا کا نور، کئی تصویریں، حسن ذوق و خود آگہی، سچائی کے قافلے، انقلابات زمانہ، فلسفہ غم حیات جاوداں، قوس قزح کے گھونگھٹ، ڈائری کے اوراق، نظریہ دین، خدا کی تلاش، تدبیر کا شعور، خوف اور امید، نکتہ چیں۔

فلک پیا کے نثر پارے: مضمون، ڈائری، مکالمہ، اختصاریہ، افسانچہ گویا نثر کی تمام تخلیقی اصناف کا ذائقہ رکھتے ہیں؛ موضوعات میں تنوع، فکر میں گہرائی اور اسلوب میں تازگی: فلک پیا کی پہچان ہیں۔

فلک پیا، میاں عبدالعزیز؛ ''مضامین فلک پیا''، صفحات: ۳۷۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۶ء

میاں عبدالعزیز، فلک پیا کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے تھے اور یہ مضامین معروف ادبی مجلّے ہمایوں میں چھپا کرتے تھے۔ ہمایوں کے مدیر میاں بشیر احمد لکھتے ہیں:

> ''جنوری ۱۹۲۲ء میں ہمایوں کا پہلا پرچہ شائع ہونے پر مجھے انہوں نے اپنا پہلا مضمون ''میں کیا ہوں'' دیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ان کے اچھوتے خیالات صرف ہمایوں کی زیب و زینت بنے رہے۔ آخری مضمون جنوری ۱۹۳۶ء کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ یہ مضامین جس ترتیب سے لکھے گئے اور ہمایوں میں چھپے اب سوائے پہلے دو مضامین کے بعینہ اسی ترتیب سے

کتابی صورت میں بھی چھپ رہے ہیں‘‘۔(دیباچہ:ص۸)

اس مجموعے میں شامل مضامین میں سے چند کے عنوانات ملاحظہ ہوں: میں کیا ہوں؟، بے صبروں کا دوزخ، خودمختار رقاصہ، ابلیس اور عورت، فاترالعقل سورج، قاضی دیگ بر، رفع دفع، ساڑھی اور سوٹ، شیطان اور بزرگ، بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی، میرا سخت ترین نقاد، دریائے لطف، پھوہڑ بیوی کی اکاون لاکھ علامتیں، شملے میں گفتگو کا خون۔

قدرت اللہ شہاب،’’شہاب نامہ‘‘،صفحات:۱۱۸۱،زیرِنظر ایڈیشن:۱۹۸۷ء

’’شہاب نامہ‘‘۔قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت سوانح ہے،اس میں صرف آپ بیتی کے ہی نہیں، جگ بیتی کے بھی رنگ گہرے ہیں۔ اٹھاون ابواب پر مشتمل اس ضخیم خودنوشت کو قدرت اللہ شہاب نے اپنے سحر طراز افسانوی اسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری روانی، دلچسپی، تجسس اور تحیر کے ساتھ اس ضخامت کو بہ آسانی عبور کر جاتا ہے۔

شہاب کا اسلوب ہی افسانوی نہیں،خودنوشت کی فضا،تناظر کی تشکیل اور کرداروں کی تعمیر بھی ایک افسانہ نگار کے قرینے کی غمازی کر رہی ہیں۔

’’شہاب نامہ‘‘ میں قدرت اللہ شہاب کی شخصی روداد کے ساتھ ساتھ پاکستان، کشمیر، عالم اسلام، دینی عقائد،تصوف اور مابعدالطبیعاتی دنیا اپنی اہم جزئیات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

تاریخی، سیاسی اور ادبی حوالے سے قدرت اللہ شہاب کے کچھ بیانات نزاعی ثابت ہوئے اور مابعدالطبیعاتی واقعات کی صداقت کے ضمن میں کئی سوالات اپنی جگہ پر آج بھی موجود ہیں،لیکن اس کے باوجود اردو ادب کی نثری روایت میں’’شہاب نامہ‘‘ ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرۃ العین حیدر،’’پکچر گیلری‘‘،صفحات:۱۶۰،زیرِنظر ایڈیشن:۲۰۰۱ء

قرۃ العین حیدر کے نثر پاروں پر مبنی’’پکچر گیلری‘‘ چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں قرۃ العین حیدر پر ابن سعید کا مضمون اور اس مضمون پر قرۃ العین حیدر کا فٹ نوٹ ہے۔ دوسرا حصہ قرۃ العین حیدر کے ایک مضمون بعنوان’’افسانہ‘‘ پر مشتمل ہے۔تیسرے حصے پکچر گیلری میں درج ذیل عنوانات سے شخصی خاکے ہیں۔

سید سجاد حیدر یلدرم، داستان طراز (محمد علی ردولوی)،مولانا مہر،محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی، پکچر گیلری کی ایک تصویر (شاہد احمد دہلوی)،کچھ عزیز احمد کے بارے میں، چاند نگر کا جوگی (ابن انشاء)

کتاب کا چوتھا حصہ ایک رپورتاژ بعنوان’’دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں‘‘ پر مشتمل ہے۔اس افسانہ نما رپورتاژ میں حیدرآباد دکن کی تین تصویریں روشن ہوتی ہیں: ماضی کا چمکتا دمکتا حیدرآباد،مٹتی ہوئی تہذیب و اقدار کا حیدرآباد، نیا اور تروتازہ حیدرآباد۔

پکچر گیلری متنوع موضوعات و اصناف پر مبنی ایک مختصر کتاب ہے جسے قرۃ العین حیدر کے دلاویز اسلوب نے ایک شگفتہ اور تخلیقی تسلسل اور یک جائی عطا کی ہے۔ پکچر گیلری پہلی بار قوسین لاہور نے شائع کی تھی۔

کشور ناہید، ''بری عورت کی کتھا''، صفحات: ۱۷۴، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

''بری عورت کی کتھا'' کشور ناہید کی خود نوشت سوانح ہے؛ جو بنیادی طور پر صرف ۱۴۱ صفحات پر مشتمل ہے؛ بقیہ صفحات پر تصاویر، دومراسلے، اخباری تراشے وغیرہ ہیں۔ یہ مختصر سوانح کشور ناہید کی زندگی، فکر، نقطہ ہائے نظر، مسائل، مصائب، اقارب، احباب اور جذبات واحساسات کی کتھا سنانے میں کامیاب رہی ہے۔

کشور ناہید نے اس خود نوشت میں واقعات کا تذکرہ اچٹتے ہوئے انداز میں لیکن نقطہ ہائے نظر کا اظہار جم کر کیا ہے؛ اس خود نوشت کی پہلی انفرادیت تو یہی ہے؛ دوسری انفرادیت ایک عورت کی حق گوئی ہے؛ ایک ایسے معاشرے میں جہاں سچ کو چھپا لینا، عافیت میں رہنے کا پہلا نکتہ ہے۔ کشور ناہید کی آپ بیتی، عورت بیتی بھی ہے؛ کیونکہ عورت کے مسائل اور اس کے بارے میں ذہنی رویے پوری طرح ہر باب میں نظر آ رہے ہیں۔

کشور ناہید (مترجم)، ''لیلیٰ خالد''، صفحات: ۲۲۸، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۰ء

زیر نظر کتاب معروف فلسطینی مجاہدہ اور شاعرہ ''لیلیٰ خالد'' کی آپ بیتی ہے اور ارض فلسطین کے حالات اور فلسطینیوں کے مصائب اور جہاد پر ایک اہم گواہی عصر کی عدالت میں پیش کر رہی ہے۔

حرف آغاز میں (مترجم) کشور ناہید نے بتایا کہ لیلیٰ خالد کی آپ بیتی انہوں نے خود تصنیف نہیں کی بلکہ بول کر ریکارڈ کروائی اور جارج حجاز نے تیس گھنٹے پر مشتمل اس ریکارڈنگ کو تحریر اور گلب پاشا کے تعارف کے ساتھ امریکہ سے شائع کیا۔ (ص ۹)

آپ بیتی سات ابواب پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۰ء تک کے حالات کا تجزیہ واحاطہ کرتی ہے۔ ابواب کے عنوانات کچھ یوں ہیں:

زینہ، تعلیم اور انقلاب، کویت میں جلاوطن، نئی انسانیت کا اعلامیہ، امریکہ میں فلسطین، اردن میں امریکہ، ہم گم شدہ انسانیت کے ترجمان ہیں۔

کشور ناہید کا ترجمہ رواں دواں اور تخلیقی شان کا حامل ہے۔

لطف اللہ خاں، محمد، ''ہجرتوں کے سلسلے''، صفحات: ۳۱۷، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۸ء

یہ محمد لطف اللہ خان کی آپ بیتی ہے جو ہجرتوں سے عبارت ہے؛ انہوں نے مدراس سے حیدر آباد دکن، وہاں سے بمبئی اور قیام پاکستان کے بعد بمبئی سے کراچی ہجرت کی۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''ہجرت، عقیدتاً ایک نیک فال تو ہے ہی، عملاً بھی اچھا شگون ہے۔ پتا نہیں، اوروں کے کیا تاثرات ہیں، ذاتی تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ ہجرت نے میری بہتری کی کئی صورتیں پیدا کیں''۔

(ص (ب)، تاریخ تحریر: ۱۴۔اگست ۱۹۹۸ء)

مصنف نے اس خودنوشت کے آخری دو ابواب اپنے خاص مشاغل ''فوٹوگرافی'' اور ''آڈیو لائبریری'' کے لیے مختص کر رکھے ہیں۔نجی سطح پر ایک بڑی آڈیو لائبریری کا قیام مصنف کا ایک منفرد اور قابل داد کارنامہ ہے؛ جس کی برصغیر میں تو یقیناً اور پوری دنیا میں غالباً کوئی اور مثال نہیں۔

محمد خالد اختر، ''مکاتیب خضر''، صفحات: ۲۶۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۹ء

محمد خالد اختر نے اپنی ذہانت، اسلوب اور تخلیقی تر و تازگی کی نمود کے لیے ایک اور افق دریافت کیا اور مرزا غالب کے انداز میں خط لکھ کر اپنے عصر کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔

خضر کے نام سے، محمد خالد اختر کے طنز و مزاح سے بھرپور یہ مکاتیب معاصر سیاسی، مذہبی، ادبی اور علمی شخصیات کو لکھے گئے۔ کچھ خطوط تاریخی شخصیات مثلاً محمد شاہ رنگیلے اور نپولین بونا پارٹ وغیرہ کو بھی لکھے گئے۔

چند خطوط ذاتی حوالے سے ہیں اور ان میں مصنف نے اپنی شخصیت اور اپنے گھر کو موضوع بنایا ہے؛ اس ضمن میں گھریلو ملازم کے نام (بعنوان ایک چھوٹے لڑکے یعقوب کے نام) لکھا گیا خط سب سے خوبصورت، دلاویز اور دل گیر تحریر ہے۔ اس فن پارے کو رشید احمد صدیقی کے خاکے ''ایوب عباسی'' اور مولوی عبدالحق کے خاکے ''نام دیو'' کے برابر کا رتبہ ملنا چاہیے۔

مکاتیب کی تعداد اکاون ہے اور یہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران میں لکھے گئے اور مختلف ادبی مجلوں میں شائع ہوئے۔ کتاب کا مختصر دیباچہ (تعارف) محمد خالد اختر کے قریبی اور قدیمی دوست محمد کاظم نے لکھا ہے (تعارف پر تاریخ تحریر: ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ء درج ہے)

مظہرالاسلام، ''اے خدا''، صفحات: ۱۸۲، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۹۹ء

''اے خدا''۔مظہرالاسلام کے دعائیہ نثر پارے ہیں جنہیں آزاد نظم کے انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔''اے خدا'' کا ذیلی عنوان یہ ہے: ''آنسوؤں کے پھولوں کے موسم میں آنکھیں کیوں ہجرت کر جاتی ہیں''۔

''اے خدا'' ایک منفرد نوعیت کی کتاب ہے جس میں افسانہ، انشائے لطیف، آزاد نظم، اخباری کالم، طنزیہ مضمون غرض کئی اصناف کا ذائقہ پیدا ہو گیا ہے۔''اے خدا'' کا مصنف اپنے عصر کے سارے کرب اور اپنے باطن کے سارے اضطراب کو کہیں اشاراتی اور کہیں وضاحتی پیرائے میں بیان کر رہا ہے؛ بیان دلاویز بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ کتاب کے آغاز میں، کتاب کی توجیہہ اور اپنی دعاؤں کی توضیح بصورت مکالمہ (مابین مرد و عورت) کی گئی ہے، یہ مکالمہ مظہرالاسلام کی ہر کتاب کا لازمی اور خوشگوار حصہ ہے۔

مظہر سعید شیخ، ''انوکھے سچ''، صفحات: ۱۸۷، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''انوکھے سچ''۔ ایک انوکھی کتاب ہے جس میں مظہر سعید شیخ نے ان واقعات، خطوط اور علم کے تذکرے کو یکجا کیا ہے۔ جو مابعد الطبیعاتی پہلو رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے مصنف نے اپنی حیرتوں میں قاری کو بھی شریک کرنے کی کاوش کی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں ممتاز مفتی سے ملاقات اور خط و کتابت کا تذکرہ، دوسرے میں انوکھے عشق اور تحیر خیز واقعات، تیسرے میں علم نجوم اور دلچسپ پیشن گوئیاں، چوتھے میں روحوں کے متعلق مختلف آرا اور حقائق پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں احمد بشیر کی رائے درج ہے جس میں انہوں نے تحریر کی روانی اور مصنف کی کاری گری کو سراہا ہے۔

کتاب کے پس سرورق پر بانو قدسیہ نے مافوق الفطرت واقعات کے خوبصورت بیان پر مصنف کو داد دی ہے۔

معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر (مرتب)، ''آپ بیتی رشید احمد صدیقی (حیات، افتاد اور فتوحات)''، صفحات: ۳۷۵، زیر نظر ایڈیشن: ۱۹۸۰ء

اس آپ بیتی کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے رشید احمد صدیقی کی مختلف تحریروں کے اقتباسات کی مدد سے مرتب کیا ہے۔

کتاب کے دیباچے (طبع اول، مرقوم: ۱۹۷۴ء) میں مرتب نے بتایا:

> ''۱۹۶۴ء کی بات ہے، میں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کہانی، ان کی زبانی اور انہی کے بیان میں مرتب کی۔ تیس بتیس صفحات کی یہ کہانی، رسالہ ''الزبیر'' کے ''آپ بیتی نمبر'' میں چھپی۔ احباب نے اسے پسند کیا.... رشید صاحب کی ایک سیر حاصل آپ بیتی ترتیب دینے کا خیال دل سے نہ نکلا۔ اسی شوق اور جرات رندانہ کا نتیجہ وہ سب کچھ ہے جسے آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔'' (۱۷، ۱۸)

اس ''مرتبہ'' آپ بیتی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مرتب نے اپنی جانب سے کہیں بھی کسی لفظ کا اضافہ نہیں کیا (البتہ ربط مضمون کے لیے صرف چند مقامات پر کسی ایک آدھ ''بے ضرر'' لفظ کو قوسین میں درج کر دیا ہے)

آغاز میں رشید احمد صدیقی کا ایک مربوط سوانحی خاکہ اور ان کی مطبوعات کی ایک وضاحتی فہرست موجود ہے؛ چونکہ ساری کتاب رشید احمد صدیقی کے اقتباسات پر مبنی ہے اس لیے ہر اقتباس کا حوالہ، حاشیے میں ضرور درج کیا گیا ہے۔

زیر نظر ایڈیشن میں ص ۲۷ سے ص ۵۵ تک اس آپ بیتی کے پہلے ایڈیشن پر ہونے والے مشاہیر کے تبصرے اور آرا شامل ہیں۔ ایک مبسوط اشاریہ بھی موجود ہے۔

کتاب کا ۱۹۸۳ء کا ایڈیشن ۳۲۵ صفحات پر مشتمل ہے؛ اس ایڈیشن میں سید معین الرحمٰن نے کتاب کی آپ بیتی بھی لکھی، جس کے مطابق یہ پہلی بار ۱۹۷۴ء میں اور نظر ثانی اور سوانحی خاکے کے اضافے کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس ایڈیشن میں مشاہیر کے

تحسینی کلمات اوراشاریہ موجودنہیں ہے (البتہ فلیپ پر چند اہل فکر کی آراشامل ہیں) رشید احمد صدیقی نے یہ آپ بیتی خود ملاحظہ اور معین الرحمٰن کی محنت ومحبت کی تحسین کی تھی۔زیرنظر کتاب طبع جدید ہے۔

معین الرحمٰن،سید،ڈاکٹر،''ذکرعبدالحق''،صفحات:۲۰۷،زیرنظرایڈیشن:۱۹۷۵ء

مولوی عبدالحق کے حوالے سے اس منفرد اور دلچسپ کتاب کا تعارف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس طرح کرایا ہے:

> ''بابائے اردو کے احوال زندگی اور ان کی سیرت وشخصیت کے مطالعے پرمبنی،اس کتاب کے دو حصے ہیں: پہلا حصہ ''حیات عبدالحق'' کے اجمالی خاکے پر مشتمل ہے۔اس کا بیشتر حصہ مولوی عبدالحق کی اپنی زبان میں ہے۔اس کی ترتیب وتدوین میں مولوی صاحب کی کم وبیش سب تحریروں کو نظر میں رکھا گیا ہے.... کتاب کا دوسرا حصہ:''ذکرعبدالحق''۔''چند ہم عصر'' کے آئینے میں مولوی عبدالحق کی سیرت وشخصیت کو پیش کرتا ہے.... اس حصے کی ساری عبارتیں مولوی عبدالحق کی تحریریں ہیں اور''چند ہم عصر'' سے ماخوذ ہیں۔انہیں مصنف کے مطالعہ ذات کے نقطہ نظر سے ایک نئی ترتیب دینے کی خدمت البتہ میں نے انجام دی ہے''۔(ص۹،۱۰)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے اس اہتمام اور عرق ریزی سے کتاب میں خودنوشت سوانح کا ذائقہ پیدا ہوگیا ہے۔کتاب کے آخر میں مولوی عبدالحق کی ایک نایاب غیر مطبوعہ تحریر(مع توضیحات) بھی موجود ہے۔

منظورالٰہی شیخ،''درِدلکشا''،صفحات:۱۶۰،زیرنظرایڈیشن:۱۹۹۹ء

شیخ منظورالٰہی کی یہ مقبول عام کتاب پہلے بھی کئی بار شائع ہوئی؛(اس کا چوتھا ایڈیشن۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جس کے صفحات ۱۸۳ تھے)اپنی خوبصورت نثر کے باعث درِدلکشا کو قارئین کے ساتھ ناقدین سے بھی خوب داد ملی۔اس میں شامل ایک معروف مضمون''اے گلستان اندلس'' کے بارے میں مرزا ادیب نے لکھا:''مصنف کی ساری تخلیقی توانائیاں''اے گلستان اندلس'' کے دوران تحریر میں اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی ہیں، یہ تحریر نثر کا شاہکار ہے''۔(پس سرورق) آخری مضمون''قرۃ العین طاہرہ'' پر ہے اور دیگر مضامین کی طرح افسانوی انداز ہی میں لکھا گیا ہے۔سید وقار عظیم کی رائے درست معلوم ہوتی ہے:

> ''درِدلکشا ایک ایسی تخلیق ہے جہاں تاریخ کی صداقتوں میں داستانوں کی دلاویزی اور فلسفیانہ تفکر میں رنگینی وتازگی ہے''۔(پس سرورق)

تمام مضامین کے آخر میں سن تحریر درج ہے۔

منظور الٰہی شیخ، ''سلسلہ روز وشب''، صفحات: ۲۲۸، سن اشاعت ندارد

''سلسلہ روز وشب'' شیخ منظور الٰہی کے متفرق سوانحی مضامین کا ایک باربط، ہم آہنگ اور خوش رنگ مجموعہ ہے۔

اس مجموعے کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''سلسلہ روز وشب کیا ہے؟ سوانح عمری نہیں بلکہ ایک سرگذشت حیات کے چند الگ الگ ٹکڑے ہیں جو الگ الگ بھی ہیں اور ایک لحاظ سے مربوط بھی، زندگی کی طویل لکیر کے چند نقطے جو موتیوں کی مانند چن لیے گئے ہیں۔ لیکن یہ الگ الگ موتی کچھ اس طرح سجائے گئے ہیں کہ ان کی آب وتاب سے ایک بامعنی اور تابدار مکمل زندگی کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے''۔ (فلیپ)

شیخ منظور الٰہی نے اپنی یادوں اور روز وشب کے سلسلوں کو درج ذیل عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔

گئے دنوں کا سراغ، ورق گم گشتہ، پرنس کریم آغا خان، مانوس اجنبی، میرا دوست میرا بھائی، خوشبو کی ہجرت، ہم جلیس ہم صفیر۔

ان مضامین میں ''خوشبو کی ہجرت'' اپنی والدہ، ''میرا دوست میرا بھائی'' اپنے برادر خورد منصور اور ''ہم جلیس ہم صفیر'' حمید احمد خان اور سید فدا حسین کی شخصیتوں اور یادوں کے حوالے سے ہے۔

زیر نظر ایڈیشن کا اندرون پرانا اور سرورق اور اندرون سرورق نیا اور سنگ میل پبلی کیشنز کے نام کے ساتھ ہے۔

منظور الٰہی شیخ، ''نیرنگ اُندلس''، صفحات: ۲۸۲، زیر نظر ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

''نیرنگ اُندلس''۔ منظور الٰہی کی زندہ نثر کا ایک اچھا نمونہ اور اس کا اسلوب اردو کے نثری اسالیب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ گو ''نیرنگ اندلس'' تاریخ وتہذیب کا مرقع ہے لیکن مصنف کے معروضی کے بجائے موضوعی اسلوب کے باعث یہ ادب پارہ بن گیا ہے۔

ہسپانیہ (سپین) پر مسلمانوں کے عظیم الشان اقتدار، علمی، تخلیقی اور تہذیبی کارہائے نمایاں، پھر بے عملی اور طوائف الملوکی کے بعد ایک بھیانک اور المناک انجام۔ اس کتاب کا موضوع ہے؛ منظور الٰہی نے اپنے مخصوص اور سحر طراز نثری اسلوب میں ماضی کے قصے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا تناظر زمانہ حال اور اس کا مخاطب ہر زمانہ اور ہر خطہ بن گیا ہے۔

''نیرنگ اندلس'' کی فہرست ابواب درج ذیل ہے۔

رہ نورد شوق، فتح مبین، موسیٰ بن نصیر، صقر قریش، عروس البلاد، طاؤس و رباب آخر، راڈریگو السید، اشبیلیہ، جنگ بازیافت، بالآخر غرناطہ، دم واپسیں، ادارہ تفتیش واحتساب، انتظامیہ، امارت کا ماخذ، معاشرہ، ثقافت، شاعری، فلسفہ، زوال وسقوط کی وجوہات، مسلم ہسپانیہ کی میراث۔

میرزا ادیب، ''مٹی کا دیا''، صفحات: ۴۰۳، زیرِ نظر ایڈیشن: ۱۹۸۱ء

''مٹی کا دیا'' میرزا ادیب کی خودنوشت سوانح ہے، جس میں میرزا ادیب نے نہایت سچائی سے اپنی ذات اور زمانے کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مشفق خواجہ کتاب کے فلیپ پر اپنا تاثر یوں ظاہر کرتے ہیں:

> ''میرزا ادیب کو اپنے ماضی سے محبت ہے لیکن وہ ماضی کے نوحہ گر نہیں، صورت گر ہیں.... میرزا ادیب نے صرف حالات و واقعات ہی کو نہیں، بلکہ اپنی ذہنی کیفیات اور دلی جذبات کو بھی بڑی خوبصورتی سے لفظوں کے حوالے کیا ہے۔.... ''مٹی کا دیا'' ایک فرد کی داستانِ حیات بھی ہے اور ایک عہد کی ثقافتی دستاویز بھی''۔

کتاب کے آغاز میں میرزا ادیب نے اپنے پیش لفظ میں اپنی خودنوشت سوانح کا تعارف اور توجیہہ پیش کی ہے۔

کتاب تینتیس ابواب پر مشتمل ہے؛ آخری باب میں صرف تصانیف کی تفصیل درج ہے۔ چند ابواب کے عنوان ملاحظہ ہوں۔

یہ میں ہوں، دیا جلتا ہے، کچھ خوف افزا یادیں، میں اور شملہ پہاڑی، میرے ہمدم، میرے دمساز، داداجان کی کتابوں کا صندوق، تہہ خانے کا راز، دو چوریاں، ذکر کچھ پرانے لاہور کا، بھاٹی کا باغ، کچھ سیاسی مناظر، ادب کی ترقی پسند تحریک، ریڈیو میں، رائٹرز گلڈ، ریت کے چمکتے ہوئے ذرے۔

یونس بٹ، محمد، ڈاکٹر، ''بٹ صورتیاں''، صفحات: ۲۳۹، زیرِ نظر ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

''بٹ صورتیاں'' مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے، جس میں سیاسی، ادبی، مذہبی اور علمی شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ الفاظ کی اُلٹ پھیر، جملے کی کاٹ، اور حقیقی اور فرضی معاملات کی آمیزش سے مزاح پارہ تخلیق کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں چند مقبول شخصیات کے حوالے سے پہلے سے موجود تصورات کو یونس بٹ نے اپنے اختراعی تصورات کے ساتھ جوڑ کر شخصیت کو ایک ''باوقار کارٹون'' میں بدلنے کی کاوش کی ہے لیکن کچھ اس سلیقے سے کہ اگر وہ شخصیت بھی اپنی ''سنجیدگی'' کی پیروڈی دیکھے تو مسکرائے۔

اس مجموعے میں زیادہ تر لاہور کے ادیب اور شاعر مزاح نگار کا ''تختۂ مشق'' بنے ہیں۔ ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی پچیس سے زائد کتب سنگ میل سے شائع ہو چکی ہیں اور انتہائی مقبولیت کی حامل ہیں، چند کتابوں کے عنوانات یہ ہیں:

افراتفریح، اینی ٹائم، بٹ تمیزیاں، جوک در جوک، خندکاریاں، شیطانیاں، مزاحیات (وغیرہ)۔

پانچواں باب

حاصلِ مطالعہ

کتاب، مصنف کی تخلیقی اور ناشر کی طباعتی کاوشوں سے اپنی ''تجرید'' سے ''تجسیم'' کی طرف بڑھتی ہے۔

کتاب کے مادی وجود، صوری حسن اور ترسیل و ترویج کا ذمہ دار ناشر ہوتا ہے؛ ہر اچھا ناشر شعور، نفاست اور دیانت سے اشاعتی تاریخ میں اہمیت حاصل کرتا ہے۔

کسی ادبی ناشر/ اشاعتی ادارے کی کامیابی اصل میں معاشرے کی تمدنی، ادب کی تخلیقی اور دانش کی ترسیلی قوت سے مشروط ہے، گویا طباعت کتب، تمدن و تخلیق و دانش کا آئینہ ہے۔ ایک ہمہ جہت اشاعتی ادارے کی مطبوعات کے جائزے سے تمدن و تخلیق و دانش کی ظاہری و باطنی جمالیات بھی منکشف ہوتی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل اشاعت اردو ادب کے حوالے سے نہایت سرگرم مراکز لاہور، حیدر آباد (دکن)، دلی اور لکھنو تھے۔ ۴۷ء اور اس کے بعد کے ہنگامہ خیز اور پر آشوب دور میں اردو مطبوعات کے حوالے سے صرف لاہور کا مرکز اپنا اشاعتی اختصاص برقرار رکھنے میں کامیاب رہ سکا۔

تقسیم ہند کے اثرات کے باعث لاہور کی اشاعت و طباعت کو بھی کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا اور ''دارالاشاعت'' ایسے قدیم و ممتاز ادارے بتدریج زوال پذیر ہو گئے۔ البتہ ''فیروز سنز'' اور ''شیخ غلام علی اینڈ سنز'' ایسے اشاعتی اداروں کی مثالیں بھی ہیں، جنھوں نے مشکلات اور کساد بازاری کے باوجود طباعت کتب خصوصاً اشاعت ادب کا سلسلہ جاری رکھا۔

آزادی کے بعد لاہور میں متعدد طباعتی اداروں کی نمود ہوئی جنھوں نے کئی دہائیوں تک اشاعت اردو ادب کے لیے خدمات انجام دیں لیکن بعد ازاں ان کے استحکام میں خلل پڑا، ان میں کچھ زوال آمادہ ہوئے جبکہ کچھ نے طباعت کتب کا سلسلہ تو قائم رکھا لیکن ادبی کتابوں کی اشاعت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ البتہ چند اداروں نے ادب کی نشر و اشاعت کو ہر حال میں اپنائے رکھا۔ کئی ایسے اشاعتی ادارے بھی معرض وجود میں آئے جنھوں نے آغاز کار میں تو مشکل اور پریشان کن حالات کا سامنا کیا لیکن بعد ازاں خوب کامیابی حاصل کی اور لمحہ موجود میں بھی اپنا استحکام برقرار رکھا ہوا ہے۔ سو اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ طباعتی نشیب و فراز کے باوجود، شہر لاہور، اشاعت اردو ادب کے حوالے سے پورے جنوبی ایشیا میں قدیم ترین ''زندہ'' اشاعتی مرکز ہے۔ لاہور کے اس زندہ، تابندہ اردو دوست اور ادب نواز اشاعتی منظر میں سنگ میل پبلی کیشنز کا ظہور ۱۹۶۲ء میں ہوا۔

برصغیر کے دیگر تمام اہم اشاعتی اداروں کی طرح سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کا آغازِ سفر بھی زادِ سفر کے بغیر ہوا۔ بانی ادارہ نیاز احمد نے شبانہ روز محنت، تجارتی استعداد اور باطنی ذوق جمیل کے باعث سنگ میل کو پہلے نمایاں اور اہم اور پھر صف اول کا اشاعتی ادارہ بنا دیا۔

سنگ میل پبلی کیشنز نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں علمی، ادبی، تاریخی، دینی، قانونی، تکنیکی اور تفریحی کتب ایک بڑی

مقدار میں شائع کر کے اشاعتی دنیا میں ایک بے حد مستحکم حیثیت حاصل کر لی ہے۔

سنگ میل نے اپنے قیام سے ہی اردو ادب کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کتب کو عمدگی اور سلیقے سے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور ۲۰۰۲ء تک اردو ادب سے متعلق سیکڑوں کتب طبع کر چکا ہے۔

ایک نجی اشاعتی ادارہ مالی منفعت کے لیے اشاعت کتب کے کاروبار کو اپناتا ہے۔ سنگ میل نے اس تجارتی ہدف کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیائے اردو کی نایاب کتب اور بھولے بسرے ادیبوں، شاعروں کے خزینوں کو بازیافت کر کے ایک اشاعتی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھ دی ہے۔

تخلیقی کتب کی نسبت تحقیقی و تنقیدی مطبوعات سے اشاعتی ادارے کو منفعت کم ہوتی ہے لہٰذا عموماً اس ''بارگراں'' کو سرکاری و نیم سرکاری اشاعتی ادارے اٹھاتے ہیں۔ سنگ میل کی اس حوالے سے طباعتی خدمات سرکاری و نیم سرکاری اشاعتی اداروں سے کم نہیں ہیں۔ سنگ میل کی تحقیقی و تنقیدی مطبوعات ایک طرف کلاسیکی تنقید کا احاطہ کرتی ہیں، تو دوسری طرف جدید ترین تنقیدی تھیوری کو بھی بہ تفصیل و تشریح قارئین تک پہنچاتی ہیں۔ سنگ میل کی ترسیلی قوت کے باعث تحقیقی و تنقیدی کتب حلقہ خواص سے نکل کر ہر علمی و ادبی حلقے اور ہر کتابی مرکز تک پہنچ گئی ہیں۔ تنقیدی کتب کے حامل مجموعے اور تنقیدی کلیات شائع کرنا سنگ میل کی ایک حیران کن اختراع ہی نہیں، پرُخطر تجارتی فیصلہ بھی تھا جو کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اردو کی تحقیقی و تنقیدی تاریخ کا ایک اہم وقوعہ بن گیا۔

دنیا کی مختلف زبانوں سے تنقیدی کتب کے تراجم کے حوالے سے سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں فقط دو تین مثالیں ہیں۔ (دیگر نجی اشاعتی اداروں کی طرح سنگ میل نے بھی تنقیدی تراجم پر خاص توجہ نہ دی)

سنگ میل نے تحقیق و تنقید کے باب میں کئی اہم محققین و ناقدین کو اپنے اشاعتی منصوبے میں شامل نہ کر کے اپنے اشاعتی دائرے کو محدود اور طباعتی غیر جانبداری کو متاثر بھی کیا۔

سنگ میل نے اہم اور تاریخی حیثیت کی مالک دولسانی لغات شائع کر کے ایک عظیم لسانی اور تکنیکی خدمت انجام دی ہے۔ سنگ میل کی اپنی مرتبہ اردو لغات (دیگر ایک دو اشاعتی اداروں کی مرتبہ لغات کی مانند) بے پناہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔

تخلیقی کتب کی اشاعت میں سنگ میل کی زیادہ توجہ افسانوی ادب (داستان، ناول، افسانہ، ڈراما) کی جانب رہی۔ سنگ میل نے ''طلسم ہوش ربا'' کی سات، ''فسانۂ آزاد'' کی چار ضخیم جلدوں کی طباعت اور ''باغ و بہار'' کے قدیم نسخے کی اشاعت نو کر کے کلاسیکی افسانوی ادب کو محفوظ کرنے کے لیے پاکستان کے تمام سرکاری و نجی اداروں سے بڑھ کر روشن ترین خدمت انجام دی ہے۔ سنگ میل نے قدیم و جدید اہم ناولوں کی طبع نو کے ساتھ ساتھ نئے ناولوں کی اشاعت اول کا بھی عمدہ اہتمام کیا۔ کلاسیکی افسانے کے ساتھ ساتھ نئے اور جدید تر افسانے کو بھی اشاعتی منصوبے میں شامل رکھا اور افسانوں حتیٰ کہ ناولوں کے کلیات طبع کرنے کا تحیر خیز سلسلہ شروع کیا۔ افسانوی

تراجم مناسب تعداد میں شائع کیے۔

سنگ میل نے اس شعبے میں بھی کئی اہم معاصرین سے اشاعتی طور پر صرفِ نظر کیا۔(بصورت دیگر: چند اہم معاصر افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی طباعتی شمولیت سے سنگ میل کی افسانوی مطبوعات کی فہرست کو اردو کی افسانوی نثر کی فہرست کا درجہ حاصل ہو جاتا)

ڈرامے کے بارے میں عام خیال یہی رہا کہ یہ پڑھے جانے والی صنف نہیں ہے لیکن سنگ میل نے ڈراموں کے پچاس سے زائد ضخیم مجموعے شائع کر کے اس خیال کا بطلان کر دیا۔ سنگ میل نے اردو ٹیلیویژن ڈرامے ایک بڑی تعداد میں شائع کر کے اس باب میں بھی دیگر اداروں پر اشاعتی فوقیت حاصل کر لی ہے۔ ڈرامے کے شعبے میں بھی کئی اہم معاصرین سے سنگ میل کا اشاعتی و طباعتی ربط پیدا نہیں ہوا۔

سنگ میل نے قدیم کلاسیکی شعرا کے ضخیم مجموعوں اور کلیات کے ساتھ ساتھ معاصر شعرا کے مجموعے اور کئی مجموعوں پر مشتمل ضخیم کلیات بھی شائع کیے؛ البتہ سنگ میل کی مطبوعات میں معاصر شاعری کی نسبت معاصر نثر مقدار و معیار میں زیادہ ہے۔ دیگر اشاعتی اداروں کی طرح شعری تراجم کی جانب سنگ میل کی بھی توجہ کم رہی۔ ایسے معاصر شعراء کی فہرست طویل ہے جن کی کوئی کتاب/ مجموعہ سنگ میل کی اشاعتی کارگزاری میں شامل نہیں۔

سفرنامہ اردو میں ایک قدیم صنف کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس صنف کے لیے ایک بڑے حلقۂ قرأت کی تخلیق سنگ میل کی اشاعتی کاوشوں سے ممکن ہوئی۔ سنگ میل کے متعدد سفرناموں نے قارئین کو ''افسانوی سفرنامے'' کا عادی بنا دیا ہے جس سے حقیقی اور کلاسیکی سفرنامے کو قرأت کے حوالے سے نقصان پہنچا ہے۔ سفرنامے کے تراجم کے حوالے سے سنگ میل کی اشاعتی کارکردگی محدود تر ہے۔ اردو کے کئی اہم سفرنامہ نگاروں کا کوئی سفرنامہ بھی سنگ میل سے شائع نہیں ہوا۔

دیگر نثری اصناف: آپ بیتی، سوانح، طنز و مزاح، مضامین، مکاتیب وغیرہ کا شعبہ بھی سنگ میل کی اشاعتی ترجیحات میں شامل رہا۔ ایک خودنوشت سوانح ''شہاب نامہ'' کی اشاعت سنگ میل کی طباعتی تاریخ اور اشاعتی کامیابی کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی سنگ میل نے آپ بیتیاں شائع کی ہیں لیکن اس شعبے میں مقدار و معیار کے حوالے سے دیگر اصناف کی نسبت تفریط کی کیفیت نظر آتی ہے۔ کئی اہم آپ بیتیاں اس عرصے میں اردو کے ادبی اُفق پر طلوع ہوئیں لیکن سنگ میل نے ان کے مصنفین سے طباعتی ربط، نہ اشاعت اول اور نہ ہی اشاعت ثانی کے لیے قائم کیا۔ اسی طرح سنگ میل سے طنز و مزاح اور مضامین وغیرہ کی مد میں بھی اہم کتب شائع ہوئیں اور اہم معاصرین نظرانداز ہوئے۔

علمی و ادبی حلقوں میں سنگ میل کے اشاعتی حسن و معیار پر خاصی حد تک آرا مشترک ہیں لیکن اہم معاصرین کو اشاعتی اہمیت نہ دینے اور کتابوں کی قیمتیں زیادہ ہونے پر سنگ میل کے خلاف ایک ردِعمل بھی موجود ہے اسی طرح ادیبوں کے ایک مخصوص حلقے کو وجود میں

لانے اورفوقیت وفروغ دینے کے حوالے سے بھی سنگ میل کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ سنگ میل کی طباعتی وتجارتی مصلحتیں، مجبوریاں، خدمات، رجحانات پیش نظر رکھیں تو کچھ اعتراضات غلط اور کچھ تحفظات درست قرار پاتے ہیں۔

سنگ میل نے ادب کے نقطہ نظر سے اہم اور تجارتی نقطہ نظر سے غیر منفعت بخش ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ نئے اور نوآموز ادیبوں، شاعروں کو عموماً طبع نہیں کیا۔ (سنگ میل نے نئے لیکن بعد میں اہم ہو جانے والے کسی ادیب وشاعر کی کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع نہیں کیا۔)

سنگ میل نے متنازع کتب شائع کرنے سے گریز کیا سوائے تین چار ادبی کتابوں کے چند حصوں کے سنگ میل کی کوئی کتاب نزاعی ثابت نہیں ہوئی۔

سنگ میل کے طباعتی کاروبار کی پہلی دو دہائیوں ۱۹۶۲ء۔۱۹۸۲ء میں کتابوں کا معیار عمدہ لیکن قیمتیں مناسب رہیں، لیکن باقی دو دہائیوں ۱۹۸۲ء۔۲۰۰۲ء میں کتابوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس کا پہلا سبب ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی ہے اور دوسری وجہ مطبوعاتِ سنگ میل کے معیار اور طلب میں اضافے کے باعث ادارے کی اپنے منافع میں اضافے کی حکمت عملی ہے۔

سنگ میل کے اپنے مصنفین (خصوصاً مستقل مصنفین) سے تعلقات مثالی رہے؛ کئی مصنفین نے اپنی تحریروں میں اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ نیاز احمد خلیق، مخلص اور کاروباری معاملات میں کھرے ہیں؛ حق تصنیف سے محروم نہیں رکھتے اور مصنفین کے مسائل حل کرنے میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ مصنفین کا یہ اظہار واعتراف پاکستان کے مخصوص اشاعتی پس منظر میں ایک اہم واقعہ اور خوشگوار اور لائق تقلید مثال ہے۔

دیگر ناشران وتاجران کتب نے بھی عمومی طور پر سنگ میل کے کاروباری اسلوب کو سراہا ہے۔ سنگ میل تجارتی تنازعات سے بھی عموماً دور رہا ہے۔

سنگ میل کی سیکڑوں مطبوعات اپنے موضوع، مزاج اور اندراجات کے حوالے سے اہم اور خارجی رنگ وروپ کے لحاظ سے دل پذیر ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں اردو مطبوعات کی افراط اور اشاعتی وطباعتی استحکام کے حوالے سے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کو مطبع منشی نول کشور کے بعد سب سے اہم اور قابل ذکر ادارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

معاصر اردو ادب اور سنگ میل پبلی کیشنز ایک دوسرے کا اہم حوالہ ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بھی ہیں۔

کتابیات

۱۔ ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، ہمارے عہد کا ادب اور ادیب، قمر کتاب گھر، کراچی، ۱۹۷۱ء

۲۔ احسان دانش، جہان دانش، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۰ء

۳۔ احسن فاروقی، محمد، ڈاکٹر، اردو ناول کی تاریخ، اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۴۔ احسن فاروقی، محمد، ڈاکٹر، اردو میں تنقید، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۶۷ء

۵۔ اسدا ریب، ڈاکٹر، بچوں کا ادب، تاریخ و تنقید، کاروان ادب، ملتان، بار اول، ۱۹۸۲ء

۶۔ اشرف کمال، محمد، انجمن ترقی اردو کراچی کی مطبوعات، توضیحی کتابیات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۲۰۰۶ء

۷۔ امیر حسن نورانی، سید، سوانح منشی نول کشور، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

۸۔ انتظار حسین، ملاقاتیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، بار دوم، ۱۹۹۱ء

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلشرز، لاہور، بار اول، ۱۹۹۶ء

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، سن ندارد

۱۲۔ جاوید اختر، سید، ڈاکٹر، اردو کی خواتین ناول نگار (ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۴۔ حامد بیگ مرزا، ڈاکٹر، اردو ادب کی شناخت، اورینٹ پبلشرز، لاہور، بار اول، ۲۰۰۷ء

۱۵۔ حامد بیگ مرزا، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت (۱۸۰۳ء۔۱۹۹۰ء)، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

۱۶۔ حسن عسکری، محمد، عسکری نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۱۷۔ حسین محمد جعفری، سید، ڈاکٹر/ احمد سلیم، پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، کراچی، بار اول، ۱۹۸۷ء

۱۸۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، تہذیب و تخلیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، بار اول، ۱۹۸۷ء

۱۹۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، اردو ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۶ء

۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۹۷۸ء، بار ششم، ۱۹۸۱ء، اضافہ شدہ ستائیسویں اشاعت، ۲۰۰۵ء

۲۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو ادب، سال بہ سال (سالانہ ادبی جائزے ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقید اور تاریخ، جامع فہرست مطبوعات پاکستان، نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، کراچی، لاہور، ۱۹۷۳ء

۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ (خودنوشت سوانح)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۲۴۔ سلیم ملک، محمد، ڈاکٹر، سید امتیاز علی تاج، زندگی اور فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۵۔ صلاح الدین احمد، مولانا، (مرتب) مغربی پاکستان میں خواتین کیا پڑھتی ہیں؟ (مترجم: شاہد احمد دہلوی)، قومی کتاب مرکز، پاکستان، کراچی، بار اول، ۱۹۶۴ء

۲۶۔ صلاح الدین احمد، مولانا، (مرتب) مغربی پاکستان میں مرد کیا پڑھتے ہیں؟ (مترجم: انعام عزیز)، قومی کتاب مرکز، پاکستان، کراچی، بار اول، ۱۹۶۴ء

۲۷۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، اردو دنیا، کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۹۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ادب وفن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، بار اول، ۱۹۸۷ء

۳۰۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

۳۱۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ۔ روایت و مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار اول، ۱۹۸۶ء

۳۲۔ گوپی چند نارنگ/مظفر حنفی، وضاحتی کتابیات، ۱۹۷۶ء، جلد اول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

۳۳۔ گوپی چند نارنگ/مظفر حنفی، وضاحتی کتابیات، ۱۹۷۷ء۔۱۹۷۸ء، جلد دوم، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء

۳۴۔ مختار صدیقی، مقالات مختار صدیقی، (تحقیق و تدوین: شیما مجید)، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، بار اول، ۱۹۹۷ء

۳۵۔ مقبول احمد، ملک (مولف و مرتب)، پذیرائی، مقبول اکیڈمی، لاہور، بار اول، ۲۰۰۸ء

۳۶۔ مقبول احمد، ملک، سفر جاری ہے (ایک ناشر کی خودنوشت سوانح)، مقبول اکیڈمی، لاہور، بار اول، ۲۰۰۷ء

۳۷۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک پورٹ، کراچی، بار اول، ۱۹۹۳ء

۳۸۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری، لاہور، بار اول، ۱۹۶۴ء

۳۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، جدید ناشرین، لاہور، بار دوم، ۱۹۶۶ء

۴۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ، لاہور، بار نہم، ۱۹۹۳ء

۴۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر، اردو سائنس بورڈ، لاہور، بار اول، ۲۰۰۷ء

۴۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دستک اس دروازے پر، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء

۴۳۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۸ء

۴۴۔ یونس جاوید، ڈاکٹر، حلقہ ارباب ذوق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء

رسائل، روزنامے، ہفت روزے

۱۔ اخبار جہاں، کراچی، ہفت روزہ، ۲۶ جون تا ۲ جولائی ۲۰۰۶ء، ۳ تا ۹ جولائی، ۲۰۰۶ء

۲۔ ادراک، گوجرانوالہ، سہ ماہی، جون تا اگست ۲۰۰۵ء

۳۔ دی پاکستان پوسٹ، لندن، ہفت روزہ، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء

۴۔ دی نیشن، لاہور، روزنامہ، ۸ جون ۱۹۹۴ء

۵۔ کتاب، لاہور، ماہ نامہ، ستمبر ۱۹۶۶ء، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء، نومبر ۱۹۶۷ء، دسمبر ۱۹۶۷ء، جون ۱۹۷۲ء، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۲ء (تعلیمی پالیسی نمبر)، جولائی اگست ۱۹۷۳ء، اکتوبر ۱۹۷۳ء، نومبر ۱۹۷۳ء، فروری ۱۹۷۴ء، مارچ ۱۹۷۴ء، مارچ ۱۹۷۹ء، جولائی ۱۹۷۹ء، اگست ۱۹۷۹ء، دسمبر ۱۹۸۱ء، فروری ۱۹۸۵ء، اگست ۱۹۸۵ء، ستمبر ۱۹۸۵ء، دسمبر ۱۹۸۵ء، ستمبر ۱۹۸۸ء، اکتوبر ۱۹۸۸ء، جولائی اگست ۱۹۸۹ء

۶۔ مشرق، لاہور، روزنامہ، ۲۶ جون ۱۹۸۷ء

استفسارات راقم الحروف از

نیاز احمد (بانی سنگ میل)، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۸ جولائی ۲۰۰۷ء

نیاز احمد (بانی سنگ میل)، بمقام ماڈل ٹاؤن، لاہور، مورخہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء

راقم الحروف کے مرتب کردہ سوالنامے کے تحریری جواب:

۱۔ آغا امیر حسین، (بانی کلاسیک لاہور)، محررہ: ۵۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۲۔ شاہد حسن رضوی، ڈاکٹر، (مدیر الزبیر بہاولپور)، محررہ: ۲۱۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۳۔ شاہد شیدائی، (معروف شاعر و بانی اشاعتی ادارہ، کاغذی پیرہن، لاہور) محررہ: ۱۸۔ ستمبر ۲۰۰۷ء

۴۔ عرفان احمد خان، (ناول نگار و ناشر)، محررہ: ۲۱۔ ستمبر ۲۰۰۷ء

اشاریہ

(مصنفین و مرتبین و مترجمین کا اشاریہ

توضیحی کتابیات میں شامل سنگ میل پبلی کیشنز کی مطبوعات کے حوالے سے)

م

ن

و

ہ

ی

۵۔ عمران اختر، پروفیسر، (محقق)، محررہ: ۴۔اکتوبر ۲۰۰۷ء

۶۔ عمران اللہ، پروفیسر، (اعزازی مہتمم التحریر لاہور)، محررہ: ۲۔اکتوبر ۲۰۰۷ء

۷۔ غلام حسین ساجد، پروفیسر (معروف شاعر وادیب)، محررہ: یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء

۸۔ محمد خالد، پروفیسر، (معروف شاعر وادیب)، محررہ: ۳۔اکتوبر ۲۰۰۷ء

۹۔ مقبول احمد، ملک، (بانی مقبول اکیڈمی، لاہور)، محررہ: ۱۵۔نومبر ۲۰۰۷ء

مقالات (غیر مطبوعہ)

۱۔ غزالہ شاہین، بانو قدسیہ بحیثیت ناول نگار، (مقالہ برائے ایم اے اردو)، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۶ء

۲۔ منور مقبول عثمانی، اشفاق احمد، فن و شخصیت، (مقالہ برائے ایم اے اردو)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، ۱۹۸۹ء